

تفہیم القرآن

مجمعہ کی کوثر

عبدالقدوس رومی

بہارِ عالم غریبی میاں لوی حاقہ عبد القدوس حبیبی کی لکھی ہوئی دعا  
عبد القدوس

۱۶

علامہ ابوالاعلیٰ مودودی کی تفسیر پر مبسوط و مفصل تبصرہ

# ”تَفْہِیْمُ الْقُرْآنِ“ سمجھنے کی کوشش

(جلد اول)

(تفہیم القرآن کے دیباچہ و مقدمہ سے متعلق)

عبد القدوس رومی مفتی شہرگڑھ

ناشر

صہیب برادر س، صابن کٹرہ، آگرہ ۲

## ضروری تفصیلات

<p>کتاب کا نام مصنف ناظم اشاعت طابع ناشر سال اشاعت تعداد اشاعت</p>	<p>”تفہیم القرآن“ سمجھنے کی کوشش عبد القدوس رومی مفتی شہر آگرہ شعبہ تصنیف و تالیف جامعہ ہدایت جے پور نیشنل آرٹ پرنٹرس - الہ آباد صہیب برادرس <math>\frac{11}{98}</math> صابن کٹرہ - آگرہ رمضان ۱۴۲۷ھ اگست ۱۹۸۰ء ایک ہزار</p>
<p>قیمت اٹھارہ روپے</p>	<p>ملنے کے لئے قیمت Rs 18 =</p>
<p>دہلی میں دیوبند میں سہارن پور میں مکھنوی میں آگرہ میں</p>	<p>ہندوستانی کتب خانہ حضرت نظام الدین - دہلی مکتبہ نعمانیہ دیوبند کتب خانہ اشاعت العلوم محلہ مفتی بہارن پور کتب خانہ الفرقان نیا گاؤں مغربی مکھنوی صہیب برادرس <math>\frac{11}{98}</math> صابن کٹرہ - آگرہ ۳</p>



# کہاں کیا پڑھیں؟

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۵۱	لائق توجہ مزید انکشاف	۵	انتساب
۵۸	یہ کہاں کا انصاف ہے	۶	تشکرات
۶۰	فتنہ کی نشاندہی	۷	عرض مدعا سے پہلے
۶۱	قرآن فہمی کے دو معیار کیسے؟	۹	تفہیم القرآن کیوں
۶۲	مفسر ہونے کیلئے کیا باتیں ضروری ہیں	۱۱	ایک انکشاف
۶۵	شاید آپ کو یہ بات مشکل نظر آئے	۱۲	نقشہ تراجم مشہورہ
۶۸	آداب مفسر پر گفتگو	۱۴	سب سے پہلے بسم اللہ ہی غلط
۷۰	تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی ہے	۱۸	کلام الہی میں اصلاح کا شوق
۷۲	تفہیم القرآن کیسے وجود میں آئی	۲۸	علامہ کی آزاد ترجمانی خود انہیں کی زبانی
۷۶	ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی	۳۱	علامہ کی ہمت قابلِ داد ہے
۸۰	رجوع الی المقصد	۳۴	تحت الشعور جذبہ کی کار فرمائی
۸۲	ہم دور کیلے جا رہے ہیں	۳۹	قرآن مجید و دیگر کتب کا تقابلی نقشہ
۸۸	گل دیگر شگفت	۴۱	تفہیم القرآن فروغِ مودودیت کیلئے کامیاب حربہ
۹۰	بنیادی غلطی کا سراغ مل ہی گیا	۴۵	علامہ کی ہمہ دانی خود انہی کی زبانی
۹۹	استاد حسن اسماعیل مولانا ندوی کے ہموا	۴۷	علامہ کی ہمہ دانی دوسروں کی زبانی
۱۰۳	علامہ کی تجدید پسندی	۵۰	مودودی جنتا کی شخصیت ابھرنے کا اصل راز



صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۲۰۰	اقتباس اول	۱۰۶	خطہ کی گھنٹی
۲۰۲	لیجے مثال بھی حاضر ہے	۱۰۹	راز سے پردہ اٹھتا ہے
۲۲۷	اقتباس دوم	۱۲۰	آغاز نبوت میں ابتدائی آیات
۲۲۹	شان نزول سے متعلق	۱۲۳	آخر ایسا کیوں ہے
۲۳۱	نقل کے بعد عقل	۱۲۵	علامہ کے دین پر بھی ایک نظر
۲۴۰	عقل کی لنگر ہی دلیل	۱۳۶	یہ زورِ قلم ہے یا قلمِ زور
۲۴۲	معجزات و خوارق سے چشم پوشی	۱۴۰	مقطع میں آپڑی ہے سخن گسترانہ بات
۲۴۵	معتقدین علامہ کی خدمت میں	۱۴۴	قرآنی اسلوب
۲۵۳	ٹپکے گا وہی طرف سے جو طرف میں ہوگا	۱۴۹	صرف دعویٰ ہی دعویٰ
۲۵۴	تقابلی مطالعہ	۱۵۸	بہیں تباہیت رہ
۲۶۸	نزالہ طراز استدلال	۱۶۰	تدبر قرآن کا نقطہ آغاز
۲۷۱	روایت ابن جریر طبری	۱۷۶	مقدمہ کا خاتمہ
۲۷۶	یہ تبصرہ آخری منزلوں میں	۱۷۸	ایک علامہ دوسرے علامہ کے نقش قدم پر
۲۷۶	کھلوانے دیکھے بہلایا گیا ہوں	۱۸۴	حوالہ غلط نکل گیا
۲۸۰	مقطعات قرآنی کی حکمتیں	۱۹۹	لوٹ پیچھے کوڑا رابلن ایام ابھی

# انتساب

اپنے والد محترم حضرت مولانا محمد سراج الحق صلی اللہ علیہ وسلم کے نام

جنہوں نے تفسیر قرآن مجید سے اپنی خصوصی دلچسپی و شغف کے باعث علامہ مودودی سے کسی وقت بوقت ملاقات یہ فرمائش بھی کر دی تھی کہ — ”اچھا ہوتا اگر آپ کے قلم سے ایک تفسیر اردو میں آجاتی“ — (مولانا دنیابادی نے بھی اپنی آخری کتاب ”معاصرین“ میں والد محترم کے تذکرہ میں یہ اقرار و انکشاف فرمایا ہے کہ موصوف کی انگریزی تفسیر کے محرک اول بھی حضرت والد صاحب مرحوم ہی تھے)۔

کیا عجب کہ والد صاحب مرحوم ہی کی فرمائش نے علامہ مودودی کو بھی تفسیر نگاری پر آمادہ کر دیا ہو اللہ تعالیٰ والد مرحوم کی اس لغزش تحریر کو معاف فرمائے جو وہ علامہ سے اپنی بیجا عقیدت مندی کے دوسرے گزیرے جسکے نتیجہ میں موصوف کی تفسیر تفہیم القرآن وجود میں آگئی جو تحریک کو پروان چڑھانے میں موثر و کارگر ثابت ہوئی۔

حضرت والد مرحوم نے ”خلافت و لوکیت“ سامنے آنے پر اس فتنہ کی خطرناکی کا احساس فرمایا تھا چنانچہ اسکی تردید میں ”خلافت و لوکیت کی حقیقت“ نامی ایک کتابچہ اور مولانا مودودی و سیدنا عثمان غنیؓ نام ایک سالہ تصنیف فرما کر بڑی حد تک اپنی بیجا عقیدت مندی کا کفارہ بھی ادا فرمایا تھا لیکن علامہ کی اس خطرناک تفسیر اور تحریک کے بنیادی شاہکار تفہیم القرآن پر کام کر نیکا انھیں موقع نہ مل سکا لہذا ہر آنچہ پڑتواں کو دیکر کمزور کے مصداق علامہ کی تفسیر سے پیدا ہونے والی خطرات کیوں اور نہ نالکیوں کے زور و استراک کیلئے یہ تبصرہ لکھا گیا ہے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل خاص سے اسے قبول فرما کر اتمام السطور کیلئے عفو میاست اور حضرت والد مرحوم کیلئے رفع درجات کا ذریعہ بنائے۔ آمین بجا دلہی الامین

احقر رومی غفرلہ

# تشکر

الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي هَدَانَا لِهٰذَا وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَا اَنْ هَدَانَا اللّٰهُ لَقَدْ جَاءَتْ رُسُلًا مِنَّا بِالْحَقِّ سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُونَ وَسَلَامٌ عَلَى الْمُرْسَلِينَ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ (۱)

اگر رب العزت کی حمد و ستائش کا فریقہ ہی وہ وظیفہ حیات ہی جس سے عہدہ برآمدگی صورت شاید ہی ہوتی ہو کہ اسکی ادائیگی سے اپنے عجز و قصور کا بند گانہ اعتراف کر لیا جائے۔ آخر تو خود حضرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم بھی لاکھوں ثناء علیک فرما کر ہی اپنی حمد و ستائش کو کمال انتہا تک پہنچا یا ہے۔

(۲) حضور سرور کائنات فخر موجودات سیدنا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی پر بھی ہزار ہزار اور لاکھ لاکھ درود و سلام بھیجے، مگر یہ سمجھتے ہوئے کہ اس کے باوجود آپ کی ممنونیت احسانمندی اور آپ کی غلامی کا حق ادا نہ ہو سکے گا۔ یہ

لَا يُمْكِنُ الشُّعْرُ كَمَا كَانَ حَقٌّ  
بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

(۳) حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل میں درود و سلام ہو حضرت صحابہ کرام اور آپ کی ازواج مطہرات و ذریعہ طیبہ پر کہ یہی حضرات وسیلہ اور واسطہ ہیں جنکے ذریعہ دین برحق کی تعلیمات ہم تک پہنچ سکیں۔

(۴) دین برحق کے ائمہ کرام حضرات مجتہدین و محدثین، ائمہ کلام و عقائد، شائخ تصوف و سلوک، سادات سلاسل، حضرات مجددین و مصلحین سب ہی کی دینی و ملی خدا لائق اظہار تشکر ہیں اللہ تعالیٰ ان سب رحمت و رضوان کا معاملہ فرمائے۔

(۵) راقم السطور کے جملہ ساتذہ اور مشائخ و اکابر جو حیات ہیں یا رحلت فرما چکے ہیں ان سب کا احسان حق کی اس ناپزیر کوشش میں شامل حال رہا ہے، فجر اہم عنی وعن سائر المسلمین۔

(۶) ایک اہم اور خصوصی شخصیت حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب دامت برکاتہم بانی جامعہ ہدایت جے پور بھی خصوصیت کیساتھ مستحق تشکر ہے موصوف نے جامعہ کے شعبہ تصنیف و تالیف کی جانب سے اسکی اشاعت منظور فرما کر حق کو مزید ممنون فرمایا۔

رومی غفرلہ



# عرض مدعا سے پہلے

ایک مدت سے یہ ضرورت محسوس کی جا رہی تھی کہ علامہ ابوالاعلیٰ مودودی کی تفسیر تفہیم القرآن کا صحیح طور پر جائزہ لیا جائے اور پوری دیانت کے ساتھ دیکھا جائے کہ علامہ کے وہ افکار و نظریات جو علماء حق کے نزدیک قابل اعتراض اور لائق تردید ہیں موصوف کی اس تفسیر میں تو نہیں سمجھ دیئے گئے ہیں، لیکن اسی کے ساتھ ہی ساتھ پوری دیانت کے ساتھ بغیر کسی تواضع و انکسار اپنا احساس یہ بھی تھا کہ علامہ جیسی بلند قامت اور شہرہ آفاق شخصیت کی تفسیر کا صحیح طور پر جائزہ لینا یا تبصرہ کرنا اپنے بس کی بات ہرگز نہیں ہے۔

اسی وجہ سے ایک مدت تک ضرورت کا یہ احساس دل میں کروٹیں ہی لیتا رہا اور بات آزد و تناسے آگے نہ بڑھ سکی۔ یہاں تک کہ ایک روز اسی احساس نے شدت اختیار کی اور دل میں یہ خیال قائم ہو گیا کہ تو اگر علامہ کی تفسیر پر تبصرہ کا اہل نہیں ہے نہ سہی آخر اس میں کیا مضائقہ ہے کہ کم از کم اسکا مطالعہ تو کر لیا جائے شاید مطالعہ سے یہ بات تو صاف ہو جائے کہ علامہ کی تفسیر بالکل بے غبار اور بے ضرر ہے جسکے مطالعہ کا مشورہ دوسروں کو بھی دیا جاسکتا ہے، یا ایسی نہیں ہے اور عام مسلمانوں کو اسکا مطالعہ سے باز رکھنا ضروری ہے۔ اس خیال کی معقولیت کے سامنے اپنی عاجزی و بے مائیگی نے بھی اختیار ڈال دیئے۔ نتیجہ میں دوسرے روز اپنے ایک کرم فرمائے ”تفہیم القرآن“ کی پہلی جلد مستعار لی اور مطالعہ شروع کر دیا۔ قدرت کو شاید کسی نہ کسی درجہ میں اعتراف سے کبھی یہ کام نینا منظور ہوگا کہ تفسیر کا دیباچہ و مقدمہ ہی پوری طرح نقد و تبصرہ کا مستحق نظر آنے لگا۔ ہمت پیدا ہو گئی اور اللہ کا نام لیکر تفسیری دیباچہ پر مختصر سا تبصرہ لکھ ڈالا۔

صحیح تاریخ و ماہ تو محفوظ نہیں مگر اندازہ یہ ہے کہ دیباچہ کا یہ تبصرہ ستمبر کے اواخر سے پہلے ہی لکھا جا چکا تھا۔ شاید نومبر ستمبر میں نظام جدید کا پور کا پہلا شمارہ سامنے آیا اور

اسکے ساتھ ہی مدیر صاحب کی طرف سے رسالہ کیلئے مضمون کی فرمائش کا خط موصول ہوا۔ جواب میں مضمون کا وہی ابتدائی حصہ انھیں روانہ کر دیا گیا مگر مدیر موصوف اسے اس وقت شائع نہ فرما سکے۔ پھر مئی ۱۹۷۷ء میں نظام جدید کانپور میں اس مضمون کی پہلی قسط شائع ہو گئی اور مدیر صاحب نے اطلاع دی کہ سلسلہ مضمون جاری رکھا جائے۔ اس اطلاع کے بعد یہ سلسلہ دوبارہ شروع ہوا۔ اب تفسیری دیباچہ کے بجائے علامہ کا مقدمہ زیر تبصرہ تھا۔ جسکے مطالعہ سے علامہ کی خاص تحریری تکنیک کی حقیقت اچھی طرح سمجھ میں آگئی کہ موصوف نے دیباچہ و مقدمہ سمیت پوری تفسیر میں اپنے ناظرین کی کس طرح ذہن سازی فرمائی ہے۔ اسلئے مجبوراً احقر کو بھی اپنے اس تبصرہ میں موصوف کی اس "تکنیک" اور ان کے بین السطور میں مضمرات کو دا شگاف اور واضح کرنے کیلئے کسی قدر تطویل سے کام لینا پڑ گیا کہ موصوف کی "صحافتی چابکدستی" اور ان کے بین السطور میں مضمرات کی صحیح نقاب کشائی احقر جیسے غیر نشی کیلئے ممکن نہ تھی۔

تطویل کا ایک دوسرا سبب یہ بھی ہوا کہ مضمون قسط وار شائع ہو رہا تھا بعض مقامات پر گذشتہ مضمون کا حوالہ دینے اور ربط قائم رکھنے کیلئے بھی تطویل ناگزیر تھی۔

زیر نظر کتاب کی ابتدائی چند قسطیں "الجمعية" سنڈے ایڈیشن میں بھی شائع ہو گئیں جس کے باعث مضمون پڑھنے والوں کا حلقہ کافی بڑھ گیا اور کتابی شکل میں اشاعت کیلئے بہیم اصرار و تقاضے ہونے شروع ہو گئے جسکی وجہ سے سرمدت یہ مضمون جوں کا توں کسی نظر ثانی کے بغیر کتابی شکل میں شائع کیا جا رہا ہے۔ "اصل تفسیر" کے لئے موجب اصلاح اور احقر کیلئے ذخیرہ آخرت ثابت ہو۔ آمین اپنے انسان (خطا و نسیان سے مرکب) ہونیکا بھی اقرار ہے اور تمی مایہ اور بے علم ہونے کا بھی اعتراف ہے جو حضرات اہل علم آئیں کوئی فروگزاشت نہ ہو خطا ملاحظہ فرمائیں متنبہ فرما کر جزائے خیر کے مستحق ہوں۔

عبد القدوس رومی۔، مریج الاول ۲۶ جنوری ۱۴۰۰ھ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

## کچھ دیباچہ سے متعلق

### تفہیم القرآن کیوں؟

اردو زبان میں متعدد مشہور و معروف اور مقبول و عام پسند تراجم و تفاسیر کے ہوتے ہوئے کسی نئے ترجمہ و تفسیر کی ضرورت بظاہر سمجھ میں نہیں آ سکتی تھی چنانچہ خود مودودی صاحب جیسے معقولیت پسند بزرگ بھی اس سوال کی اہمیت کو نظر انداز نہ فرما سکے اور تفہیم القرآن کے دیباچہ میں اس سوال کا جواب دینا ضروری سمجھا۔ زیر نظر حصہ مضمون میں موصوف کے اسی جواب کا تجزیہ و تبصرہ مد نظر ہے۔ موصوف فرماتے ہیں

"میں ایک مدت سے محسوس کر رہا تھا کہ ہمارے عام تعلیم یافتہ

لوگوں میں روح قرآن تک پہنچنے اور اس کتاب پاک کے حقیقی مدعا

سے روشناس ہونے کی جو طلب پیدا ہو گئی ہے اور روز بروز بڑھتی

جا رہی ہے وہ دوسرے مترجمین و مفسرین کی قابل قدر مساعی کے

باوجود منور شدہ ہے۔ اسکے ساتھ یہ احساس بھی اپنے اندر پارہا تھا

کہ اس تشنگی کو بجھانے کیلئے کچھ خدمت میں بھی کر سکتا ہوں (دیباچہ تفہیم)



## ایک تیر سے دو شکلا اور بیک کر شتمہ دو کار

علامہ مودودی کی مندرجہ بالا عبارت پوری صراحت و وضاحت کے ساتھ  
 "ایک تیر سے دو شکلا اور بیک کر شتمہ دو کار" کا بہترین نمونہ ہے اور کسی مزید تبصرہ کی محتاج  
 نہیں ہے۔ عبارت بالا کے آخری خط کشیدہ فقرہ پر اگر ذرا بھی غور فرمایا جائے تو  
 ان کے بین السطور موصوف کی "تحت الشعور تغلی" آسانی سے پڑھی جاسکتی ہے  
 کہ موصوف نے کیسے معصوم انداز میں دوسرے مترجمین و مفسرین کی "قابل قدر مساعی"  
 کی بظاہر قدر افزائی فرماتے ہوئے سب کو تشنہ اور ناقابل تشفی قرار دیکر انکی ناقدری  
 بھی فرمادی ہے اور اپنی تعریف و تحمیل کے اس "غازہ" پر طنز و تعریض کا پانی بھی  
 کس صفائی سے پھیر دیا ہے اور کس فراخ حوصلگی و بلند ہمتی سے کام لیتے ہوئے "مجددانی"  
 کا ادائی سا اشارہ کئے بغیر "بقلم خود" اپنی اہلیت و صلاحیت کا دعویٰ بھی سپرد قلم  
 فرما دیا ہے۔

اس انداز تحریر پر ہمیں کوئی اعتراض نہ ہوتا ہم اپنے دل کو سمجھا لیتے کہ  
 یہ "ادعائے اہلیت" نہیں ہے صرف "تجدید بالنعمة" ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جب  
 آں موصوف کو صحافت کی ایسی گوناگوں صلاحیتیں بخشی ہیں تو انھیں خدا تعالیٰ کے  
 اس نعمت کے اظہار سے روکنے والے ہم کون ہوتے ہیں، لیکن ہم کیا کریں ہماری  
 سب سے بڑی دشواری یہ تھی کہ اس تفسیری و بیابچہ کا بیاق کلام اور سلسلہ عبارت  
 ہمیں اس "حسن ظن" اور خوش فہمی کی مطلق اجازت نہیں دیتا جیسا کہ آئندہ سطور میں  
 تفصیل سے عرض کیا جا رہا ہے۔

## ایک انکشاف

علامہ کے اس دیباچہ تفہیم سے یہ ایک نیا انکشاف سامنے آتا ہے کہ موصوف کی تفسیر "تفہیم القرآن" کے علاوہ سارے ہی تراجم لفظی ہیں "چنانچہ علامہ نے اسی سلسلہ میں اگلے ہی صفحہ پر ایک ذیلی اور بغلی سرخی یوں قائم فرمائی ہے :-

"چند الفاظ ترجمانی و تفہیم کے متعلق" — اس سرخی

کے تحت ارشاد فرماتے ہیں — "میں نے اس کتاب (تفہیم القرآن)

میں ترجمہ کا طریقہ چھوڑ کر آزاد ترجمانی کا طریقہ اختیار کیا ہے اسکی اصل

وجہ یہ ہے کہ جہاں تک "ترجمہ قرآن" کا تعلق ہے یہ خدمت اس سے

پہلے متعدد بزرگ بہترین طریقے پر انجام دے چکے ہیں اور اس راہ میں

اب مزید کوشش کی ضرورت باقی نہیں رہی ہے فارسی میں شاہ

ولی اللہ صاحب کا ترجمہ اور اردو میں شاہ عبدالنقاد صاحب شاہ

رفیع الدین صاحب - مولانا محمود الحسن صاحب - مولانا اشرف علی صاحب

اور فتح محمد صاحب کے تراجم ان اغراض کو بخوبی پورا کرتے ہیں جن کے

لئے ایک "لفظی ترجمہ" درکار ہوتا ہے۔ لیکن کچھ ضرورتیں ایسی ہوتی ہیں

جو "لفظی ترجمہ" سے پوری نہیں ہوتیں اور نہیں ہو سکتیں، انہیں کو

میں نے ترجمانی کے ذریعہ پورا کرنے کی کوشش کی ہے دیباچہ و

جملہ تراجم و تفاسیر پر خط نسخ و بطلان کیوں؟

حقیقت یہ ہے کہ علامہ نو دوی جو تمام "امت مسلمہ" کے اسلام کو

نظر انداز فرما کر صرف اپنی امت کو "جماعت اسلامی" کا لقب مرحمت فرما رہے ہیں وہ اس حقیقت سے بھی اچھی طرح باخبر تھے اور ہیں کہ جب تک جملہ قدیم تراجم و تفاسیر پر خط نسخ و بطلان نہ کھینچ دیا جائے گا خود ان موصوف کا شمول زمرہ مفسرین میں اور انکی تفہیم کا شمار اردو تفسیروں میں معرض اعتراض اور مورد ایراد ہی رہے گا اسلئے انھوں نے اپنی مفسرانہ صلاحیتوں کو بروئے کار لانے سے پہلے ہی یہ ضروری سمجھا کہ وہ اپنے تفسیری دیباچہ میں جملہ قدیم تراجم و تفاسیر کو مختلف تنقیدی پہلوؤں سے مجروح کرنے کا فریضہ بھی خود ہی انجام دے لیں کہ عام لوگوں کے نزدیک وہ تراجم قابل اعتبار اور لائق استفادہ ہی نہ رہ جائیں۔ اسی عظیم مقصد کے لئے موصوف نے تقریباً سارے ہی تراجم و تفاسیر کو اپنی جرح و تنقید کا نشانہ بنا ڈالا بلکہ بعض حضرات مفسرین و مترجمین پر تو یہ ظلم بھی روا رکھا کہ اپنی تحریر کردہ مذکورہ بالا فہرست میں نہ تو ان مترجمین ہی کا ذکر فرمایا نہ انکی خدمت ترجمہ و تفسیر کا تذکرہ ہی ضروری سمجھا مثلاً مولانا عبدالحق حقانی کی تفسیر و ترجمہ کو یکسر نظر انداز فرما گئے اسی طرح مولانا عاشق الہی صاحب میرٹھی کے ترجمہ قرآن کو بھی لائق ذکر نہ سمجھا پھر جن تراجم کا ذکر بھی کیا تو اس پر حکمت اور فکارانہ انداز سے کہ ان سب کو لفظی ترجمہ "کا مصداق قرار دیکر بالکل ہی غیر مفید اور ناقابل توجہ ٹھہرا دیا حالانکہ ہر وہ مسلمان جو قرآن پاک کے تراجم سے دلچسپی اور دینی مطالعہ کی بدولت ان سے کچھ بھی واقفیت رکھتا ہے وہ اس حقیقت سے بھی ضرور واقف ہوگا کہ موصوف کی دی ہوئی فہرست تراجم میں صرف حضرت شاہ رفیع الدین صاحب کا ترجمہ تو ایسا ضرور ہے کہ جس پر لفظی ترجمہ "کی پھبتی" اور "دیارک" کو بر محل کہا جاسکتا ہے ورنہ موصوف کے ذکر فرمائے ہوئے بقیہ دوسرے تراجم ہرگز ہرگز ایسے نہیں ہیں جنہیں "لفظی ترجمہ" کا



مصدق قرار دیجہ غیر مفید ٹھہرا دیا جائے اور دہی کی ٹوکری میں ڈال دیا جائے۔ لیکن علامہ ماں نہا مہراں جناب مودودی صاحب کا دعویٰ یہی ہے کہ ان کی تفہیم کے سوا جتنے بھی تراجم ہیں وہ صرف لفظی ہیں اور گونا گوں خرابیوں پر مشتمل ہیں جنکی تفصیل علامہ نے اپنے اسی دیباچہ تفہیم میں پیش کی ہے اور ہم بھی زیر نظر تبصرہ میں اسکا مکمل جائزہ اور تجزیہ پیش کرنے جارہے ہیں جس سے ناظرین کو اچھی طرح اندازہ ہو جائے گا کہ علامہ کا یہ دیباچہ صحیح معنوں میں "ایک تیرے دوست کا ر" کا مصداق ہے۔

دیباچہ تفہیم کے مندرجہ بالا اقتباس میں علامہ مودودی نے دوسرے حضرات مترجمین و مفسرین کے تراجم کے مقابلہ میں اپنی نام نہاد تفہیم قرآنی کو "ترجمانی" یا آزاد ترجمانی کا نام دیا ہے اور اسکی فوقیت و برتری میں خوب خوب رطب اللساں ہوئے ہیں۔ ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ علامہ کی اس ترجمانی کی چھپی ہوئی خوبیوں کا صحیح جائزہ لینے کے لئے اردو کے چند دوسرے تراجم کے ساتھ ساتھ موصوف کی ترجمانی کو بھی باہمی موازنہ اور تقابلی مطالعہ کے لئے بطور نمونہ پہلو بہ پہلو پیش کر کے دیکھیں تو سہی کہ علامہ موصوف کا یہ ادعائے کمال و برتری کہاں تک حقیقت سے بھی ہمکنار ہوتا ہے۔ اسی غرض کے تحت آئندہ سطور میں ایک نقشہ تراجم پیش کیا جا رہا ہے۔ ناظرین کو اہم بغور ملاحظہ فرما کر خود ہی فیصلہ فرمائیں گے کہ آخر علامہ کی ترجمانی سے پہلے کے دوسرے قدیم تراجم کس لحاظ سے تشنہ و ناقص تھے اور کس راہ سے قرآن فہمی میں حائل تھے کہ علامہ نے ان تراجم کو اپنی جراحت غیر تنقید و تنقیص کا نشانہ بنایا ہے اور اکابر علماء کے ان مستند و معتبر تراجم کا وزن کیسے پرفن انداز میں کم کرنے کی کوشش کی ہے؟

(نقشہ تراجم اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

نقشہ تراجم مشہورہ برائے تقابلی مطالعہ

## متن قرآن مجید :-

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ ۝ اَلَمْ يَكُنْ  
اَلْكِتَابُ لَارْتِيبٍ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝ اَلَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ  
بِالْغَيْبِ وَيُقِيمُوْنَ الصَّلَاةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝  
وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَا اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَ مَا اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ  
وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُوْنَ ۝ اُولَٰئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ  
وَاُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝

## ترجمہ حقانی :-

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔  
الم : یہ کتاب ہے اس میں کوئی شک نہیں۔ پرہیزگاروں کے لئے ہدایت  
ہے۔ متقی وہ ہیں جو ایمان لاتے ہیں غیب پر اور قائم کرتے ہیں نماز اور  
کچھ ہمارے دیئے میں سے خرچ کرتے ہیں۔ اور متقی وہ ہیں جو تجھ (اسے محمد)  
نازل ہوا اور جو کچھ تجھ سے پہلے نازل کیا گیا اس پر ایمان لاتے ہیں اور  
قیامت کا یقین کرتے ہیں۔ وہی متقی لوگ اپنے خدا کی طرف سے بڑی ہدایت  
پر ہیں اور وہی فلاح پانے والے ہیں۔

## ترجمہ شیخ الہند :-

شروع اللہ کے نام سے جو بڑے مہربان نہایت رحم والا ہے  
 الم ہ اس کتاب میں کوئی شک نہیں۔ راہ بتلاتی ہے ڈرنے والوں کو،  
 جو کہ یقین کرتے ہیں بے دیکھی چیزوں کا اور قائم رکھتے ہیں نماز کو اور جو ہم نے  
 روزی دی ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ اور وہ لوگ ایمان لائے اس پر  
 کہ جو کچھ نازل ہوا تیری طرف اور اس پر کہ جو کچھ نازل ہوا تجھ سے پہلے اور آخرت کہ  
 وہ یقینی جانتے ہیں۔ وہی لوگ ہیں ہدایت پر اپنے پروردگار کی طرف سے اور  
 وہی ہیں مراد کو پہونچنے والے۔

## ترجمہ تھانوی :-

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑے مہربان نہایت رحم والا ہے  
 الم ہ یہ کتاب ایسی ہے جس میں کوئی شبہ نہیں۔ راہ بتلانے والی ہے  
 خدا سے ڈرنے والوں کو، وہ خدا سے ڈرنے والے لوگ ایسے ہیں کہ یقین لاتے  
 ہیں چھپی ہوئی چیزوں پر اور قائم رکھتے ہیں نماز اور جو کچھ دیا ہے ہم نے انکو اسمیں  
 سے خرچ کرتے ہیں اور وہ لوگ ایسے ہیں کہ یقین رکھتے ہیں اس کتاب علی جو  
 آپ کی طرف اتاری گئی اور ان کتابوں پر بھی جو آپ سے پہلے اتاری جا چکی ہیں،  
 اور آخرت پر بھی وہ لوگ یقین رکھتے ہیں۔ پس یہ لوگ ہیں ٹھیک راہ پر جو ان کے  
 پروردگار کی طرف سے ملی ہے، اور یہی لوگ ہیں پورے کامیاب۔



## ترجمہ جالندھری :-

شروع نام خدا کا لیکر جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے ۔ الم یہ کتاب (قرآن مجید) اس میں کچھ شک نہیں اکلام خدا ہے (خدا سے ڈرنے والوں کی رہنمائی جو غیب پر ایمان لاتے ہیں اور آداب کے ساتھ نماز پڑھتے ہیں اور جو کچھ ہم نے انکو عطا کیا ہے اس میں خرچ کرتے ہیں اور جو کتاب (اسے محمد) تم پر نازل ہوئی اور جو کتابیں تم سے پہلے (پیغمبروں) نازل ہوئیں سب پر ایمان لاتے ہیں اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں ۔ یہی لوگ اپنے پروردگار کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور یہی نجات پانے والے ہیں ۔

## ترجمہ عاشقی :-

شروع اللہ کے نام سے جو نہایت مہربان بڑا رحم والا ہے ۔ الم یہ وہ کتاب ہے جس میں کوئی شک نہیں ۔ رہنمائی پر مہیزگاروں کیواسطے جو ایمان لاتے ہیں غیب پر اور دوست رکھتے ہیں نماز کو اور اس میں سے کہ جو ہم نے دیا ہے خرچ کرتے ہیں اور جو ایمان لاتے ہیں اس کتاب پر جو (اسے محمد) نازل کی گئی تمہاری طرف اور جو نازل گئیں تم سے پہلے ۔ اور وہ آخرت کا یقین بجلی رکھتے ہیں اور یہی لوگ اپنے پروردگار کے راستہ پر ہیں اور یہی مراد پانے والے ہیں ۔

## ترجمہ مودودی :-

اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے ۔ الف لام میم ۔ یہ اللہ کی

کتاب ہے اس میں کوئی شک نہیں۔ ہدایت ہے ان پر ہیزگاروں کے لئے جو  
غیب پر ایمان لاتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، حور زق ہم نے انکو دیا ہے اس میں  
سے خرچ کرتے ہیں۔ جو کتاب تم پر نازل کی گئی ہے (یعنی قرآن) اور جو کتابیں  
تم سے پہلے نازل کی گئی تھیں ان سب پر ایمان لاتے ہیں اور آخرت پر یقین  
رکھتے ہیں۔ ایسے لوگ اپنے رب کی طرف سے راہِ راست پر ہیں اور وہی فلاح  
پانے والے ہیں۔

## تراجم پنجگانہ اور ترجمانی مودودی — مختصر جائزہ و تجزیہ

سورہ بقرہ کی چند ابتدائی آیات کے متعدد مختلف تراجم کے ساتھ علامہ  
مودودی کی ترجمانی بکلی بطور نمونہ ملاحظہ میں آجیگی اس موقع پر حروف مقطعات کے  
سلسلہ میں دیگر حضرات مترجمین نے جو حاشیے تحریر فرمائے ہیں علامہ کے تفسیری حاشیے  
کے ساتھ ان حضرات کے حواشی کا بکلی ایک نقشہ تقابلی مطالعہ کیلئے انشاء اللہ تعالیٰ  
آئندہ اپنے موقع پر پیش کیا جائے گا۔ سروسٹ تو مختصر طور پر تجزیہ کر کے صرف یہ ظاہر کرنا  
مقصود ہے کہ علامہ مودودی کی یہ "ترجمانی" دوسرے قدیم تراجم کے مقابلہ میں  
کوئی فوقیت و برتری تو کیا رکھتی صحیح معنوں میں اسے اس کے برابر بھی نہیں کہا جاسکتا۔

سب سے پہلے بسم اللہ ہی غلط

نمونہ پیش کئے گئے جملہ تراجم کے ساتھ علامہ کی "ترجمانی" پر غور فرمایا جائے

تو علامہ کی ترجمانی میں سب سے پہلی چیز جو آپ کو اپنی جگہ متوجہ کرے گی وہ علامہ کی ایک ایسی "اُتیح" ہے جسے محاورہ میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ انہی "تو بسم اللہ ہی غلط ہو گئی" علامہ نے جملہ مترجمین سے اختلاف کرتے ہوئے شوق اجتہاد میں "تسمیہ" کا ترجمہ ایک نئے ڈھنگ سے فرمایا ہے۔ ہر ایک مترجم نے عربی قاعدہ نحو کے مطابق "بسم اللہ کی باک متعلق محذوف مانتے ہوئے ترجمہ میں اسکو ملحوظ رکھا ہے جس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ آغاز تلاوت میں بسم اللہ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے نام سے تلاوت و قرأت شروع کی جا رہی ہے لیکن موصوف نے اپنی "ترجمانی" میں "شروع" کا ذکر نظر انداز فرمادیا جس کے باعث ابہام باقی رہ گیا کہ آخر اللہ کے نام سے کیا ہو رہا ہے تلاوت شروع ہو رہی ہے یا ختم ہو رہی ہے؛ گویا موصوف نے جملہ قدیم تراجم کی خامیاں دور کرنے کے لئے بطور تکمیل جو ترجمانی "فرمائی" ہے تو اس سے تکمیل تو کیا ہوتی ترجمہ میں مزید غلام را در جھول پیدا ہو گیا ایسی صورت میں اگر کوئی کہنے والا چاہے تو کہہ سکتا ہے کہ لیجئے علامہ کی "تو بسم اللہ ہی غلط ہو گئی"

### قابلِ غور پہلو

علامہ کے سلسلہ میں معاملہ کا قابلِ غور پہلو یہ ہے کہ موصوف کو "پیروی سلف" اور تقلید اکابر سے کتنا بیرہ ہے کہ موصوف نے شوقِ جدت طرازی اور ذوقِ اجتہاد فرمائی میں بہم اور ناقص ترجمانی کو تو اختیار فرمایا لیکن پیروی سلف اور تقلید اکابر کا دھبہ اپنے دامن پر نہ آنے دیا۔

کلامِ الہی میں اصلاح کا شوق

سورہ بقرہ کی ان منقولہ بالا آیات الذیئت یؤمنون بالغیب سے جو سلسلہ کلام شروع ہوتا ہے وہ پھوٹے پھوٹے کئی جملوں پر مشتمل ہے جو "متعین" کی تعین و تعریف کے طور پر لائے گئے ہیں ان جملوں کے مابین متعدد بار داد و عاطفہ بھی مستعمل ہوا ہے دوسرے مترجمین نے اس موقع پر "نظم قرآنی" کو اپنی حالت پر باقی رکھنا ضروری سمجھا ہے اور داد و عاطفہ کا ترجمہ بھی بار بار کیا ہے لیکن علامہ کا شوق اجتہاد اور ذوق اصلاح اسی صورت میں پورا ہوسکا جبکہ انھوں نے دوسرے مترجمین کے ترجموں سے اختلاف کے ساتھ ساتھ اصلی کلام الہی کو بھی اپنی اصلاح سے آراستہ فرمایا ہے اور اپنی دانست میں اپنی ترجمانی کو دوسرے تراجم کے مقابل میں نہایت درجہ ہندب اور شستہ و شالستہ بنا دیا ہے یعنی ان آیات میں آئے ہوئے داد و عاطفہ کو شاید خلاف فصاحت گردانتے ہوئے اپنی فصیح و بلیغ ترجمانی میں محل سمجھا اور نہ آنے دیا اس طرح تین بار آئے ہوئے داد و عاطفہ کا ترجمہ صاف اڑا ہی گئے۔

## شاید آپ بھی حیران ہونگے

علامہ کی آزاد ترجمانی کے بالمقابل پانچ مشہور تراجم (جو بقول علامہ نفی ترجمے ہیں) آپ نے ملاحظہ فرمائے میرے خیال میں شاید میری طرح آپ بھی حیران ہوں گے کہ واقعی اگر بقول علامہ ان اکابر کے یہ تراجم بھی نفی ہی ہیں تو پھر "سلیس" و "مطلب خیر" ترجمہ کا مصداق صرف علامہ کی آزاد ترجمانی ہی کس طرح ہو سکتی ہے۔ اسلئے مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہم پہلے موصوف کی اس آزاد ترجمانی کا مفہوم و مطلب بھی متعین کر لیں کہ آزاد ترجمانی "سے موصوف کا مدعا کیا ہے اور یہ کہ وہ "ترجمہ" اور "ترجمانی"

میں یکما فرق تصور فرماتے ہیں؟

علامہ موصوف نے اپنے تفسیری دیباچہ میں جگہ جگہ اپنے ترجمہ کے لئے "ترجمانی" یا "آزاد ترجمانی" کا لفظ استعمال فرمایا ہے اور اسکے بالمقابل دوسرے تراجم کیلئے "لفظی ترجمہ" کا فقرہ تحریر فرمایا ہے اس سے بظاہر اندازہ تو یہی ہوتا ہے کہ آزاد ترجمانی سے موصوف کی مراد یہی ہے کہ قرآن مجید کے لفظی ترجمہ کی بجائے سلیس اور معنی نینر مفہوم لکھا جائے لیکن اس صورت میں وہی قباحات سے جو اوپر مذکور ہوئی کہ ایسے لفظی ترجمہ کا واقعی حقیقی مصداق تو حضرت شاہ رفیع الدین صاحب ہی کا ترجمہ ہو سکتا ہے بقیہ دوسرے حضرات کے تراجم یقیناً ایسے نہیں ہیں کہ انھیں "لفظی ترجمہ" کا تنقیدی رویا ک دیکر ان پر غلط نسخہ کھینچ دیا جائے مگر ہمارے علامہ کو نہ صرف اصرار بلکہ بیجا طور پر اصرار ہے کہ انہی ترجمانی کے ماسوا سارے تراجم سوغتہنی اور قلم زدنی ہیں۔

دوسرے تراجم معیار ترجمانی پر کیوں پورے نہیں اترتے

علامہ اپنے اسی دیباچہ میں دوسرے تراجم پر تنقید فرماتے ہوئے تحریر

فرماتے ہیں :-

"پہلی چیز جو ایک "لفظی ترجمہ" کو پڑھتے وقت محسوس ہوتی

ہے وہ روانی عبارت، زور بیان، بلاغت زبان اور تاثیر کلام

کا فقدان ہے۔ قرآن کی سطروں کے نیچے آدمی کو ایسی بے جان عبارت

ملتی ہے جسے پڑھکر نہ روح و جد میں آتی ہے نہ اسکے رونگٹے کھڑے

ہوتے ہیں نہ اسکی آنکھوں سے آنسو جاری ہوتے ہیں۔ اس طرح کا کوئی



تاثر و نما ہونا تو درکنار ترجمہ کو پڑھتے وقت بسا اوقات آدمی یہ سوچتا رہ جاتا ہے کہ کیا واقعی یہی کتاب ہے جسکی نظیر لانے کو دنیا بھر کو چیلنج دیا گیا تھا؟ اسکی وجہ یہ ہے کہ لفظی ترجمہ کی پھلنی صرف دو ا کے خشک اجزاء ہی کو اپنے اندر سے گذرنے دیتی ہے۔ یہی ادب کی وہ تیز و تند اسپرٹ جو قرآن کی اصل عبارت میں بھری ہوئی ہے اسکا کوئی حصہ ترجمے میں شامل نہیں ہونے پاتا وہ اس پھلنی کے اوپر ہی سے اڑ جاتی ہے" (ف)

اس مقام پر علامہ مودودی نے دیگر تراجم قرآن کا آپریشن جس چابکدستی اور ہوشیاری سے فرمایا ہے اسکی داد نہیں دی جاسکتی۔ کس صفائی سے موصوف یہ فرما گئے ہیں کہ "لفظی ترجمہ کی پھلنی دو ا کے خشک اجزاء ہی کو اپنے اندر سے گذرنے دیتی ہے" "لفظی ترجمہ" کا مصداق اوپر ظاہر ہی کیا جا چکا ہے کہ موصوف کے نزدیک انہی "ترجمانی" و تفہیم کے ماسواہر ترجمہ لفظی ہے۔ اب یہاں یہ بھی انکشاف ہو گیا کہ لفظی ترجمہ قرآن کی تیز و تند اسپرٹ کو حاصل کرنے میں رکاوٹ بن جاتا ہے۔ چنانچہ علامہ نے اسی اسپرٹ کو اپنی "میناے ترجمانی" کے ذریعہ ناظرین تک پہنچانے کی کوشش کی ہے اب یہ فیصلہ ناظرین کو کرنا ہے کہ مندرجہ نقشہ تراجم میں انھیں اس تیز و تند اسپرٹ کا کچھ فرق محسوس بھی ہوا یا نہیں؟

علاوہ ازیں یہ بات بھی تشنہ تو ضیح رہی کہ علامہ ان سطور مذکورہ بالا میں صرف "لفظی تراجم" ہی کے نقائص بیان فرما رہے ہیں یا اپنی "ترجمانی" کے ماسوا تمام تراجم کا "آپریشن" فرما رہے ہیں؟

بہر و صورت موصوف کا یہ انداز نگارش کسی طرح معتدل اور ترین انصاف

نہ کہا جائے گا کیونکہ موصوف کی اس تنقید کی روشنی میں دوسرے حضرات مترجمین و مفسرین کی (بقول علامہ) قابل قدر مساعی اور ان کے جملہ تراجم کے متعلق بھی یہی فیصلہ ہوگا کہ وہ تمام تراجم روانی عبارت، زور بیان، بلاغت زبان، اور تاثیر کلام سے بھرپور ہیں اور انکی عبارت ایسی بے جان ہیں جنہیں پڑھکر نہ آدمی کی روح و جذبہ میں آتی ہے نہ ہی اسکے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں، نہ ہی آنکھوں سے آنسو جاری ہوتے ہیں کیونکہ وہ تراجم ہماری دوائے روح کے صرف خشک اجزاء ہی پر مشتمل ہیں اور ادب کی وہ تند و تیز اسپرٹ جو اصل عبارت میں بھری ہوئی ہے اسکا کوئی حصہ ترجمہ میں شامل نہیں ہو سکا بلکہ وہ تو لفظی ترجمہ کی پھلنی کے اوپر ہی اوپر اڑ کر غائب ہو گئی ہے۔

### کیسے یقین کیا جائے

علامہ کے تیر و نشر جیسے یہ جواہر خیز فقرے میں نے اپنی عبارت میں صرف اسلئے شامل کر لئے کہ ان فقروں کی بلیغ زہرناکی ناظرین کرام کو اچھی طرح محسوس و محفوظ ہو جائے۔

بہت ممکن ہے بعض ناظرین کو یقین نہ آئے لیکن انھیں یقین کرنا ہی پڑے گا کہ یہ انداز تبصرہ اس "شرزمہ" کے سربراہ کا ہے جو دوسروں کو ہر کام میں "مثبت انداز" اختیار کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ کیا اس سراپا نشر و جواہر تبصرہ کے بعد دوسرے حضرات علماء کی مساعی ترجمہ "محض تفسیر اوقات کا مصداق ہو کر نہیں رہ جاتیں۔ سابق مترجمین و مفسرین کی خدمت میں "قابل قدر مساعی" کا تحسینی فقرہ بطور خراج تحسین پیش فرما کر پھر انکی شان میں ایسی "بلیغ جو بلیغ" کا انداز نہ بھی پیش کر دینا کمال صحافت نہیں تو اور کیا ہے؟

سچ پوچھئے تو دیباچہ تفہیم کا یہ حصہ اس قدر پیچیدہ اور الجھا ہوا ہے کہ اسکو پڑھکر کسی نتیجہ پر پہنچنا سخت مشکل ہے۔ علامہ چاہتے تو یہ ہیں کہ اردو میں اتنے مختلف النوع کثیر التعداد سلیس و مطلب خیز، مقبول و مشہور تراجم و تفاسیر کے ہوتے ہوئے اپنی آزاد ترجمانی کیلئے کوئی معقول وجہ و اذکار ظاہر کرنے میں کامیاب ہو جائیں مگر وہ کامیابی آسانی سے ہاتھ لگتی نظر نہیں آتی اسلئے وہ بالکل اندھیرے میں "ٹامک ٹوئیاں" جیسی لت و کیفیت میں مبتلا ہیں۔ چنانچہ وہ اپنی تنقید میں کبھی تو قرآن مجید کے "لفظی ترجمہ" کو ہدف اعتراض بناتے ہیں اور کبھی ترجمہ کے بین السطور لکھے جانے کو ساری خرابیوں کی جڑ بتانے لگتے ہیں۔ ملاحظہ ہو ذرا آگے چل کر یوں ارشاد فرماتے ہیں:-

"لفظی ترجموں سے طبائع کے پوری طرح متاثر نہوسکنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ترجمے بالعموم بین السطور درج کئے جاتے ہیں یا نئے طرز کے مطابق صفحے کو دو حصوں میں تقسیم کر کے ایک طرف کلام اللہ اور دوسری طرف ترجمہ لکھا جاتا ہے۔ لیکن اسکا نقصان یہ ہے کہ آدمی جس طرح دوسری کتابوں کو پڑھتا اور ان سے اثر قبول کرتا ہے اس طرح نہ تو وہ ترجمہ قرآن کو مسلسل پڑھ سکتا ہے نہ ان سے اثر قبول کر سکتا ہے کیونکہ بار بار ایک اجنبی زبان کی عبارت اسکے مطالعہ کی راہ میں حائل ہوتی رہتی ہے۔ (دیباچہ تفہیم ص ۵)

گذشتہ صفحات میں دیباچہ کا جو اقتباس پیش کیا جا چکا ہے اس میں علامہ نے "لفظی ترجمہ" کی خرابی یہ ارشاد فرمائی تھی کہ لفظی ترجمہ کی پھلنی سے دو اہمے خشک اجزاء ہی حاصل ہو سکتے ہیں۔ روانی عبارت، زور بیان، بلاغت زبان اور تاثیر کلام

نام کی کوئی چیز ان میں نہیں ہوتی وغیرہ وغیرہ۔ اب اس موقع پر علامہ کا اعتراض اس  
 مذکورہ بالا پہلو سے قطع نظر کرتے ہوئے اس دوسرے پہلو سے ہو رہا ہے کہ بار بار  
 ایک اجنبی زبان کی عبارت اس کے مطالعہ کی راہ میں حائل ہوتی رہتی ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ علامہ کو خود بھی شاید اپنی ترجمانی کے دوران یہ تجربہ  
 ہو گیا کہ قرآن مجید کی وہ تیز و تند اسپرٹ جس کے فقدان کی شکایت وہ دوسرے تراجم  
 میں فرما رہے ہیں وہ تو اسی کلام مجز نظام کے ساتھ مخصوص ہے جس کے لئے فصیحائے عرب  
 کا اعتراف مجز و قصوریوں نقل فرمایا گیا ہے "ما هذا كلام البشر" یہ تو کسی انسان  
 کا کلام نہیں ہے۔

اس کلام الہی کے علاوہ بھی کسی انسانی کلام و عبارت کے متعلق یہ سوچنا  
 بھی بڑی جرات ہوگی کہ اسکو پڑھ کر کوئی انسانی روح اس طرح وجد میں آنے لگے گی  
 یا اس سے رونگٹے کھڑے ہونے اور آنکھوں سے آنسو جاری ہونے لگیں گے جس طرح  
 اصل کلام خداوندی سے ہو جایا کرتے تھے۔

جب حقیقت امر یہ ہوتی تو تعجب ہے علامہ مودودی کی اس عبارت پر  
 کہ انھوں نے کس طرح اصل کلام الہی جیسی تاثیر کی توقع کسی بھی انسانی تحریر سے وابستہ  
 فرمائی کہ جب وہ تاثیر انھیں نہ مل سکی تو اس بات کو وہ ان بیچارے مترجمین کا عیب و  
 نقص قرار دے رہے ہیں کہ ان کے تراجم میں وہ خوبیاں و روانی عبارت وغیرہ نہیں ہیں  
 جو اصل کلام الہی میں پائی جاتی ہیں

ہم نہیں سمجھ سکتے کہ علامہ مودودی اس عبارت کے مترجم ہوتے ہوئے اپنی  
 ترجمانی کی حسن تاثیر و زور بیان کے متعلق اس حد تک "خوش فہمی" میں مبتلا ہو گئے

ہونگے کہ وہ اپنی ترجمانی کو اصل کلام الہی کا بدل بھی سمجھنے لگیں گے۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ موصوف نے دوسرے تراجم کے آپریشن میں ”نوکِ قلم“ کی جراحت کاریوں کا جو مظاہرہ فرمایا ہے اس کے پیش نظر کسی کا یہ گمان بدگمانی تو نہ قرار دیا جاسکے گا کہ آنحضرتؐ اپنی آزاد ترجمانی کے متعلق کسی نہ کسی حد تک اصل کلام الہی جیسی اس روانی عبارت زور بیان، بلاغتِ زبان اور تاثیر کلام کے مدعی ضرور ہیں جس کے نقد ان کی شکایت وہ سابقہ جملہ تراجم میں فراموش ہیں اور یہ یقیناً بہت بڑی جرات ہے جسے بے اَضَلَّةَ اللہِ عَلٰی علم ہی کہا جاسکتا ہے۔

### تنقید کا ایک اور پہلو

علامہ مودودی اپنی نئی اور انوکھی تفسیر بلکہ ”آزاد ترجمانی“ کو مارکیٹ میں لانے کیلئے کسی معقول وجہ جواز کی تلاش میں سرگرداں و پریشان ہیں کبھی کوئی بات فرماتے ہیں تو کبھی کچھ فرماتے ہیں مگر بات بنائے نہیں بن رہی ہے، لیجئے: سب سے آخر میں علامہ بڑی دور کی کوڑھی لے آئے اور سب سے بڑی اور اہم وجہ بھی بیان فرمادی۔ ملاحظہ ہو ارشاد فرماتے ہیں:-

”ایک اور وجہ اور بڑی اہم وجہ فقہی ترجمہ کے غیر موثر ہونے کی یہ ہے کہ قرآن کا طرز بیان تحریری نہیں بلکہ تقریری ہے۔ اگر اس کو منتقل کرتے وقت تقریری زبان کو تحریری زبان میں نہ تبدیل کیا جائے اور جوں کا توں اسکا ترجمہ کر ڈالا جائے تو ساری عبارت غیر مربوط ہو کر رہ جاتی ہے“ (دیباچہ، تفہیم)



اس موقع پر علامہ نے قرآن مجید کے طرز بیان سے متعلق "تفسیری" یا "تحریری" ہونے کا جو نکتہ پیدا فرمایا ہے اسکی "داد" نہ دینا یقیناً "بیدا" کہلایگا اسلئے اس نکتہ کی داد تو ضرور دی جائیگی، لیکن سر درست اس بحث کو تو یہاں ملتوی ہی رکھنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ اسکا بہترین موقع وہاں ہوگا جہاں علامہ نے اپنے مقدمہ تفہیم میں قرآن مجید کے تقریر ہونے کی بحث چھیڑی ہے اس موقع پر ہی ہم علامہ کے اس "نکتہ عجیب" کا خاطر خواہ جائزہ لیں گے۔

### علامہ کا اشہب خامہ یا فرس شطرنج

دیباچہ تفہیم پر کلام ختم کرتے کرتے ناظرین کو علامہ کے کمال صحافت کی جانب بھی متوجہ کرنا چاہوں گا کہ ذرا اس پر کئی غور فرمایا جائے کہ علامہ کا "اشہب خامہ" شاید "فرس شطرنج" ہے کہ حسب موقع و ضرورت دوہری چال چل لیتا ہے۔ علامہ نے ایک طرف تو دیباچہ کی ابتدائی سطروں میں دوسرے حضرات مترجمین کی خدمت میں مدح و تحسین کا کیسا خراج پیش فرمایا تھا (مثلاً ان حضرات کی مساعی ترجمہ کو قابل قدر قرار دیا یا یوں فرمایا کہ یہ خدمت ترجمہ اس سے پہلے متعدد بزرگ بہترین طریقہ پر انجام دے چکے ہیں وغیرہ وغیرہ) اور اب دوسری طرف جب اپنی آزاد ترجمانی کے لئے معقول وجہ جواز پیش کرنے کی نوبت آئی تو وہی قابل قدر ترجمے عیسویں کا پشتارہ اور غامیوں کا پلندہ بن گئے اور انھیں تراجم کے ایسے آپریشن اپنے نوک قلم سے فرما دیے جیسے وہ قابل قدر ترجمے اب صرف "قلم زدنی" ہی بنکر رہ گئے ہوں اور ان میں کا کوئی ترجمہ کارآمد و لائق استفادہ و قابل مطالعہ باقی ہی نہ گیا ہو۔

## ہمیں کہنا یہ ہے

علامہ دودی کو اپنے مشن اور اپنی تحریک مودیت کی تبلیغ و اشاعت کیلئے تفہیم القرآن لکھنی تھی وہ ضرور سمجھتے انھیں طریقہ رسلان المسننت کو چھوڑ کر راہ تشیع و اعتزال اختیار کرتے ہوئے آزاد ترجمانی کرنی تھی وہ اچھی طرح جی ٹکو لکر فرماتے انھیں انکے اس اقدام سے روکتے والے بھلا ہم کون تھے؟ لیکن آخر اسکی ضرورت کیا تھی کہ وہ اپنی ”تفہیم“ سے پہلے کی ساری قابل قدر ساعی (خدمات ترجمہ و تفسیر) پر اس طرح پانی بھی پھیر دیں اور ان پر خط نسخ و بطلان بھی کھینچ دیں۔  
ہم کہہ موصوف سے ایسی کچھ خوش نہیں یا بدگمانی بھی نہیں ہے کہ ہم یہ خیال کر کہ علامہ کو اپنی نوک قلم کی نشریت اور جرات کا کامیابی کا اندازہ ہی نہ ہو گا وہ بالکل بے خیالی میں یہ سب کچھ فرما گئے ہونگے۔

ہم اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ موصوف نے اپنے دیا یہ تفہیم میں یہ سطور بقید ہوش و خواس اور بہ درستی عقل و فہم ہی تحریر فرمائی ہونگی جن سے انکا مقصد بھی اسکے سوا کچھ اور نہ ہو گا کہ وہ نہایت حکمت و ہوشیاری کے ساتھ ترجمہ قرآن کی ساری ہی کاوش کو زور بیان، بلاغت زبان، اور تاثیر کلام سے یکسر خالی اور عاری بنا کر پیچ و پوچ ثابت کر دیں کہ انکی تفہیم القرآن کو مارکیٹ میں جگہ آسانی سے مل جائے اور اب کون کہہ سکتا ہے کہ انھیں انکے مقدمہ میں اس پہلو سے غلط خواہ کامیابی نہیں مل گئی تفہیم القرآن نے مارکیٹ میں جو مقام حاصل کیا ہے اسکا کسی قدر اندازہ ذیل میں دیئے نقشہ و طباعت سے ہو سکتا ہے۔

۱۔ تفہیم القرآن کی پہلی بار اشاعت (علحدہ کتابی شکل میں ورنہ ترجمان القرآن میں تو بہت پہلے سے اشاعت جاری تھی) ۱۹۵۸ء میں ہوئی تعداد دو ہزار تھی۔  
۲۔ پھر گیارہ سال میں متفرق طور پر ۱۹۶۹ء تک متعدد اشاعتوں میں تیرہ ہزار ایک سو

۳۔ اکتوبر ۱۹۷۰ء میں بارہواں ایڈیشن ایک ہزار کی تعداد میں نکلا۔  
۴۔ چودہ ماہ بعد جنوری ۱۹۷۱ء میں تیرہواں ایڈیشن ایک ہزار شائع ہوا۔  
۵۔ دس ماہ بعد دسمبر ۱۹۷۱ء میں چودھواں ایڈیشن دو ہزار شائع ہوا  
راقم سطور کے پیش نظر زیادہ تر یہی چودھواں ایڈیشن رہتا ہے۔ رقا ربطاعت  
سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت ۱۹۸۰ء تک اسکے دو چار ایڈیشن اور بھی نکل چکے  
ہونگے۔

## علامہ کی آزاد ترجمانی خود انھیں کی زبانی

جیسا کہ سطور بالا میں بار بار گزر چکا ہے کہ علامہ نے دوسرے حضرات  
مترجمین کے ترجموں کو "لفظی ترجمہ" کے عنوان سے یاد فرمایا ہے اور اپنے انداز  
ترجمہ کو "ترجمانی کا لقب دیا ہے اسلئے یہ بات ضروری تھی کہ موصوف اپنے اس دیباچہ تفہیم  
میں اپنی ترجمانی کی تفسیر و تشریح خود اپنی ہی زبانی فرمادیں کہ ہر پڑھنے والا ترجمہ  
و ترجمانی کے فرق کو ملحوظ رکھتے ہوئے انکی تفہیم کا مطالعہ کرے۔ چنانچہ موصوف  
ترجمانی کی تشریح یوں فرماتے ہیں:-

"لفظی ترجمہ" میں کسر اور خامی کے یہی وہ پہلو ہیں جنکی تلافی کرنے

کیلے، ترجمانی، کا ڈھنگ اختیار کیا ہے۔ میں نے اس میں قرآن کے الفاظ کو اردو کا جامہ پہنانے کے بجائے یہ کوشش کی ہے کہ قرآن کی ایک عبارت کو پڑھ کر جو مفہوم میری سمجھ میں آتا ہے اور جو اثر میرے دل پر پڑتا ہے اسے حتی الامکان اپنی زبان میں منتقل کر دوں اسلوب میں، ترجمہ پن نہ ہو۔ (دیباچہ، تفہیم ص ۱۱)

## تفہیم القرآن تحریک مودودیت کا خوشنما ”درپن“ ہے

دیباچہ کے پانچ سات صفحات میں نہایت پُر پیچ اور تکرار آمیز بحث کے بعد اس مقام پر علامہ نے اپنی ”آزاد ترجمانی“ کی ترجمانی فرمائی ہے ورنہ اس سے پہلے کے صفحات آپ بار بار پڑھ لیتے آپ کو کچھ پتہ نہ چلے گا کہ موصوف ”لفظی ترجمہ“ یا صرف ترجمہ کسے کہہ رہے ہیں اور ”ترجمانی“ سے انکی مراد کیا ہے؟

راقم السطور نے تو موصوف کے اس دیباچہ کی شان نزول اور وجہ تصنیف یہی سمجھی ہے کہ علامہ نے دیباچہ کے ابتدائی صفحات میں پہلے تو دوسرے ”قدیم تراجم“ کو مختلف پہلوؤں سے مجروح تنقید فرما کر انھیں ”ناقص و بے اثر“ اور غیر مفید قرار دیدیا اس مرحلے سے فارغ ہونے کے بعد اپنی ”آزاد ترجمانی“ کی تعریف و توصیف بلکہ ”تفسیر خوانی“ فرمائی ہے جسکا حاصل صرف یہ نکلتا ہے کہ دیگر قدیم تراجم میں تو ”ترجمین“ کھانا و گوناگوں ”خامیاں“ بھی تھیں قرآن مجید کی اصل و صحیح ترجمانی کی مصداق اگر کوئی تفسیر و ترجمانی ہے تو علامہ کی یہی ”تفہیم القرآن“ ہے جس میں ”آزادانہ پن“ بھی ہے اور ”نیابین“ بھی بلکہ بظاہر کوئی مضائقہ نہیں محسوس ہوتا اگر ان دو مقفی

فقروں کے ساتھ ایک تیسرے ہم قافیہ فقرے کا اضافہ کرتے ہوئے کہہ دیا جائے  
کہ علامہ کی "تفہیم القرآن" "آزادانہ پن" اور "نیا پن" کی حامل ہوتے کے ساتھ  
علامہ کی اصل تحریک مودودیت کا ایک خوشنما "درپن" بھی ہے۔

### دیباچہ تفہیم کا آپریشن ختم ہوتا ہے

ناظرین سے التماس ہے کہ براہ کرم میری مندرجہ بالا تمام ہی معروضات کو بغور  
وانصاف ملاحظہ فرمائیں امید ہے کہ آپ بھی اس نتیجہ تک ضرور پہنچ جائیں گے کہ دیباچہ تفہیم  
کا یہ آپریشن جو ان صفحات گذشتہ میں کیا گیا ہے اور علامہ کی بیان فرمودہ وجوہ تصنیف کا  
تجزیہ جس طور پر کیا گیا ہے یہ کسی طرح بھی تو موصوف کے اس تجزیہ آپریشن سے مختلف نہیں  
جسے انھوں نے اپنے نزدیک قابل قدر تراجم کے حق میں روار کھا ہے (جسکی چند مثالیں دیباچہ  
تفہیم سے اقتباس کر کے پیش بھی کی جا چکی ہیں) جس طرح علامہ کے نزدیک وہ قدیم تراجم  
اس قدر لائق آپریشن ہوتے ہوئے بھی قابل قدر تھے بالکل اسی طرح علامہ کی یہ ساری  
کاوشیں احقر کے اس تجزیہ و تبصرہ اور اس آپریشن کے باوجود قابل قدر باقی رہ سکتی ہیں  
مجھے یقین ہے کہ جو حضرات علامہ کی اس طرز نگارش کو سراہ کر مثبت سنجیدہ و تعمیری خیال  
فرماتے ہوئے اور اسکے اندر چھپے تیراے زہرناکی و خطرناکی کو "فند و تریاق" تصور فرماتے  
ہوئے وہ کسی طرح بھی میری ان معروضات کو غیر مثبت یا غیر تعمیری وغیرہ کا عنوان دیکر  
نا قابل اعتناء اور مالائی توجہ قرار دیکر صرف نظر فرما سکیں گے۔

وہ دنیا تھی جہاں تم بند کرتے تھے زباں میری  
یہ محشر ہے یہاں سنا پڑے گی داستان میری



۱۰ ان گذارشوں میں فقط مقدمہ دیکھ کر کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ میں  
قرآن کا مقدمہ لکھ رہا ہوں یہ قرآن کا نہیں تفہیم القرآن کا مقدمہ ہے  
(مقدمہ تفہیم ص ۱۳)

دارس عربیہ کی چار دیواریوں میں پرانے دقیا نوسی قسم کے علماء و طلباء کے حلقوں  
میں "دفع دخل مقدمہ" کی اصطلاح ایک معروف و متعارف چیز ہے لیکن وہاں بھی "دفع دخل مقدمہ"  
کسی بات کا وہی پہلو ہوتا ہے جو فی الحقیقتہ متوقع و ممکن اور قرین عقل و فہم بھی ہو باقی ایسا  
ناممکن و غیر معقول دفع دخل مقدمہ جیسا کہ علامہ مودودی نے اسی جگہ "ازراہ تفہیم" اختیار  
فرمایا ہے تو ایسا دفع دخل، تو شاید ہی کسی نے دیکھا نہ ہو گا۔

### ناظرین تفہیم سے علامہ کی خوش فہمی

علامہ کے اس دفع دخل، اور پیش بندی کو دیکھ کر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ  
کیا واقعی مومن کو اپنے ناظرین کے متعلق اس حد تک خوش فہمی، یا بے گمانی ہے کہ  
وہ لوگ صرف مقدمہ کا حوالہ ہی دیکھ کر خاتواہ اس غلط فہمی کا شکار ہو جائیں گے کہ یہ  
مقدمہ کہیں اصل قرآن مجید ہی کا تو مقدمہ نہیں ہے؟ اگرچہ علامہ یہ احساس صحیح ہے تو بات  
کا یہ پہلو بھی بڑی حد تک فطرتاً ہی ہوا و ہم نہیں سمجھ سکتے کہ اپنے ناظرین سے متعلق ایسی  
خوش فہمی کیلئے علامہ کے پاس کیا وجہ جواز ہوگی؟ شاید علامہ یہ خیال فرماتے ہوئے  
کہ ان سے پہلے جن حضرات نے تفسیریں لکھی ہیں کسی نے مقدمہ تفسیر نہ لکھا ہو گا؛ علامہ ہی  
کی شخصیت ایسی ہے جس نے پہلی مرتبہ "تفسیری مقدمہ" لکھا ہے اور یوں دفع دخل  
کی ضرورت محسوس ہوئی۔

## اے روشنی طبع!

”اے روشنی طبع تو بہن بلا شدی“ یہ مصرعہ مشہور علامہ نے بھی بار بار پڑھا ہوگا اور انھیں یہ دوسرے بھی نہ گذرا ہوگا کہ کسی وقت یہ مصرع ان پر بھی چسپاں ہو جائیگا مگر نیرنگی حالات و مقدرات دیکھئے کہ آج یہی روشنی طبع ان کے حق میں بھی بلا بن رہی ہے اور ازراہ تفنن ”دفع وغل“ کا مختصر سا فقرہ موصوف کے غلاف پورا ایک مقدمہ ہی بن گیا۔ آخر علامہ سے پہلے بھی تو بہت سے مفسرین نے تفسیریں لکھی ہیں اور بعضوں نے مقدمہ بھی لکھا ہے مگر اب تک کسی کو یہ دوسرے نہیں گذرا کہ وہ اپنی مقدمہ نگاری کیلئے یوں صفا پیش کرے کہ — ”عنوان میں لفظ مقدمہ دیکھ کر کسی کو یہ غلط فہمی“ نہ ہو کہ میں قرآن کا ”مقدمہ“ لکھ رہا ہوں۔

## علامہ کی دل فریب معصومیت

اقتباس بالا میں موصوف نے اپنے ناظرین کو یہ تاثر دینے کی کیسی حسین کوشش فرمائی ہے کہ اگر کسی کو غلط فہمی ہو سکتی ہے تو ان گذارشوں کے عنوان میں صرف لفظ مقدمہ ہی دیکھ کر ہو سکتی ہے ورنہ اس عنوان کے تحت جو گوشہ ہائے بحث اٹھائے گئے ہیں وہ موصوف کے نزدیک مطلق غلط فہمی کا سبب نہیں ہیں۔ حالانکہ حقیقت واقعہ یہی ہے کہ اس عنوان مقدمہ کے تحت آئینہ الے مباحث ہی جس انداز اور جس اسلوب سے پیش کئے گئے ہیں وہی کچھ ایسے نازک اور خطرناک ہو گئے ہیں کہ انھیں پڑھ کر اس غلط فہمی کے امکانات زیادہ روشن ہو جاتے ہیں اور پڑھنے والا ذرا دیر کو یہ سوچنے پر از خود مجبور ہو جاتا

ہے کہ واقعی کہیں یہ مقدمہ اصل قرآن مجید کا تو مقدمہ نہیں ہے۔

## تحت الشعور جذبہ کی کارفرمائی

ایسا لگتا ہے کہ علامہ کے تحت الشعور میں ایسا کوئی جذبہ و خیال بھی کارفرما تھا جو انھیں قرآن مجید کا مقدمہ لکھنے کی ضرورت سمجھا اور سمجھا رہا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مقدمہ تفہیم پڑھتے وقت صاف طور سے یہ گمان ہوتا ہے کہ جیسے کوئی ”وسواس“ آپ سے بھی یہی کہہ رہا ہو کہ واقعی اس دور میں سخت ضرورت تھی کہ قرآن مجید کو عصر حاضر کے ذہن و دماغ کا لحاظ کرتے ہوئے بالکل ہی نئے سرے سے ایڈٹ کیا جائے اور اس پر ایک مبسوط مقدمہ ”تھک“ ”نظم قرآنی“ اور ”کلام الہی“ کا وہ ”خلا“ پُرہ اور وہ ”بھول“ دور کیا جائے جو ”فہم و تدبر قرآن“ کی راہ میں حائل ہے۔

ہو سکتا ہے اسی ”وسواس“ نے علامہ کو بھی اسی خیال کے تحت ”مقدمہ نگاری“ کی ضرورت سمجھائی اور سمجھائی ہو بلکہ عین ممکن ہے کہ علامہ کی ”طبع و قیاد“ اور ”ذہن نقاد“ میں یہ حوصلہ اور جذبہ بھی کہیں انگڑائیاں دینے لگا ہو کہ اگر یہ مقدمہ بھی ”فہم قرآنی“ کیلئے کافی ثابت نہ ہو تو پھر ”جہ“ ”جمہوری“ اسکا کوئی ”استدراک“ ”یا تکملہ“ بھی لکھنا ہو گا جسکے لئے وہ اپنی صلاحیت کا اعتراف بڑے لطیف انداز میں پہلے ہی دیباچہ ”تفہیم میں یوں فرما چکے ہیں کہ ”اس تشنگی کو بچھانے کیلئے کچھ نہ کچھ خدمت میں کر سکتا ہوں“۔

## ناظرین فیصلہ فرمائیں

اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ”مقدمہ تفہیم“ سے کچھ اقتباسات پیش کر کے

وہ گوشہ ہائے بحث بھی ذرا اجاگر اور نمایاں کر دیئے جائیں جسکی بنا پر علامہ کو ازالہ غلط فہمی کی ضرورت (اپنے تحت الشعور کے کسی جذبہ کی تحریک پر) محسوس ہوئی اور یہ سوال اٹھ کھڑا ہوا کہ یہ مقدمہ ”مقدمہ قرآن مجید“ ہے یا مقدمہ ”تفہیم القرآن“؟

علامہ موصوف صرف ابتدائے مقدمہ ہی میں چند سطروں کے بعد فرماتے

ہیں :-

” (الف) عام طور پر ہم جن کتابوں کے پڑھنے کے عادی ہیں ان میں ایک متعین موضوع پر معلومات، خیالات اور دلائل کو ایک خاص تصنیفی ترتیب کے ساتھ مسلسل بیان کیا جاتا ہے اسی بنا پر جب ایک ایسا شخص جو قرآن سے ابھی تک ”اجنبی“ رہا ہے پہلی مرتبہ اس کتاب کے مطالعہ کا ارادہ کرتا ہے تو وہ یہ توقع لئے ہوئے آگے بڑھتا ہے کہ کتاب ہونے کی حیثیت سے اس میں بھی عام کتابوں کی طرح پہلے موضوع کا تعین ہوگا پھر اصل موضوع کو ابواب اور فصول میں تقسیم کر کے ترتیب وار ایک ایک مسئلہ سے بحث کی جائیگی اور اس طرح زندگی کے ایک ایک شعبہ کو بھی الگ کر کے اسکے متعلق احکام اور ہدایات سلسلہ وار درج ہونگی۔ لیکن جب وہ کتاب کھول کر مطالعہ شروع کرتا ہے تو یہاں اسے اپنی توقع کے بالکل خلاف ایک دوسرا ہی انداز سے سابقہ پیش آتا ہے جس سے وہ اب تک بالکل نا آشنا تھا۔“ (مقدمہ تفہیم ص ۱۲)

علامہ کا یہ مقدمہ صرف اسے شروع ہو کر ص ۴۴ تک تقریباً ۲۰ صفحات تک پھیلا ہوا ہے

اور اسکا ایک مقدمہ حصہ تقریباً اسی قسم کے مضامین پر مشتمل ہے جس میں موصوف نے مختلف اور متعدد دلائل کے ذریعہ پہلے تو قرآن مجید کو "تصنیفی ترتیب" اور کتابی اسلوب سے خالی و عاری ثابت کرنے کی کوشش فرمائی ہے اور اس طرح اپنے "مقدمہ و منصوبہ" کی ضرورت خود پیدا کر کے ایک مصلح و محقق کے انداز میں مقدمہ نگاری کے فرائض انجام دیئے ہیں گویا علامہ کا یہ مقدمہ صریحاً تمہیں نے درود دیا ہے تمہیں دوا دینا۔

کامیج مصداق ہے۔ یعنی پہلے تو موصوف نے ناظرین کے ذہنوں کو قرآن مجید کے اسلوب بیان و غیرہ کی طرف سے غیر مطمئن اور متزلزل کرنے کی پیہم اور مسلسل جدوجہد فرمائی اور مکرمہ کرد انداز میں اپنے "مقدمہ ہی مقدمہ" کیلئے ضرورت پیدا کی اور بار بار کی کوششوں کے بعد جب لوگوں کے دل و دماغ اس کے مضامین عالیہ سننے کیلئے پوری طرح آمادہ و تیار ہو گئے تو موصوف نے "قرآن فہمی" کی راہ کشادہ فرماتے کیلئے یہ مقدمہ تحریر فرمادیا جو اپنی نظیر آپ سے اور جسکا ایک اقتباس اوپر مذکور کئی جواہر پر کچھ دوسرے اقتباسات آئندہ آئیں گے اور آپ انہیں ملاحظہ فرما کر اپنے آپکو تائید پر مجبور پائیں گے۔

## علامہ کی ایک اور خوش فہمی

علامہ نے اپنے مقدمہ کے مندرجہ بالا اقتباس میں قرآن مجید کی "تصنیفی ترتیب" اور کتابی اسلوب کے سلسلہ میں جس انداز پر تبصرہ فرمایا ہے اسکو دیکھکر اندازہ ہوتا ہے کہ موصوف کو خود اپنے متعلق "فہمی" ہمہ دانی کا احساس ہے شاید اتنا ہی احساس اپنے ناظرین کی "ہیچدانی" کا بھی ہے اور موصوف کو ناظرین تفہیم کے



متعلق بالکل بجا طور پر یہ بدگمانی ہے کہ ان میں سے کسی نے نہ تو مقدمہ تفہیم کے علاوہ کسی دوسری تفسیر کا مقدمہ دیکھا اور نہ پڑھا ہوگا اور نہ ہی دوسری کتابوں کا قطعاً مطالعہ ہی کیا ہوگا بلکہ دوسرے نکتوں میں یوں کچھ لیا جائے کہ شاید ناظرین تفہیم نے جماعت اسلامی اور تحریک مودودیت سے متعلق لٹریچر کے سوا کوئی دوسری کتاب ہی نہیں دیکھی ہوگی جو جماعتی لٹریچر کے اسلوب بیان اور معیار تصنیف سے ذرا بگلی جڑی ہوئی اور مختلف

### کیا علامہ بتا سکتے ہیں؟

اقتباس مندرجہ بالا میں انھوں نے کتاب کا جو تصور اور خاکہ پیش فرمایا ہے پہلے موضوع کا تعین ہو گا پھر اصل موضوع کو ابواب اور فصول میں تقسیم کر کے ترتیب دیا جائے گا ایک مسئلہ پر بحث کی جائے گی، تو کیا آپ یہ بتا سکتے ہیں کہ یہ سارے قیود و شروط پر کتاب کیلئے ضروری ہیں کہ بغیر ان کے کتاب کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا ہے اگر جواب نفی میں ہو اور یقیناً نفی ہی میں ہو سکتا ہے تو ہمیں بتایا جائے کہ آخر یہ غی آپ کو کس نے دیا کہ آپ اپنی طرف سے کتاب کا ایک خاص مفہوم اور خاص تصور متعین کر لیں اور پھر اپنے موضوع و منصوبہ تصور کے خلاف پا کر قرآن کی تصنیفی ترتیب اور کتابی اسلوب کو اپنی تنقید و تبصرہ کا نشانہ بھی بنائیں اور اسکو تصنیفی ترتیب و کتابی اسلوب سے خالی و عاری بھی قرار دے لیں۔

### تعجب ہے علامہ کی خوش فہمی پر

موصوف نے اپنے قیدی بہنائی کے تقاضے سے مجبور ہو کر "مستدر قرآن"

نکھنے پر تو کتنا زور قلم صرف فرمایا مگر یہ خیال نہ فرمایا کہ اگر کسی نے دوسری کتابوں کا مطالعہ کیا ہوگا اور انکی تصنیفی ترتیب اور کتابی اسلوب کا بھی جائزہ لیا ہوگا تو پھر بات کس طرح بنے گی؟

## کیا تصنیفی ترتیب یا کتابی اسلوب کا عیب قرآن مجید میں موجود بھی ہے؟

علامہ کی خوش فہمی پر روشنی ڈالتے ہوئے ہم نے اشارہ کیا ہے کہ اگر کسی نے دوسری کتابوں کا بھی جائزہ لیا ہوگا تو پھر بات کس طرح بنے گی تو لیجئے ہم آئندہ سطور میں دوسری آسمانی کتابوں کی بعض مندرجات تقابلی مطالعہ کیلئے پیش بھی کئے دیتے ہیں تاکہ علامہ کی ان دوران کار موثر گائیوں کی حقیقت اچھی طرح واضح ہو جائے کہ واقعہ یہی ہے کہ ”قرآن فہمی“ اور اس سے ہدایت یابی اور اصلاح پذیری کے سلسلہ میں قرآن مجید کی تصنیفی ترتیب اور اس کا کتابی اسلوب ہرگز رکاوٹ اور مانع نہیں ہے بلکہ اگر منظر غائب دیکھا جائے اور قرآن مجید اور دوسری کتب مذہب سے تقابل کیا جائے تو واضح ہو جائے گا کہ قرآن مجید کے اسلوب اور دوسری کتب مذہب کے اسلوب میں کوئی مقابلہ کرنا بھی صحیح بات نہ ہوگی کیونکہ قرآن مجید اپنے اصل اسلوب میں محفوظ ہے جو دوسری کتابوں سے کہیں زیادہ معیاری ہے۔ باقی علامہ کا یہ زعم کہ جب تک انکا یہ خصوصی مقدمہ لوگوں کے مطالعہ میں نہ آئیگا ان پر قرآن فہمی اور ہدایت یابی کی راہیں کشادہ نہ ہونگی تو یہ موصوف کی محض خام خیالی ہے۔ ذیل میں تفسیر حقانی سے اقتباس کرتے ہوئے ایک نقشہ پیش کیا جا رہا ہے:-

# قرآن مجید اور دیگر کتبِ اہلب کا تقابلی نقشہ

## قرآن مجید :-

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝ شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان اور رحیم ہے۔  
 اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ تمام خوبیاں اللہ کو جو تمام عالم کا پرورش کر نیوالا ہے۔  
 الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝ بڑا مہربان اور رحم والا ہے۔  
 مَا لِكِ یَوْمَ الدِّیْنِ ۝ جزا کے دن کا مالک ہے۔  
 اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْزُ ۝ ہم تیری ہی عباد کرتے ہیں اور تجھ سے ہی مدد چاہتے ہیں۔  
 اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ۝ ہمیں سیدھی راہ چلا۔  
 صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ ۝ راہ ان لوگوں کی جن پر تو نے انعام کیا  
 غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَلَا الضَّالِّیْنَ ۝ نہ انکی جن پر غضب نازل ہوا نہ گمراہوں کی

## تہجد :-

مبارک وہ آدمی ہے کہ جو شریعوں کی صلاح پر نہیں چلتا اور غلط کاروں کی راہ پر کھڑا نہیں رہتا اور ٹھٹھا کرنے والوں کے جلسہ میں نہیں بیٹھتا بلکہ خداوند کی شریعت میں مگن رہتا ہے اور دن رات اسکی شریعت میں سوچا کرتا ہے سو وہ اس درخت کی مانند ہوگا جو پانی کی نہروں کے کنارے پر لگایا جائے اور اپنے وقت پر میوہ دے جسکے پتے مرجھاتے نہیں۔ اور وہ اپنے ہر ایک کام میں پھولتا پھلتا رہے گا۔ شریاعے نہیں بلکہ وہ بھوسے کی مانند ہیں جسے ہوا اڑا لیجاتی ہے۔ سو شریعہ عدالت میں

کھڑے نہیں ہونگے نہ خطا کار سچوں کی جماعت میں۔ کیونکہ خداوند صادقوں کی راہ  
جاتا ہے۔ پوشریوں کی راہ نیست و نابود ہوگی

## توریت :-

ابتداء میں خداوند نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا اور زمین ویران اور  
مستان تھی اور گہرائی کے اندر اندھیرا تھا اور خدا کی روح پانیوں پر جنبش کرتی اور  
خدا نے کہا اجالا ہوا اور اجالا ہو گیا اور خدا نے اجالے کو دیکھا کہ اچھا ہے اور  
خدا نے اجالے کو اندھیرے سے جدا کیا اور خدا نے اجالے کو دن کہا اور اندھیرے  
کو رات سو شام و صبح پہلا دن ہوا اور خدا نے کہا پانیوں کے بیچ فضا ہوئے اور  
پانیوں کو پانی سے جدا کرے۔ تب خدا نے فضا کو بنایا اور فضا کے نیچے پانیوں کو اوپر  
کے پانی سے جدا کیا اور خدا نے فضا کو آسمان کہا سو شام اور دوسرا دن ہوا۔

## انجیل :-

یسوع مسیح بن داؤد بن ابرہام کا نسب نامہ — ابراہیم سے  
اسحاق پیدا ہوا اسحاق سے یعقوب پیدا ہوا یعقوب سے یہودا اور اس کے  
بھائی پیدا ہوئے اور یہودا سے یہاں اور زارح تمر کے بیٹے سے پیدا ہوئے  
اور یہاں سے حمزم پیدا ہوا اور حمزم سے آرام پیدا ہوا اور آرام سے عمیزاب  
پیدا ہوا اور عمیزاب کے کنوں پیدا ہوا کنوں سے سلیمان پیدا ہوا اور سلیمان سے بوغزارا  
کے بیٹے سے پیدا ہوا وغیرہ وغیرہ۔

## سابق کتابی تصور کا ہوا!

کتاب اربعہ سماویہ (چار آسمانی کتابوں) کے اقتباسات صرف اسلئے نقل کئے گئے ہیں کہ عام ناظرین انھیں ملاحظہ فرما کر "سابق کتابی تصور کا ہوا" بھی بچشم خود دیکھ لیں اور فیصلہ فرمائیں کہ علامہ مودودی نے اپنے مقدمہ تفسیر میں سابق کتابی تصور کا جو ہوا کھڑا کر دیا ہے (جسکی وجہ سے قرآن مجید کو صحیح معنوں میں "کتاب" سمجھنا اور کہنا بھی انکے لئے ایک اچھا خاصا مسئلہ بن گیا ہے) یہ ہوا اصلی اور واقعی نہیں ہے بلکہ موصوف کا قائم کیا ہوا انکا ذہنی و خیالی ہوا ہے۔

## تفہیم القرآن فروغ مودودیٹ کیلئے ایک میاب حربہ

دین کے اس دور انحطاط و اضمحلال میں بھی مسلمان کو "قرآن" اور "صاحب قرآن" سے جو کچھ شغف ہے علامہ مودودی جیسا صاحب ادراک اس سے ناواقف اور بیخبر کیسے ہو سکتا ہے اسلئے موصوف یہ رائے قائم کرنے میں بالکل حق بنجا ہوئے کہ "فروغ مودودیٹ" کیلئے بہترین ذریعہ اور کامیاب ترین حربہ تفسیر قرآن ہی کا ہو سکتا ہے اور وہ تفسیر بکلی ایسی ہو جو صرف اسی مقصد کیلئے تصنیف فرمائی گئی ہو، کیونکہ تفسیر و حدیث کے پرانے ذخیروں کو تو علامہ پہلے ہی نالائق تعلیم قرار دے چکے ہیں چنانچہ اپنے ایک پرانے مضمون میں تحریر فرماتے ہیں

(الف) "قرآن و سنت رسول کی تسلیم سب پر مقدم ہے مگر

تفسیر و حدیث کے پرانے ذخیروں سے نہیں" (منقحات ص ۱۲۶)

(ب) "قرآن کے لئے کسی تفسیر کی حاجت نہیں ایک اعلیٰ درجہ کا پروفیسر کافی ہے" (تنقیحات ص ۲۱۲)

## سوال یہ پیدا ہوتا ہے

جب کتب تفسیر کا پرانا ذخیرہ نالائق اعتقاد قابل تعلیم ٹھہرا اور جب قرآن فہمی کیلئے کسی تفسیر کی بھی حاجت نہیں ہے تو پھر علامہ نے یہ زحمت تصنیف گوارا ہی کیوں کی؟ اور یہ تفہیم القرآن لکھی ہی کیوں؟ اور لکھی بھی تھی تو پھر پرانے ذخیرہ تفسیر سے بے نیاز ہو کر محض اپنی عقل و طبیعت سے کیسے لکھ دی؟ حالانکہ احادیث شریف میں اسکی مذمت اور اس پر وعیدیں وارد ہیں اور علامہ جیسا وسیع المطالعہ ان سے یقیناً بے خبر نہ ہو گا۔ ترمذی شریف کی روایت ہے کہ :-

"جس شخص نے قرآن شریف کی تفسیر میں اپنی طرف سے کچھ کہا (تفسیر بالرائے کی) اسکو چاہیے کہ وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالے" (العیاذ باللہ منہ)۔

## ہم نہیں سمجھ سکے

جب قرآن فہمی کیلئے کسی تفسیر کی ضرورت و حاجت ہی نہیں بلکہ ہر اعلیٰ درجہ کا پروفیسر درس قرآن دے سکتا ہے تو پھر یہ بے ضرورت کام علامہ نے کیوں کیا؟ ہم نے مانا کہ عربی مدارس کے فاضلین اپنی ناقص استعداد اور بے صلاحیتی کے باعث علامہ کی بلند نظر میں نہ آ سکے ہونگے لیکن کالج اور یونیورسٹی کے پروفیسر صاحبان



کے لئے تو ایسی بدگمانی کی کوئی گنجائش نظر نہیں آتی کہ انہیں بھی اب درس قرآن کی صلاحیت رکھنے والے افراد نہ پائے جاتے ہوں۔

ایسی صورت میں علامہ کی یہ خامہ فرسائی بالکل غیر ضروری قرار پاتی ہے یا پھر تفہیم القرآن کی اس تصنیفی کاوش میں "فروع مودودیت" کا جذبہ کار فرما ہے اور ہونہ ہو یہ سب فروع مودودیت ہی کیلئے کیا گیا ہو۔ اور اسی منصوبہ کے تحت علامہ مودودی نے یہ بھی ضروری خیال فرمایا کہ وہ اصل تفسیر سے پہلے اپنی تفہیم القرآن کا "دیباچہ" لکھیں جس میں اپنے سے پیشتر مترجمین و مفسرین کے تراجم و تفاسیر کی خامیاں اور ان کے نقائص و اشکات بھی کر دیں اسکے بعد قرآن مجید کا یا تفہیم القرآن کا مقدمہ بھی تحریر فرمادیں جس کے ذریعہ قرآن مجید کے اسلوب کو کتابی و تصنیفی اعتبار سے بھی مکمل فرما سکیں۔

علامہ نے اپنے اس تفسیری مقدمہ میں صرف انہیں گوشوں پر روشنی ڈالی ہے اور انہیں پہلوؤں سے بحث فرمائی ہے جس کا ذکر کسی کتاب کے آغاز میں عام طور پر مقدمہ الكتاب کے زیر عنوان کیا جاتا ہے۔ لیکن موصوف نے اپنی مقدمہ نگاری کے لئے خطوط ایسے تجویز کئے اور انداز ایسا "پر حکمت اور" فنکارانہ "انتخاب فرمایا کہ ہر ناظر مقدمہ قرآن فہمی کے مقصد میں خواہ کامیاب ہو یا نہ ہو لیکن "تحریک مودودیت" کی پوری حقیقت اور اسکی تدریجی رفتار و ترقی کا اندازہ اس سے مکمل طور پر ضرور ہو جائے گا چنانچہ آپ علامہ کے اس مقدمہ تفہیم کو اگر منظر غائر ملاحظہ فرمائیں گے تو بڑی آسانی سے یہ حقیقت آپکی سمجھ میں بھی آجائیگی کہ تحریک مودودیت کا اصل نقطہ آغاز یعنی "قیام حکومت الہیہ" کس لطیف پیرایہ میں پورے تفسیری دیباچہ و مقدمہ بلکہ اصل تفہیم القرآن ہی کا مرکزی مضمون بنا ہوا ہے۔ موصوف کو جہاں بھی ذرا موقع ملتا ہے تو وہ اپنی

اس "حقیقت منتظرہ" کی جلوہ نمائی کیلئے بڑی طرح مضطرب اور بے چین نظر آنے لگتے ہیں مگر وہ "حقیقت منتظرہ" ایسی ہے کہ دو در نہوت کے تھوڑے ہی عرصہ بعد دنیا سے ایسی رخصت ہونی کہ کسی طرح واپس آنے کا نام ہی نہیں لیتی۔ اب سنا جا رہا ہے کہ مجبوراً علامہ اس حقیقت منتظرہ کو "لباس مجاز" ہی میں دیکھنے پر آمادہ و تیار ہو گئے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اب "طاغوتی نظام" کے ایکشنوں میں حصہ لیکر اس حقیقت منتظرہ کو لباس مجاز ہی میں دیکھ لینے پر قناعت کر لیں۔

## قرآن فہمی اور اس سے ہدایت پذیری کی شاہ کلید کیا ہے ؟

علامہ مودودی نے اپنی تفہیم میں قرآن فہمی کو آسان بنانے اور تدبر قرآن کی راہیں کشادہ کرنے کیلئے جو جو موثر گایاں فرمائی ہیں اسکی کچھ اہمیت اسی وقت ہو سکتی تھی جب وہ اس سلسلہ میں تھوڑی سی روشنی ان باتوں پر بھی ڈال دیتے کہ فہم قرآنی اور ہدایت ربانی کی "شاہ کلید" کس کے قبضہ میں ہے؟ اللہ تعالیٰ نے اسے اپنے قبضہ اختیار میں رکھا ہے یا علامہ جیسے "مقدمہ نگاروں" کی صلاحیت افہام و تفہیم اور استعداد ابلاغ و تبلیغ پر موقوف فرما دیا ہے؟ کہ جو شخص جتنا زور دار مقدمہ تفسیر یا مقدمہ قرآن لکھ سکے گا اتنا ہی فہم و تدبر قرآن آسان ہو جائیگا۔ خدا جانے کیوں علامہ نے اتنی سیار نو بیسی کے باوجود اس سوال و جواب کو کوئی تعرض اپنے مقدمہ تفہیم میں نہیں فرمایا لیکن بار بار جو گوشہ ہائے بحث علامہ نے چھیڑے ہیں ان سے یہ اندازہ لگایا کوئی مشکل نہیں کہ علامہ شاید فہم قرآنی اور تدبر قرآنی

کی "شاہ کلید" اپنی صلاحیت تفہیم اور اپنی استعداد و ابلاغ ہی کو سمجھ رہے ہیں یہی وجہ ہے کہ موصوف نے "مقدمہ تفہیم" میں اپنا سارا زور قلم صرف اتنی سی بات پر صرف فرمادیا ہے کہ قرآن مجید کی ترتیب اسکا اسلوب اسکا انداز بیان وغیرہ سب ہی کچھ بالکل "اجنبی" وغیر مانوس ہے جسکی وجہ سے اب تک اسکے فہم و تدبر کی راہیں بند پڑی تھیں۔ علامہ کی تفہیم القرآن تصنیف ہونے سے پہلے جو شخص بھی قرآن مجید سمجھنے کی کوشش کرتا تھا اسے اپنے سابق کتابی تصور کے خلاف پا کر پریشان ہو جاتا تھا۔ جیسا کہ ہم آئندہ مقدمہ تفہیم سے نقل کریں گے۔

## علامہ کی ہمہ دانی خود علامہ کی زبانی

قرآن مجید کی تصنیفی ترتیب اور اسکے کتابی اسلوب کو مجروح فرماتے ہوئے جس لطیف انداز سے علامہ نے اپنی "ہمہ دانی" پر قصیدہ خوانی فرمائی ہے یہی سچ تو یہ ہے کہ یہ موصوف ہی کا حصہ ہے۔ ملاحظہ ہو اسی اقتباس بالا کے چند سطروں کے بعد فرماتے ہیں

"جب وہ کتاب کھول کر مطالعہ شروع کرتا ہے تو یہاں اسے اپنی توقع کے بالکل خلاف ایک دوسرے ہی انداز بیان سے سابقہ پیش آتا ہے جس سے وہ اب تک بالکل نا آشنا تھا۔ بابوں اور فصلوں کا کہیں نشان تک نہیں ہوتا۔ مخبر سے تو تاریخ نگاری کے انداز میں نہیں، فلسفہ اور مابعد الطبیعیات میں تو منطق و فلسفہ کی زبان میں نہیں انسان اور موجودات عالم کا ذکر ہے تو علوم طبیعی کے طریقہ

پر نہیں، تمدن و سیاست اور معیشت و معاشرت کی گفتگو ہے تو  
 علومِ عمران کے طرز پر نہیں، قانونی احکام اور اصول قانون کا بیان  
 ہے تو مقننوں کے ڈھنگ سے بالکل مختلف، اخلاق کی تعلیم ہے  
 تو فلسفہ اخلاق کے سارے لٹریچر سے اسکا انداز جدا۔ یہ سب اپنے  
 سابق "کتابی تصور" کے خلاف پاکر آدمی پریشان ہو جاتا ہے اور  
 اسے یوں محسوس ہونے لگتا ہے کہ یہ ایک "غیر مرتب" غیر مربوط "منتشر"  
 کلام ہے جواول سے لیکر آخر تک "بے شمار" چھوٹے بڑے مختلف  
 "شذرات" پر مشتمل ہے مگر مسلسل عبارت کی شکل میں لکھا گیا ہے  
 (مقدمہ تفہیم ص ۱۴)

"مقدمہ تفہیم" کے اس طول طویل اقتباس میں علامہ نے اپنی "ہمدانی"  
 "تجربہ علمی" کثرت مطالعہ اور وسعت نظر کا ادعا کس پر حکمت و لطیف انداز میں  
 فرمادیا ہے اور کس مزے سے مختلف علوم و فنون (تاریخ، فلسفہ و مابعد الطبیعیات  
 منطق و فلسفہ، علوم طبیعی، تمدن و سیاست، معیشت و معاشرت، علومِ عمران، قانون  
 اصول قانون، اخلاق و فلسفہ اخلاق وغیرہ) کو نام بنام شمار کرتے ہوئے جہاں یہ ارشاد  
 فرمایا ہے کہ یہ علوم و فنون متعارف طور پر قرآن مجید میں مذکور و موجود نہیں ہیں جبکہ وجہ سے  
 ناظر حیران ہوتا ہے وہیں ان ہی جملوں کے "بین السطور" سے موصوف کا یہ ادعائے  
 "ہمدانی" بھی پھوٹا پڑتا ہے کہ علامہ موصوف ان "جملہ علوم مذکورہ" کے زبردست اسکالر  
 یا ماہر اور پروفیسر ہیں۔ ان علوم کی اکثر و بیشتر کتابیں انکی نظر میں ہیں تو کیسی سہل نگاہی  
 کے ساتھ وہ دوسرے علوم کی مختلف علمی کتابوں سے قرآن مجید کا موازنہ و تقابل فرماتے

اوسے قرآن مجید کو کتابی اسلوب اور تصنیفی ترتیب کے خلاف بھی قرار دے رہے ہیں۔

علامہ کے اس "بین السطور" ادعا کو پڑھکر بیاحتہ داد دینی پڑتی ہے کہ موصوف نے کیسے فنکارانہ اور "پُرکارانہ" انداز میں اپنے ناظرین کو اپنی "شان علم" سے متاثر و مرعوب فرمانے کی کیسی عین کوشش فرمائی ہے۔

## علامہ کی ہمہ دانی دوسروں کی زبانی

۵۔ سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فناء کیا  
کہتی ہے تجھ کو خلقِ خدا غائبانہ کیا

"قصیدہ خوانی" اور پیش کیجا چکی ہے اب ذرا تصویر کا دوسرا رخ بھی ملاحظہ ہو کہ موصوف کا علم دوسرے اہل علم کی نظر میں کتنا ہے؟ علامہ کی علمی سطح کا جائزہ لینے کے لئے خود موصوف کے دو قدیم رفیق کار اصحاب علم کے تبصرے ملاحظہ ہوں، حضرت مولانا محمد منظور صاحب نعمانی جماعت اسلامی سے اپنی علیحدگی کی روداد بیان فرماتے ہوئے رقم طراز ہیں:-

"یہی وہ زمانہ ہے جب مولانا مودودی نے حضرت مولانا محمد منظور صاحب نعمانی "علامہ" کو مولانا لکھنا گوارا فرما لیتے ہوئے (تفہیم القرآن لکھنا شروع کیا تھا اسوقت تک سورہ بقرہ کے ابتدائی چند رکوع پر وہ لکھ چکے تھے انھوں نے یہ حصہ ایک مخصوص صحبت میں مجھے (مولانا نعمانی) اور مولانا امین احسن کو سنایا مولانا امین احسن نے انھیں

مشورہ دیا کہ — اب آپ اپنے آپ کو علی کاموں میں زیادہ  
مصرف نہ کریں؟

## عقل مند کو اشارہ ہی کافی ہوتا ہے

لیکن تفہیم القرآن کے تکمیل پا جانے سے شبہ ہوتا ہے کہ یا تو علامہ نے  
مولانا اصلاحی کے اشارہ کو سرے سے سمجھا ہی نہیں یا اسے اپنے منصوبہ کے خلاف  
سمجھتے ہوئے قابل سماعت ہی نہ سمجھا ہو اور اپنی "حقیقت منتظرہ" سے متعلق اسے  
نصیحت نادان قرار دے لیا ہو۔ کیونکہ یہ حقیقت یقیناً ناقابل انکار ہے کہ موصوف کے  
مزعومات اور منصوبہ جات کی تکمیل کے لئے تفہیم القرآن کی تکمیل بھی از بس ضروری  
تھی کہ وہ اس صورت میں اپنے "ہر منصوبہ" کو کسی آیت کی تفسیر کے ذیل میں پیش کر کے  
اپنے ناظرین کو اسکی دعوت بھی دے سکتے تھے۔ کہنے کے لئے اپنے بچاؤ میں یوں بھی کہا  
جاسکتا تھا کہ تحریک مودودیت کی طرف دعوت نہیں ہے یہ تو دعوت الی الکتاب ہے  
اور اس طرح لوگوں پر فہم و تدبر قرآن کی راہیں کشادہ کی جا رہی ہیں۔

## اشارہ کافی نہ ہو تو صراحت بھی ملاحظہ فرمائیں

مولانا امین احسن صاحب نے علامہ کو اشارہ جو مشورہ دیا تھا اسکا مطلب  
واقعہً وہی تھا جسکی طرف ابھی ابھی اشارہ کیا گیا یعنی مولانا اصلاحی صاحب کے  
نزدیک علامہ تفسیر نگاری کے لئے اہل و موزوں نہ تھے جیسا کہ مولانا نعمانی صاحب اسی  
سلسلہ کلام میں مزید صراحت کے ساتھ ارشاد فرماتے ہیں :-



”دوسرے وقت مولوی امین احسن صاحب نے مجھ سے  
(مولانا نعمانی صاحب) یہ بھی کہا کہ میں نے یہ مشورہ مولانا مودودی کو اسلئے  
بھی دیا تھا کہ جو کچھ اس وقت انھوں نے سنایا اس سے میں نے اندازہ کیا  
مولانا کے علم کے بارے میں جو اندازہ انکے مضامین سے تھا انکا علم اس  
سے بہت کم ہے۔ خاصکر قرآن مجید کے بارے میں انکا علم و فکر بہت  
سطحی ہے اور قرآن پر غور کرنے کے لئے ”علوم عربیت“ خاص کر نحو سے  
جتنی واقفیت ضروری ہے مولانا نے اسکو حاصل کرنے کی کوشش  
نہیں کی ہے۔

سلسلہ کلام میں مولانا اصلاحی کا یہ نظریۂ فقہ اب تک  
حافظہ میں بالکل انہیں کے لفظوں میں محفوظ ہے کہ — ”بھئی میں تو  
مولانا کی ”علمی سطح“ کے بارے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ لا فرق  
بینہ و بین پرویز“ (علامہ مودودی اور پرویز پر دیز میں ”علمی  
سطح“ کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہے)۔

(جماعت اسلامی سے مجلس مشاورت ۳)

یہ ایک نہیں دو شہادتیں ہیں

علامہ کی علوم عربیت سے بیگانگی و ناواقفیت پر مندرجہ بالا شہادت  
درحقیقت دو شہادتوں کا مجموعہ ہے کیونکہ مولانا امین احسن صاحب سب سے  
صاحب علم اور دانائے علوم عربیت علامہ مودودی کے خلاف شہادت دے رہے

اور مولانا نعمانی جیسے دوسرے صاحب علم اپنی تائید و تصدیق کے ساتھ انکی شہادت  
نقل فرما رہے ہیں

## ایک اور علمی شہادت

محدث اعظم ہند حضرت علامہ شاہ محمد انور صاحب علیہ الرحمہ کشمیری کے مشہور  
شاگرد رشید ہندوپاک کے مشہور عالم و محدث مولانا محمد یوسف صاحب بنوری علیہ الرحمہ  
اپنے رسالہ "بینات بابت رجب ۹۶ھ مطابق اگست ۱۹۷۶ء میں "بصائر و عبر" کے  
ذیل عنوان تحریر فرماتے ہیں :-

### "مودودی صاحب کی شخصیت ابھرنے کا اصل راز"

"یہ دونوں بزرگ (مولانا مسعود عالم صاحب مودودی اور مولانا  
امین احسن صاحب اہلحاجی) عرصہ تک مودودی صاحب کے دست  
و بازو بنے رہے مولانا مسعود عالم صاحب مرحوم نے عربی ادب کے  
کے ذریعہ خدمات انجام دیں اور مودودی صاحب کی تحریرات اور کتابوں  
کے آب و تاب سے عربی تراجم کئے اور تربیت کر کے چند شاگردوں  
کو بھی تیار کر دیا۔۔۔۔۔ عرب ممالک میں خصوصاً سعودی عرب کو  
متاثر کرنے کے لئے اور وہاں کے شیوخ کو مہنوا بنانے کے لئے مختلف  
انداز سے کام کیا اور اسے اس انداز سے پیش کیا جاتا رہا کہ یہ سب  
کچھ مودودی صاحب کی توجہات کی رہین منت ہیں اس سے انکی

”شخصیت“ بنی شروع ہو گئی اور تمام جماعت کے افراد کی تالیفات

خود وجاہت کا فائدہ اٹھایا (اصطلاح فقہ میں شرکت وجوہ اسی  
انداز کی ایک شرکت کا نام ہے جس میں ایک شخص محنت کرتا ہے اور  
دوسرا اپنی وجاہت و شہرت کے اثر سے کاروبار میں شریک ہو کر  
فائدہ اٹھاتا ہے)

خود عربی لکھنے سے معذور انگریزی لکھنے سے معذور

عربی لکھ سکتا ہے نہ بول سکتا ہے (یہ صیغہ واحد مولانا بنوری کی  
پشاور کی زبان کا اثر ہے مولانا کا مقصد یہی ہے کہ علامہ مودودی صاحب  
عربی لکھ سکتے ہیں نہ بول سکتے ہیں) یہی انگریزی کا حال بھی ہے لیکن  
جو کتابیں ترجمہ کی گئیں ان کے سرورق پر بھی لکھا گیا ”تالیفات المودودی“  
کہیں یہ نہ لکھا کہ یہ ترجمہ معذور عالم کا ہے یا عاصم حداد کا ہے لوگ سمجھتے  
کہ اردو کا یہ ادیب کیا ٹھکانا عربی کا بھی امام ہے حالانکہ بے چارے  
مقدمی بھی نہ تھے۔

(ماہنامہ ”بینات“ کراچی بحوالہ اکابر امت ص ۳۵)

## لائق ترجمہ سید انکشاف

یہی مولانا یوسف صاحب بنوری علیہ الرحمہ اپنے عربی رسالہ ”الاتحاد المودودی“

میں یہ انکشاف فرما رہے ہیں کہ علامہ مودودی صاحب نے دمشق کے کسی اجتماع میں اپنا  
مقالہ عربی کی بجائے اردو میں پیش فرمایا اور سامعین کو حضرت مولانا ابوالحسن علی صاحب

ندودی سے اسکی ترجمانی کرانی پڑی، (الاتذالہ دودی صاحبہ اول)

## ایک اور شہادت حق

دارالعلوم دیوبند کے ایک فاضل نے جو جماعت اسلامی سے باضابطہ وابستہ بھی تھے اب سے تقریباً ۲۳ سال پہلے اپنے استاذ حدیث حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی علیہ الرحمہ کے زمانہ حیات میں حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہ ہتتم دارالعلوم دیوبند کی خدمت میں ایک عریفہ ارسال فرمایا تھا جس میں یہ کوشش فرمائی تھی کہ حضرات دارالعلوم جماعت اسلامی (والوں سے اختلاف رکھنے میں شدت نہ اختیار فرمائیں کیونکہ ان صاحب کے خیال میں اختلافات اصولی قسم کے نہ تھے بلکہ صرف فروعی اختلافات تھے۔ دارالعلوم کی جانب سے انھیں جو کچھ جواب دیا گیا وہ ”مودودی دستور و عقائد کی حقیقت“ کے نام سے ایک رسالہ کی شکل میں دیوبند سے اسی زمانہ میں شائع بھی کر دیا گیا تھا۔ اسی رسالہ کے صفحہ ۲۹ پر ان فاضل دارالعلوم کے مکتوب سے یہ جملے بھی نقل کئے گئے ہیں۔ فرماتے ہیں :-

”صرف تحریک اقامت دین کی صحت کی بنا پر جماعت اسلامی کارکن ہوں اور تحقیقی طور پر معلوم کر چکا ہوں کہ جماعت اسلامی اور علمائے دیوبند کے درمیان بعض مسائل میں فروعی اختلاف ہے اصولی قطعاً نہیں ہے اور مودودی صاحب نے بوجہ علم کامل ہونے کے اپنی تحریرات میں جو واقعی غلطیاں کیں ہیں انہیں حق بجانب علمائے دیوبند میں“  
(مودودی دستور و عقائد کی حقیقت)

یہ بزرگوار فاضل دیوبند جماعت اسلامی کے رکن بھی تھے (جسکی مراجعت

انکے اسی خط میں موجود کھلی ہے) کتنے واضح الفاظ میں علامہ کا علم میں کامل نہ ہونا اور علامہ کا بوجھ نہ ہونا علمائے دیوبند کا حق بجانب ہونا سب کچھ فرما رہے ہیں۔

یہ شہادت حق اسلئے زیادہ لائق توجہ ہے کہ موصوف اگر ایک طرف

فاضل دارالعلوم ہیں تو دوسری طرف جماعت کے رکن بھی ہیں۔

خلاصہ معروضات یہ ہوا کہ شہادت اربعہ مذکورہ بالا کی روشنی میں حقیقت

پوری طرح نمایاں ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ علامہ نے مندرجہ بالا اقتباس مقدمہ میں اپنی

"ہمہ دانی" کے "بین السطوری" ادعا سے ناظرین کو مرعوب کرنے کی جو "پروکار" کوشش

فرمائی ہے موصوف اپنی اس کوشش میں پوری طرح ناکام ہو گئے۔

آخر کار سمجھنے والوں نے حقیقت کو سمجھ ہی لیا اور پانے والے "معارض حقیقت"

پا ہی گئے کہ علامہ کے علم کے بارے میں جو اندازہ اب تک انکے مضامین پڑھکر لگایا جاتا

رہا ہے انکا علم اس سے بہت کم ہے۔ خاصکر قرآن مجید کے بارے میں تو انکا علم و فکر بہت

سطحی ہے۔

مقدمہ تفہیم کے دو اقتباسات پر تبصرہ پیش نظر کیا جا چکا ہے جن میں علامہ

نے قرآن مجید کو "عام کتابی تصور" اور "تصنیفی ترتیب" سے مختلف "غیر مانوس و

اجنبی طرز کی کتاب ثابت فرما کر اپنی "مقدمہ نگاری" کیلئے اپنے ناظرین کی "ذہن سازی"

فرمائی ہے لیکن ظاہر ہے کہ قرآن مجید کا مقدمہ الکتاب لکھنے کیلئے محض اتنی بات تو

وجہ جواز نہیں ہو سکتی تھی اسلئے موصوف نے اپنے دیباچہ میں جس طرح جملہ تراجم و

تفاسیر پر خط نسخ و بطلان کھینچنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا ڈالا تھا اور اپنی ترجیحی

کے ماسوا جملہ تراجم قرآنی کو بالکل ہی بے فائدہ ہے معنی، بلکہ قرآن فہمی کی راہ میں رکاوٹ ثابت کرنے کیلئے متعدد دلیلیں پیش فرمائی ضروری سمجھی تھیں اسی طرح موصوف اپنے مقدمہ میں بھی سارا زور قلم اس پر صرف فرما رہے ہیں کہ معاذ اللہ خود قرآن مجید بھی اپنے "مخصوص انداز بیان" اور اپنے منفرد اسلوب تعبیر اور اپنی خاص اصطلاحی زبان کی وجہ سے "ہدایت پذیری" کی کما حقہ صلاحیت ہی نہیں رکھتا جسکی وجہ سے علامہ موصوف کو فہم و تدبر قرآنی کی راہ میں کشاوہ کرنے کیلئے یہ دیباچہ و مقدمہ لکھنا پڑا موصوف اپنے اسی مقدمہ کے بالکل آغاز ہی میں یوں رقم طراز ہیں :-

"ایک عام ناظران باتوں سے اچھی طرح واقف ہو جائے جنکو ابتداء میں سمجھ لینے سے "فہم قرآن" کی راہ آسان ہو جاتی ہے اور باوقاف محض انکے نہ سمجھنے کی وجہ سے آدمی برسوں معانی قرآن ہی کی سطح پر گھومتا رہتا ہے۔ گہرائی میں آنے کا راستہ اسے نہیں ملتا (مقدمہ تفہیم ص ۱۳۱)

### علامہ کی دودھھاری تلوار

اقتباس بالا میں علامہ کی یہ تحریر کیا ہے دودھھاری تلوار ہے جس نے علامہ سے پیشرو مترجمین و مفسرین کو معانی قرآن کی سطح پر پا کر فنا کے گھاٹ ہی اتار دیا اور ساتھ ہی ساتھ خود آں علامہ کی رسائی بحر المعانی کے قعر تک ثابت کر دی۔

علامہ کی یہ سطور پڑھ کر انکا ناظر کیا یہ تاثر نہ لے گا کہ واقعی قرآن فہمی کی اس تہہ تک علامہ کے سوا کوئی دوسرا بھلا کیسے پہنچ سکتا ہے، یقیناً یہی تاثر لے گا بلکہ واقعہ تو یہ ہے کہ علامہ کے ناظرین نے بالعموم یہی تاثر لیا کیلئے ہے جیسا کہ عام طور پر مشاہدہ ہے۔



ایسی صورت میں یہ بات قابل غور ہے کہ علامہ کا اپنی تحریروں کے ذریعہ ایسے تاثرات مرحمت فرمانے کی کوشش کرنا اور ناظرین کا ایسے تاثرات قبول کر لینا کیا پیشتر حضرات مترجمین و مفسرین پر صریح ظلم نہیں ہے؟

گذشتہ سطور میں ہم نے مولانا امین احسن صاحب اصلاحی اور مولانا محمد منظور صاحب نعمانی نیز مولانا محمد یوسف صاحب بنوری کی شہادتوں کی روشنی میں علامہ کی ”علیٰ سطح“ ناپ کر اپنے ناظرین کے سامنے پیش کر چکے ہیں کہ ان حضرات کے نزدیک علامہ کی پیمائش علم یہ ہے کہ :-

”علامہ کے علم کے بارے میں جو اندازہ اب تک ان کے مضامین سے تھا ان کا علم اس سے بہت کم ہے۔ خاص کر قرآن مجید کے بارے میں ان کا علم دیکو بہت سطحی ہے“

کہیں ایسا تو نہیں کہ

علامہ مودودی بھی اپنی تفہیم لکھنے کے وقت بقول خود معانی قرآن کی اوپری سطح پر گھومتے رہے ہوں اور انھیں قرآن مجید کی گہرائی میں اترنے کا راستہ نہ مل رہا ہو کیونکہ موصوف کے بیان کے مطابق جیسا کہ ان کے دیباچہ سے بھی ظاہر ہوتا ہے اور مولانا محمد منظور صاحب نعمانی کی مذکورہ بالا شہادت سے بھی واضح ہو جاتا ہے کہ علامہ نے اپنی تفہیم نویسی ۱۹۴۲ء کے لگ بھگ شروع کی تھی اور اس وقت موصوف کی علیٰ سطح وہی تھی جس کی تفہیل اوپر عرض کیا جا چکی ہے تو ظاہر ہے کہ اس وقت تو علامہ خود بھی معانی قرآن کی گہرائی تک نہ پہنچے ہونگے اور اوپری سطح پر ہی چکر کاٹتے رہ گئے ہونگے۔

بہر حال چونکہ علامہ کے نزدیک قرآن مجید کا فہم و تدبر اور اس سے "ہدایت  
پذیری" انکے اپنے تصنیف کردہ "مقدمہ الکتاب" کے بغیر ممکن ہی نہیں ہے اس لئے  
موصوف اپنے مقدمہ قرآن یا مقدمہ تفہیم کی مزید ضرورت و اہمیت کو ثابت کرنے کیلئے زرا اور  
کھلکھل صاف صاف طور پر اپنی بات یوں پیش فرماتے ہیں

"پھر ایک کتاب کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ  
پڑھنے والے کو موضوع "معلوم ہو مقصد و مدعا اور اس کے "مرکزی مضمون"  
کا علم ہو اس کے انداز بیان سے واقفیت ہو اسکی اصطلاحی زبان اور  
اور اس کے مخصوص طرز تعبیر سے شناسائی ہو اور اس کے بیانات اپنی ظاہری  
کے پیچھے جن احوال و معاملات سے تعلق رکھتے ہوں وہ بھی نظر کے  
سامنے رہیں"

"ایک عام کتاب خواں کی سی ذہنیت لیکر جب ہم میں کا  
کوئی شخص قرآن شریف کا مطالعہ شروع کرتا ہے تو اسے کتاب کے "موضوع"  
اور "مرکزی مضمون" کا سراغ نہیں ملتا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ متفرق آیات  
میں حکمت کے جو موتی بکھرے ہوئے ہیں ان سے کم و بیش مستفید ہونے  
کے باوجود اصل کلام اللہ کی روح تک پہنچنے سے محروم رہ جاتا ہے"

## قرآن مجید کی اصل روح کیا ہے؟

کلام اللہ کی اصل روح کیا ہے؟ اور اس تک رسائی کیسے ہو سکتی ہے؟  
اس پر روشنی تو انشاء اللہ ہم آئندہ ڈالیں گے اور قدرے تفصیل سے بتائیں گے کہ

قرآن مجید کی اصل روح "ہدایت" ہے اور یہ ہدایت علامہ کی تفہیم یا مقدمہ تفہیم پر ہرگز موقوف نہیں ہے۔ فی الحال تو اس طویل اقتباس کو آپ بار بار پڑھ جائیے آپ کو اس سے بس دو ہی تاثر حاصل ہونگے :-

(الف) "قرآن فہمی کیلئے مجید ضروری ہے کہ قرآن مجید پڑھنے والے کو اس کے "موضوع" اسکے "مقصد و مدعا" اسکے "مرکزی مضمون" کا علم ہو۔ اسکے انداز بیان اسکی اصطلاحی زبان اسکے مخصوص طرز تعبیر سے واقفیت ہو اور جن احوال و معاملات کے سلسلہ میں آیات قرآنی کا نزول ہوا ہے وہ کئی نظر کے سامنے ہیں (جسے عرف عام میں شان نزول کہا جاتا ہے)۔

(ب) قرآن مجید عام کتابی اسلوب اور تصنیفی ترتیب کے مطابق نہیں ہے جس کی وجہ سے آدمی برسوں معانی قرآن کی سطح پر گھومتا رہتا ہے اور گہرائی میں اتر کر اصل کلام اللہ کی روح تک رسائی حاصل کرنے سے محروم رہ جاتا ہے۔

یہ ہیں وہ دو تاثرات جو علامہ کے مندرجہ بالا اقتباس سے حاصل ہوتے ہیں۔

## سوال ہوتا ہے کہ

جب بقول علامہ قرآن مجید کو صرف سمجھے کیلئے کتنی ہی باتوں کا علم حاصل کرنا اور کتنی ہی چیزوں پر نظر رکھنا اس قدر ضروری ہے تو پھر قرآن مجید کو سمجھانے اور اسکی تفسیر لکھنے کے لئے کتنی علمی گہرائی اور ماہرانہ واقفیت کی ضرورت ہوگی۔ کاش ہمارے علامہ اپنے طویل مقدمہ میں کچھ روشنی اس پہلو پر بکھلی ڈال دیتے اور اپنے دیباچہ میں جن مترجمین و مفسرین کی تفسیری کاوشوں پر پانی پھیرنے کی کوشش فرمائی ہے تو اپنے اس مقدمہ میں ذرا ان حضرات کی علوم متعلقہ تفسیر سے واقفیت کو بھی زیر بحث لے آتے تو اچھا

ہوتا کہ ناظر تفہیم کو ایک طرف جہاں علامہ کی مفسرانہ برتری کا احساس ہوتا وہیں دوسری طرف یہ بھی تو نظر آ جاتا کہ تفسیر نویسی کے لئے کیا شرائط و لوازم ہیں اور اس اعتبار سے علامہ کس مقام بلند تک رسائی حاصل فرما سکے ہیں۔

مثال کے طور پر علامہ، حضرت شیخ الہند علامہ شبیر احمد عثمانی، حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی، مولانا عبدالحق حقانی، مولانا عاشق الہی صاحب میرٹھی مولانا فتح محمد صاحب جالندہری وغیرہم کی مفسرانہ صلاحیتوں اور تفسیری کاوشوں پر بھی نقد فرالیتے تو اچھا ہوتا اور تقابلی طور پر ہر ناظر تفہیم کو یہ بصیرت حاصل ہو جاتی کہ تفسیر قرآن لکھنے کیلئے واقف کیا کیا شرائط ہیں اور تفسیر نگاری کیلئے کتنی مہارت اور خداقت و کار ہوتی ہے اور وہ حضرات مفسرین اس میں کیا مرتبہ و مقام رکھتے تھے اور خود آنجناب جو ان کے مصلح اعظم بن کر ہویدا ہوئے ہیں کس مقام تک رسائی رکھتے ہیں؟

## یہ کہاں کا انصاف ہے؟

علامہ عام ناظر قرآن کو تو اپنے علمی تجربے سے مرعوب کرنے کے لئے یہ باور کرانے کیلئے کوشش پر کوشش فرماتے جا رہے ہیں کہ دیکھو!

"قرآن کا سمجھنا آسان نہیں ہے" کیونکہ :-

(الف) قرآن مجید دوسری کتابوں سے بہت مختلف ہے نہ تو اسمیں تصنیفی ترتیب ہے نہ کتابی اسلوب ہے، اسمیں کسی قسم کا ربط و تسلسل بھی نہیں ہے۔ یہ تو مختلف تشکیلات ہیں جو تسلسل عبارت کی شکل میں یکجا کر کے بکھدیے گئے ہیں۔

(ب) قرآن مجید کو سمجھنے کیلئے ضروری ہے کہ پڑھنے والے کو اسکا موضوع و مدعا مرکزی

مضمون، انداز بیان، اسکی اصطلاحی زبان، مخصوص طرز تعبیر وغیرہ معلوم ہو بغیر اسکی قرآن مجید سمجھا نہیں جاسکتا اسکی اصل روح تک رسائی نہیں ہو سکتی اسلئے جو شخص بھی قرآن مجید کو سمجھنا چاہتا ہو اسکی اصل روح اور گہرائی تک رسائی چاہتا ہو تو وہ صرف تفہیم القرآن ہی کے ذریعہ رسائی حاصل کر سکتا ہے جس کے دیباچہ میں جملہ تراجم و تفاسیر پر خط کشی کی گئی ہے اور جس کے مقدمہ میں ”قرآن فہمی“ اور اس سے ہدایت پذیری کیلئے سارے اسباب فہم و تدبیر جمع کر دیئے گئے ہیں کہ اب تو آئندہ قیامت تک کسی دوسرے ”ابو جہل“، ”ذوالہلب“ یا ”عاص بن وائل“ اور ”ولید بن مغیرہ“ کے پیدا ہونے کا کوئی امکان ہی باقی نہیں رہ گیا ہے۔ اب تفہیم القرآن پڑھ کر ہر شخص حضرت عمرؓ و حضرت جبریلؑ بن سکتا ہے اور جب معاملہ خود اپنا آگیا اور سوال ہوا تفسیر لکھنے اور قرآن مجید کے پڑھنے پڑھانے کا تو بات بدل دیکھی اور ناظرین کو اس بات کیلئے آمادہ کر لیا گیا کہ قرآن مجید کا جو مفہوم و مطلب علامہ کی سمجھ شریف میں آجائے بس وہی صحیح ہے اور گویا وہی مراد خداوندی بکلی ہے۔ چنانچہ موصوف تفہیم القرآن کے ابتدائی دور میں یوں ارشاد فرماتے ہیں :-

”اس تفسیر میں جس چیز کی کوشش میں نے کی ہے وہ یہ ہے کہ قرآن کو پڑھ کر جو مفہوم میری سمجھ میں آتا ہے اور جو اثر میرے قلب پر پڑتا ہے حتی الامکان جوں کا توں اپنی زبان میں منتقل کر دوں“

(ترجمان القرآن ص ۳۰۰ بابت محرم ۶۱ھ)

پھر یہی سلسلہ تفہیم جب علامہ تفسیر و کتاب کی شکل میں شائع ہوا تو اسکی دیباچہ میں یہ عبارت بہت معمولی سی لفظی رد و بدل کے ساتھ یوں نقل ہوئی :-

”میں نے اس میں قرآن کے الفاظ کو اردو کا جامہ پہنانے کے بجائے یہ کوشش کی ہے کہ جو مفہوم میری سمجھ میں آتا ہے اور جو اثر میرے دل پر پڑتا ہے اسے حتی الامکان صحت کے ساتھ اپنی زبان میں منتقل کر دوں“ (دیباچہ تفہیم طبع یازدہم ص ۱)

اور ایک دوسری جگہ مسلمانوں کیلئے ”ہدایت تعلیمی پالیسی“ اور ”لائحہ عمل تجویز کرتے ہوئے یوں ارشاد فرمایا ہے:-

”قرآن کیلئے کسی تفسیر کی حاجت نہیں ایک اعلیٰ درجہ کا پروفیسر کافی ہے جس نے قرآن کا بنظر غائر مطالعہ کیا ہو اور جو طرز جدید پر قرآن پڑھانے اور سمجھانے کی اہلیت رکھتا ہو“ (تنقیحات ص ۲۱۲)

## فتنہ کی نشان دہی

ممکن ہے بعض حضرات علامہ کے مندرجہ بالا ارشاد کی خطرناکی پوری طرح محسوس نہ فرمائیں اس لئے اس موقع پر یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ علامہ قرآن نہیں کے سلسلہ میں تفسیر و حدیث کے پرانے ذخیروں کو یونہی سوختی قرار نہیں دیتے ہیں کسی تفسیر کی حجت نہ ہونے پر بلا کسی وجہ کے زور نہیں دے رہے ہیں بلکہ اسکے تحت موصوف کا مستقل ایک منصوبہ مضمر ہے وہ یہ کہ کسی نہ کسی طرح اپنے ناظر کا ذہن پہلے تو اس بات کیلئے تیار کر لیا جائے کہ قرآن فہمی کیلئے پرانی تفسیریں کسی درجہ میں بھی ضروری بلکہ قابل مطالعہ بھی نہیں ہیں اور اس طرح جب انکا اعتماد دوسری تمام تفسیروں سے اٹھ جائے تو اس وقت اپنی تفہیم القرآن اور قرآن کی آزاد ترجمانی پیش کر کے اپنے منصوبہ کو بروئے کار لایا جائے۔



تحریک بودودیت کا یہی وہ خطرہ وقت ہے جسے علماء حق نے اپنی چشم بصیرت اور نور فراست سے محسوس کر لیا تھا اور اب سے بہت پہلے ہی جماعت کے متعلق اپنے ارشادات کے ذریعہ فریضہ تبلیغ و ہدایت ادا فرما چکے تھے

## قرآن فہمی کے دو معیار کیسے؟

علامہ کے مندرجہ بالا ارشادات کی روشنی میں قرآن فہمی کیلئے دو مختلف و متضاد قسم کے معیار سامنے آتے ہیں۔ یعنی قرآن مجید کے صرف مطالعہ کیلئے جو معیار علامہ نے پیش فرمایا ہے وہ تو اونچے درجہ کا اور ذرا مشکل معیار ہے کہ جب تک علامہ کا تصنیف کردہ مقدمہ تفہیم (جو قرآن مجید کیلئے بطور مقدمہ الکتاب تحریر فرمایا گیا ہے) نہ پڑھ لیا جائے اور اسکی مدد سے قرآن مجید کا موضوع و دعاء و مرکزی مضمین اور انداز بیان و اصطلاحی زبان اور مخصوص طرز تبیین نہ سمجھ لی جائے۔ قرآن کی اصل روح تک رسائی اور اسکی گہرائی تک پہنچ بالکل ناممکن اور کسی طرح اس سے استفادہ اور ہدایت پذیری ہو ہی نہیں سکتی۔ اور جب قرآن مجید کی تفسیر کھنے یا پڑھانے کا موقع ہو تو اسکے لئے دو سرے معیار جو مندرجہ بالا پہلے معیار سے بہت ہی پست درجہ اور آسان بھی ہے کہ جس نے بھی اپنی راست میں قرآن مجید کا مطالعہ بنظر غائر کیا ہو چاہے وہ کوئی صرف پروفیسر ہی ہو (یا پروفیسر بھی نہ ہو بلکہ اونچے درجہ کا صحافی و دانشور یا مذہبی ہو) وہ بھی خدا تعالیٰ کا ترجمان علامہ القرآن ہو سکتا ہے اسکے لئے کوئی قید و شرط نہیں ہے۔

آخر ایسا کیوں ہے اور یہ دو مختلف معیار کیسے ہیں؟ اور کیا واقعتاً بھی ایسا ہی ہے یا یہ کہ تفسیر قرآن اور مفسر قرآن کیلئے کچھ قیود و شرائط مقرر ہیں مگر علامہ انہیں نظر انداز فرما رہے

ہیں! اسکا جواب یہ ہے کہ حضرات علماء تفسیر نے اصول تفسیر اور تفسیر کی کتابوں میں مفسر کے آداب و شرائط لکھے ہیں اور تفسیر لکھنے والوں کیلئے انکی واقفیت اور پابندی ضروری قرار دی ہے

محقق اور معتمد علمائے کرام نے قرآن مجید کی ترجمہ و تفسیر کے وقت ان شرائط کو ملحوظ رکھا ہے۔ باقی پروفیسر ٹاپ کے مفسرین جو کتب تفسیر و حدیث کے قدیم ذخیروں کو سوختنی و قلم زدنی سمجھتے ہوں اور خود انکی اپنی سمجھ شریف میں جو مطلب آجائے اسی کو قرآن شریف کی اصل ترجمانی سمجھتے ہوں تو ایسے لوگ علمائے حق کے نزدیک ضلوا و اضلوا کا صحیح مصداق ہیں۔

## مفسر ہونے کے لئے کیا باتیں ضروری ہیں؟

حضرات علماء تفسیر نے اصول تفسیر کی کتابوں میں اور بعض مفسرین نے اپنی کتب تفسیر میں اس موضوع پر تفصیلی کلام فرمایا ہے اس موقع پر ہم علامہ جلال الدین سیوطی علیہ الرحمہ کی مشہور کتاب الاتقان فی علوم القرآن سے مفسر کے آداب و شروط نقل کرتے ہیں ( واضح رہے کہ راقم السطور نے نقل کلام میں ترجمہ لفظی کے بجائے آزاد ترجمانی بلکہ تلخیص کا انداز اختیار کیا ہے تفصیلی ترجمہ میں غیر ضروری تطویل ہو جاتی)۔

علامہ سیوطیؒ فرماتے ہیں :-

”قرآن مجید کی تفسیر لکھنا صرف اس شخص کیلئے جائز ہے جو ان تمام علوم میں اعلیٰ دستگاہ رکھتا ہو جنکی ضرورت ہر مفسر کو پڑتی ہے اور جنکا وہ محتاج ہوتا ہے اور ایسے علوم پندرہ ہیں جنکی فہرست نمبر وار درج ذیل ہے۔“ (ملاحظہ ہو اتقان ازفتاۃ)

(۱) عربی لغت: (عربی زبان و ادب) سے پوری واقفیت ضروری ہے۔ حضرت مجاہد فرماتے ہیں کہ کسی ایسے شخص کیلئے جو خدا تعالیٰ اور روز قیامت پر ایمان رکھتا ہو یہ بات حلال نہیں کہ وہ کتاب اللہ کے سلسلہ میں کچھ بات بھی کرے جب تک وہ لغات عربی کا پورا عالم نہ ہو (جب بات کرنے کی اجازت نہیں تو تفسیر کھنا کیسے جائز ہوگا)۔

امام بیہقی شعب الایمان میں حضرت امام مالک علیہ الرحمہ سے نقل فرماتے ہیں کہ اگر میرے سامنے کوئی شخص لایا جائے جو لغات عربی (عربی زبان و ادب) کا پورا علم نہ رکھتے ہوئے کتاب اللہ کی تفسیر کرتا ہو تو میں اسکو سزا دی دوں گا۔

(۲) علم نحو (عربی قواعد کا ایک حصہ جس میں جملہ کی ترکیب و ساخت سے متعلق قواعد بتائے گئے ہیں) سے بھی واقفیت مفسر کے لئے ضروری ہے ورنہ اعراب کی غلطی سے کلام اللہ کے معنی متعین کرنے میں بھی غلطی واقع ہو جائیگی۔

(۳) علم صرف (عربی قواعد کا ایک دوسرا حصہ جس میں افعال کے صیغے اور ان کے اوزان وغیرہ بحث ہوتی ہے) سے بھی واقفیت ضروری ہے۔ ابن فارسی کہتے ہیں کہ "جس شخص کو علم صرف نہ آیا اسے علم کا ایک بڑا حصہ نہ آیا۔"

(۴) علم اشتقاق (علم صرف کا ایک شعبہ ہے جس میں یہ بحث ہوتی ہے کہ کونسا لفظ کس مادہ سے مشتق ہے) جاننا بھی ضروری ہے بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کوئی لفظ دو مادوں سے مشتق ہوتا ہے اور ہر مادہ کے لحاظ سے اس کے ہر دو معنی میں بڑا فرق ہو جاتا ہے لہذا مفسر اگر علم اشتقاق سے ناواقف ہوگا تو غلطی کر جائیگا (خاصکے پروفیسر ٹامپ مفسر کیونکہ وہاں یہ علوم بار نہیں پاتے) مثلاً "مسح" کا لفظ ہے مفسر کو اسکی تعیین کرنی ہوگی کہ یہ "مسح" سے مشتق ہے (م حروف اصلیہ میں داخل ہے) یا

• سیاحت، شق ہے (میم زائد ہے)

(۵-۶-۷) علم معانی و بیان اور علم بدیع (کہ علم معانی سے ترکیب کلام کی خصوصیات معلوم ہوتی ہیں اور علم بیان سے کلام کے معانی کی وضاحت وغیرہ معلوم ہو جاتی ہے اور علم بدیع سے کلام کی تقطی و معنوی صنعتیں معلوم ہوتی ہیں اور یہ تینوں علم بلاغت کہلاتے ہیں جو تفسیر کلام اللہ کے سلسلے میں عظیم الشان رکن کی حیثیت رکھتے ہیں) مفسر کیلئے ان علوم میں بھی مہارت ضروری ہے۔

(۸) علم قراءۃ کا جاننا بھی مفسر کیلئے ضروری ہے کیونکہ اسکی وجہ سے الفاظ قرآن کا صحیح تلفظ معلوم ہو جاتا ہے اور بعض قراءتیں دوسری قراءتوں سے بہتر ہوتی ہیں جن سے معنی مرادی کی تعیین میں مدد ملتی ہے۔

(۹) علم اصول دین (علم عقائد) سے بھی واقفیت ضروری ہے کیونکہ قرآن میں بعض آیات ایسی ہیں جنہیں اگر انکے ظاہری معنی پر رکھا جائے تو اسکا اطلاق اللہ تعالیٰ کیلئے ناجائز و ناروا ہو جاتا ہے لہذا ایسی آیتوں کی تاویل کرنا اور انکے مناسب معنی متعین کرنا ضروری ہے۔ اس مقصد کیلئے علم عقائد کی واقفیت ضروری ہے۔

(۱۰) علم اصول فقہ کی واقفیت بھی ضروری ہے کیونکہ اسی علم کی بدولت شرعی احکام کے استنباط و استدلال کا طریقہ معلوم ہوتا ہے۔

(۱۱) علم اسباب نزول یعنی آیات قرآنی کا پس منظر معلوم ہونا اور ان حالات و معاملات پر نظر رکھنا بھی ضروری ہے جن میں وہ آیات متعلقہ نازل ہوئی ہوں۔

(۱۲) علم ناسخ و منسوخ تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ کونسی آیت پر عمل منسوخ ہو گیا ہے اور کونسی آیات اسوقت بھی محکم اور واجب العمل ہیں۔

(۱۳) علم فقہ (علم مسائل و احکام) سے واقفیت بھی ضروری ہے۔

(۱۴) علم حدیث سے بھی واقفیت ضروری ہے۔ اس کے ذریعہ محمل و مبہم آیات کی تفصیل و تعیین ہو جاتی ہے۔

(۱۵) علم موہبت و علم لدنی مفسر کو اس سے بھی بہرہ ور ہونا چاہیے اور یہ وہ علم ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے فضل خاص سے ان علماء کو مرحمت فرماتے ہیں جو اپنے علم پر عمل بھی کرتے ہوں جبکہ طرف حدیث شریف میں اشارہ موجود ہے کہ جو شخص اپنے علم پر عمل بھی کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے ایسے علوم کا وارث بنا دیتے ہیں جن کا علم اس کو نہیں ہوتا۔

## شاید آپ کو یہ بات مشکل نظر آئے

علامہ سیوطی علیہ الرحمہ ان پندرہ علوم سے واقفیت شرط قرار دینے کے بعد خود ہی ایک انکال پیش کر کے اس کا جواب بھی مرحمت فرما دیتے ہیں جس کا حاصل یہ ہے کہ ”علم وہی“ اور ”علم لدنی“ کا حصول اپنے اختیار و قدرت میں تو ہے نہیں ایسی صورت میں مفسر کیلئے علم وہی کا حصول بھی شرط قرار دینا کوئی معقول بات نہیں ہے لہذا اس کو شرط قرار نہ دینا چاہیے تھا، جواب یہ ہے کہ بظاہر تو یہ بات مشکل ہی نظر آتی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ علم وہی اور علم لدنی بظاہر تو غیر اختیاری ہی ہیں لیکن یہ اس طرح اختیاری بھی ہو سکتے ہیں کہ علم صالح اور زہد و تقویٰ کے ذریعہ وہ صلاحیت حاصل کی جاسکتی ہے جسکی بدولت علم وہی اور علم لدنی کی دولت عطا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ علامہ زکشی ”البرہان للناظر فی القرآن“ میں فرماتے ہیں :-

”کسی ناظر قرآن کو معانی وحی و مطالب قرآن مجید کا فہم صحیح اس وقت تک حاصل

ہی نہیں ہوتا اور نہ ہی اسکے اصرار و مزہمی اس پر منکشف ہوتے ہیں جس کے دل میں منہ

ذیل باتوں میں سے کوئی بات موجود ہو۔

(الف) وہ کسی فکری و خیالی یا عملی بدعت میں مبتلا ہو

(ب) وہ جذبہ کبر و احساس انا کا مریض ہو۔

(ج) وہ خواہش نفس کی پیروی میں مبتلا ہو۔

(د) وہ حُب دنیا کا شکار ہو۔

(ه) وہ کسی معصیت کا اصرار کے ساتھ مرتکب ہو۔

(و) اسکا اصل ایمان ہی ضعیف و کمزور اور غیر تحقیقی ہو۔

(ز) اسکی تحقیق ہی میں ضعف و غامی پائی جاتی ہو۔

(ح) وہ کسی ایسے مفسر کے اقوال پر اعتما و رکھتا ہو جو تفسیر کے صحیح علم سے تہی دست ہو

یا ایسی تفسیر کرتا ہو جو صرف عقل پر مبنی ہو نقل کی تائید حاصل نہ ہو (اتقان ج ۲)۔

علامہ زکشیؒ کا مندرجہ بالا قول نقل کرنے کے بعد خود علامہ سیوطیؒ ارشاد فرماتے

ہیں :-

یہ مفسرین قرآن مجید کی اس آیت سے بھلی بطور تائید لیا جاسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ

ارشاد فرماتے ہیں سَاَصْرِفْ عَنْ اٰیٰتِنَا الَّذِیْنَ یَتَّكِبُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ

(میں اپنی آیات سے ان لوگوں (کے دلوں) کو پھیر کر دو رہی رکھوں گا جو زمین میں ناحق

تکبر و غرور کرتے ہیں)۔ یہ آیت تشریف اگرچہ کفار و معاندین کے حق میں ہے لیکن ایسے لوگ

اسکا مصداق قرار دیئے جاسکتے ہیں جو اپنے احساس "انا" اور جذبہ کبر و عجب کی بنا پر سلف

کو نظر انداز کرتے اور براہ راست قرآن فہمی کیلئے سرگرواں ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان پر



فہم قرآن کے راستے نہیں کھولتے۔

## تفسیر نویسی کیلئے صحیح طریق

علامہ سیوطی علیہ الرحمہ اسی اتقان میں ارشاد فرماتے ہیں :-

”علماء تفسیر فرماتے ہیں کہ جو شخص قرآن مجید کی تفسیر کرنا چاہے تو اس سلسلہ میں وہ سب سے پہلے قرآن مجید ہی کی طرف رجوع کرے اور اسی کی مدد سے تفسیر کرے کیونکہ بااوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی بات جو قرآن مجید میں ایک جگہ مجمل و مبہم ذکر کی گئی ہے دوسری جگہ وہی بات مزید تفصیل سے بیان کر دی گئی ہے اور اگر وہ صرف تفسیر بالقرآن سے کام نہ چلا سکے تو کتاب اللہ کی تفسیر حدیث و سنت سے کرنے کی کوشش کرے۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں اَلَا اِنِّیْٓ اُوتِیْتُ الْقُرْآنَ وَ مِثْلَهُ مَعَهُ (غور سے یہ بات سن لو کہ مجھے قرآن دیا گیا ہے اور اسکے ساتھ اتنا ہی ذخیرہ اور دیا گیا ہے) پھر اگر سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی تفسیر کیلئے کافی نہ ہو تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اقوال کی طرف رجوع کرے کہ وہ حضرات قرآن مجید کے معانی و مطالب سے زیادہ باخبر ہیں کیونکہ ان حضرات نے نزول قرآن کے وقت جو حالات و پیش تھے انکا بذات خود مشاہدہ کیا تھا اور اسلئے رکھی کہ وہ حضرات فہم کامل اور علم صحیح اور عمل صالح کے خصوصی طور پر جامع تھے چنانچہ محدث حاکم نے اپنی مستدرک میں یہ روایت نقل کی ہے کہ ایسے صحابی کی تفسیر جو نزول قرآن کے وقت موجود رہے ہو اور وحی انکی موجودگی میں نازل ہوئی ہو وہ تفسیرات بھی حدیث مرفوعہ کے حکم میں ہیں علامہ ابن جریر طبری نے اپنی تفسیر کے شروع میں مفسر کے آداب تحریر فرمائے

میں جنہیں ہم علامہ سیوطیؒ کی اتقان سے بطور تلخیص و اختصار یہاں نقل کرتے ہیں۔  
فرماتے ہیں :-

## آداب مفسر پر گفتگو، یعنی مفسر کو کیا ہونا چاہیے؟

معلوم ہونا چاہیے کہ مفسر کیلئے سب سے ضروری شرط یہ ہے کہ :-

(۱) اس کے عقائد درست ہوں (عقیدہ اہل سنت و الجماعت کے مطابق عقیدہ رکھتا ہو۔

(۲) وہ دین کے مقررہ طریقہ کا پابند ہو کیونکہ جو شخص اپنے دینی معاملہ میں مستہم اور ناقابل اعتبار ہوتا ہے تو ایسے شخص پر تو دنیاوی معاملات میں اطمینان و اعتماد اور بھروسہ نہیں کیا جاتا تو پھر کسی دینی معاملہ میں اس پر کیسے اطمینان و اعتماد کیا جاسکتا ہے؟

کسی دینی معاملہ میں اگر ایسا شخص کسی دوسرے عالم ہی کی طرف سے کوئی خبر دیتا ہو تو اس پر وثوق نہیں کیا جاسکتا تو ایسی صورت میں جبکہ وہ اللہ تعالیٰ کے رموز و امرا کی خبر دے رہا ہو اور کلام اللہ کی مراد متعین کر رہا ہو کس طرح ایسے شخص پر اعتماد و یقین کیا جاسکے گا۔

علاوہ ازیں ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ایسا شخص جو کسی قسم کی بے دینی اور بے راہروی سے مستہم اور بدنام ہو تو ایسے شخص کے سلسلہ میں اس اندیشہ و خطرہ سے اطمینان کی صورت کیا ہوگی کہ وہ شخص اپنی تفسیر کے ذریعہ لوگوں کو دینی آزمائش میں مبتلا کر رہا ہو اور اپنی ”پمفریبی“ اور ”کج بخشی“ سے لوگوں کو دھوکہ میں ڈال رہا ہو جیسا کہ فرقہ باطنیہ اور فرقہ رافضیہ کے تفسیر نگاروں نے پہلے زمانے میں کیا ہے اور علامہ مودودی نے بھی یہی خدمت اس

زمانہ میں انجام دینی چاہی ہے۔

اور اگر یہ مفسر قرآن خواہش نفس کی پیروی کا شکار ہوگا تو اسکی تفسیر میں خطرہ بھی رہے گا کہ اسکا جذبہ اتباع ہوئی (پیروی خواہش نفس) اسکو اس بات پر آمادہ و تیار کرتا رہے گا کہ موقع بموقع قرآن مجید کو اپنی بدعات اور محدث و خود تراشیدہ افکار و نظریات کی تائید میں پیش کر کے اپنے نظریہ و تحریک کی ترویج و اشاعت میں استعمال کرتا رہے گا جیسا کہ فرقہ قدریہ کے لوگوں نے پہلے کیا ہے۔ یہ لوگ تفسیر میں کتابیں لکھتے تھے جس انکا مقصد ہرگز ہرگز قرآن مجید کیلئے فہم و تدبر کی راہیں کھولنا نہ ہوتا تھا بلکہ انکا مقصد مدعا صرف یہ ہوتا تھا کہ وہ بالکل خاموش طور پر اپنی تفسیر و ترجمانی کے ذریعہ لوگوں کو پیروی سلف اور طریقہ ہدایت سے روک کر اس سے دور کر دیں۔

(۲) تیسری شرط مفسر کیلئے یہ ہے کہ وہ اپنی تفسیر میں قصور پر نور صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعین عظامؓ کی تفسیرات و تشریحات پر اعتماد رکھے ان سے ہی استفادہ کرے۔ محدث افکار و نظریات سے علیحدہ و کنارہ کش رہے پھر تفسیری منقول روایات اگر مختلف ہوں اور انہیں باہم جمع و تطبیق ممکن ہو تو جمع و تطبیق ہی سے کام لے کر کسی جامع مفہوم سے تفسیر کر لے اور اگر چاہے تو ان مختلف تفسیری اقوال میں سے کسی ایک ہی کو اختیار کر سکتا ہے۔

(۴) چوتھی شرط مفسر کیلئے یہ ہے کہ مفسر کا مقصد کلی اپنی تفسیر نگاری سے صحیح ہونا چاہئے کہ مفسر اپنی کوشش میں کامیاب اور صحیح معنی میں راہ یاب بھی ہو سکے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (اور جن لوگوں نے ہمارے لئے محنت و مشقت جمیلی ہم ان پر اپنی راہیں کھول دیتے ہیں)

اور یہ بات کہ انسان صرف وجہ اندری کوئی کام کرے تو یہ صرف اسی وقت  
 ممکن ہو سکتا ہے جب انسان دنیا طلبی سے خالی ہو کیونکہ جس شخص میں غلو و لہیت  
 کی جگہ خود غرضی یا شہرت طلبی وغیرہ کا جذبہ موجود ہوتا ہے تو اسکے متعلق یہ اندیشہ رہتا  
 کہ ایسے کاموں میں درپردہ کوئی ایسی غرض نہ ہو جو اسے صحیح راہ سے دور کر دے  
 (اتقان ص ۱۷۷ و ص ۱۷۸ مختصر)

## تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی ہے

علامہ سیوطی کی کتاب اتقان سے جو اقتباسات اوپر پیش کئے گئے ہیں  
 ان پر غور فرمایا جائے تو بڑی آسانی سے یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ تاریخ اپنے  
 آپ کو دہرا رہی ہے اور علامہ مودودی نے قرآن فہمی اور تدریجہ قرآن کی راہیں کھولنے  
 کے نام پر تفہیم القرآن میں جو آزاد ترجمانی اور تفسیر نگاری فرمائی ہے وہ تاریخ اسلام  
 میں کوئی نئی بات نہیں ہے اس پہلے ان کے بہت سے پیش رو بھی اسی طرح تشنگی  
 بجھانے کی خدمات انجام دے چکے ہیں

## روش مفسرین کے برعکس علامہ کا توسع

قرآن فہمی اور تفسیر نگاری کے سلسلے میں علامہ کے مقرر فرمائے ہوئے دو معیار  
 جو اوپر پیش کئے جا چکے ہیں انکی معقولیت مزید آشکارا و آشکارا کرنے کیلئے "اتقان سیوطی"  
 کے مندرجہ بالا طویل اقتباسات پیش کرنے ضروری سمجھے گئے کہ حضرات ناظرین انکی روشنی  
 میں کھلی آنکھوں ملاحظہ فرمائیں کہ حضرات مفسرین نے تفسیر نگاری کیلئے کیسی کیسی قیدیں اور  
 شرطیں تحریر فرمائی ہیں اور انکی روش کے بالکل برعکس علامہ نے کیسی فراخ دلی اور توسع

کام لیتے ہوئے تفسیر نگاری کا حق اسکے برعکس متحققین علمائے راسخین سے چھین کر کالج کے پروفیسروں، صحافیوں اور انشا پردازوں کو مرحمت فرما دیا ہے اور پروفیسر بھی ایسا جسے نصاب قدیم کی ہوا بھی نہ لگی ہو جیسا کہ تنقیحات کے حوالہ سے اوپر نقل کیا گیا کہ موصوف فرماتے ہیں کہ

”قرآن کیلئے کسی تفسیر کی (چاہے وہ علامہ کی تفہیم القرآن ہی کیوں نہ ہو) حاجت نہیں، ایک اعلیٰ درجہ کا پروفیسر کافی ہے۔ افسوس کہ علامہ کے نزدیک طبقہ علماء میں کوئی بھی لائق اعتنا اور قابل توجہ نظر نہ آسکا۔ جس نے قرآن کا بنظر غائر مطالعہ کیا ہو اور جو طرز جدید پر قرآن پڑھانے اور سمجھانے کی اہلیت رکھتا ہو وہ اپنے ”پچروں“ سے انٹرمیڈیٹ میں طلباء کے اندر قرآن فہمی کی ضروری استعداد پیدا کر دیگا۔“

(تنقیحات ص ۲۱۲)

اسی تنقیحات میں ————— ایک دوسرے مقام پر یوں بھی ارشاد فرما چکے ہیں :-

”قرآن و سنت رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تعلیم سب پر مقدم ہے مگر تفسیر و حدیث کے پُرانے ذخیروں سے نہیں“ (تنقیحات ص ۱۲۶)

علامہ کا کمال و وراندیشی

اقتباس بالا میں علامہ نے نہایت ہی ہوشمندی و وراندیشی سے کام لیتے ہوئے تفسیر و حدیث کے پُرانے ذخیروں ”کا فقرہ استعمال فرمایا ہے جو بیدہم ہے کسی کیلئے یقیناً مشکل ہے کہ علامہ کے نزدیک اس پُرانے ذخیرہ کا مصداق کونسی کتابیں ہیں؟

علامہ موصوف نے اپنی تفہیم نگاری میں جن کتب تفسیر سے استفادہ فرمایا ہے وہ اس پرانے ذخیرہ کے زیور کرام میں آتی ہیں یا نہیں؟ یا پھر یہ سمجھا جائے کہ موصوف نے اپنی تفہیم میں پرانے ذخیرہ سے مطلق استفادہ نہیں فرمایا اور انکی تفہیم مکمل طور پر انکی "خود فہمی" کا نتیجہ ہے۔

## ناظرین کرام توجہ فرمائیں!

تنقیحات کی عبارت مندرجہ بالا بغور ملاحظہ فرمانے کی ضرورت ہے کہ علامہ نے کس صفائی سے تفسیر و حدیث کے تمام ہی پرانے ذخیروں کو دریا برد کر دینے کا مشورہ مرحمت فرمایا ہے اور تفسیر و حدیث کی جملہ کتب کو "بیک قلم" ناقابل اعتبار قرار دیدیا ہے۔

یہ عبارت کیسی سخت اور یہ انداز تحریر کس قدر غیر محتاط ہے کہ غیر معتبر اور غیر مستند کتابوں کے ساتھ ساتھ معتبر و مستند ذخیرہ کتب کو بھی اپنے اشیب قلم کی جولانی میں گھائل کر کے پٹلے گئے! عجب۔

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں

معتقد ہے کہ مارکیٹ میں صرف "تفہیم القرآن" ہی چل سکے اور مفسرین کرام کے "درس تفسیر" کے بجائے سود و سودی پرونیروں کے "تفسیری پکڑی چلیں۔

## تفہیم القرآن کیسے وجود میں آئی

اب کئی خیال ہے جو علامہ سے یہ دریافت کر سکے کہ جناب والا جب



تفسیر وحدیث کے پرانے ذخیرے یکسر ناقابل استفادہ اور نالائق اعتبار میں تو آپ کی یہ تفہیم القرآن کیسے وجود میں آئی؟ آپ نے بھی تو شاید تفسیر کے پرانے ذخیروں ہی سے خوشہ چینی فرمائی ہوگی؟ یا پھر آپ کی یہ تفہیم القرآن آپ کی طبعزاد تفسیر اور تفسیر بالرائے ہے؟ ہمارا حق ظن ہمیں اجازت نہیں دیتا کہ ہم یہ سمجھیں کہ تفسیر بالرائے سے ممانعت پر مشتمل احادیث کو نظر انداز فرماتے ہوئے علامہ نے اسکی جرات فرمائی ہوگی اور ایسی سخت وعیدوں سے صرف نظر فرمایا ہوگا۔ حدیث شریف میں ارشاد فرمایا گیا ہے (۱) مَنْ قَالَ فِي الْقُرْآنِ بَرَأْيَهُ فَلْيَتَّبِعُوا مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ (مشکوٰۃ شریف) (جس نے قرآن شریف کا مطلب صرف اپنی رائے سے بیان متعین کیا وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنائے) (۲) مَنْ قَالَ فِي الْقُرْآنِ بَرَأْيَهُ فَقَدْ أَصَابَ فَقَدْ أَخْطَأَ (مشکوٰۃ شریف) جس نے قرآن مجید کی تفسیر میں اپنی رائے سے کچھ کہا اور وہ صحیح بھی کہا پھر بھی اس نے غلط کام کیا، مطلب یہی ہے کہ اپنی رائے سے تفسیر کرنے پر صحیح مطلب تک رسائی پانے والے کو بھی خطا کا رمی کہا جائے گا۔ ان احادیث کے پیش نظر علامہ کی یہ طبعزاد تفہیم انھیں کس صفت میں کھڑا کر رہی ہے اسکا فیصلہ حضرات ناظرین خود ہی فرمائیں تو بہتر ہوگا لیکن فیصلہ سے پہلے یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ علامہ موصوف احادیث شریف سے متعلق بھی ایک خاص ذہن رکھتے ہیں ہو سکتا ہے کہ ہم آپ تو کسی حدیث کو اسکی سند کے اعتبار سے بہت مستند اور قابل یقین و عمل سمجھتے ہوں لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ علامہ بھی اسکو ایسا ہی سمجھ لیں، کیونکہ موصوف روح دین و مذہب تک اپنی رسائی اور بنوت و رسالت کی مزاج شناسی کے باعث اس مقام بلند تک پہنچ چکے ہیں جہاں پہنچ جانے کے بعد انسان اسناد کا زیادہ محتاج نہیں رہتا۔۔۔۔۔ اور بباوقات

وہ غیر معلل غیر شاذ متصل السند مقبول حدیث سے بھی اعراض کر جاتا ہے (ملاحظہ ہو تفہیمات حصہ اول ص ۳۶۲)۔

## چوں بخلوت می روند

اور اگر علامہ نے اپنی تفہیم میں تفسیر بالرائے اور طبع زاد مطلب سے کام نہیں لیا بلکہ انھیں پرانے ذخیروں سے استفادہ فرمایا ہے جنکے متعلق "منبر کی جلوہ فرما" کے وقت دوسروں کو ممانعت فرمادی تو یہ بات بھی اعراض سے کب خالی ہے؟

## از راہ کرم ہمیں بتایا جائے

یہ کہاں تک مناسب ہے کہ علامہ موصوف ایک طرف تو برسر منبر جلوہ فرما کر تفسیر و حدیث کے پرانے ذخیروں کو شجر ممنوعہ قرار دیدیں اور دوسروں کو ان سے پرہیز کی تلقین کریں اور دوسری طرف بخلوت میں جب "تفہیم القرآن" لکھنے کی نوبت آئے تو فوراً اسی شجر ممنوعہ کے پھل کھائیں اور انھیں پرانے ذخیروں سے "خوشہ چھپتی" کہتے ہوئے اپنے ناظرین کیلئے مضامین نو کے انبار بکلی لگا دیں اور انھیں یہ تاثر دینے کی کوشش جاری رکھیں کہ تفہیم القرآن میں جو حقائق و وقایع پیش فرمائے گئے ہیں اور کلام الہی کے جن اسرار و رموز سے پردہ اٹھایا گیا ہے وہ سب علامہ کی جوہر طبعی اور ذکاوت عقلی کا نتیجہ ہے۔

## اگر کسر شان نہ ہو

علامہ اگر اپنی شان کے خلاف تصور نہ فرمائیں تو آئندہ تفہیم کے اپڈیشن میں بھی

و صامت فرمادیں کہ انھوں نے اپنی تفہیم القرآن میں پرانے ذخیرہ تفسیر (تفسیر طبری  
تفسیر ابن عربی، تفسیر ابن کثیر اور زمخشری و ابوسلم اصفہانی کی تصنیفات نیز سید قطب کی  
فی ظلال القرآن) سے مطلق استفادہ نہیں فرمایا ہے اور قرآن مجید سے متعلق جغرافیائی  
معلومات میں علامہ سید سلیمان ندوی کی ارض القرآن یا تفسیر حقانی کی تحقیقات تفسیری  
سے بھی کوئی مدد نہیں لی ہے اور تفہیم القرآن کی ساری جغرافیائی تحقیقات ان کی  
ذاتی کاوش اور ہمد و جہد کا نتیجہ ہیں اور یہ ہمد و جہد بھی صرف تفسیر نویسی ہی کے لئے  
فرمائی گئی تھی سیر و سیاحت کا ذوق و شوق مطلق شامل نہ تھا جیسا کہ جماعت کے  
افراد اپنے حلقہ میں شہرت دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ علامہ نے ان مقامات  
پر تشریف لیا کر بذات خود وہ معلومات فراہم فرمائی ہیں جنکی واقفیت کسی درجہ میں  
بھی تفسیر کیلئے انھوں نے ضروری سمجھی ہے، چنانچہ تفہیم القرآن میں جن جن مقامات  
کا نقشہ اور جغرافیہ پیش کیا گیا ہے وہ سب موصوف کے ذاتی اور چشم دید مشاہدہ کا نتیجہ ہے

قرآن مجید کی اصل روح تفہیم القرآن میں نہیں ہے۔  
بلکہ قرآن اور صرف قرآن میں ہے۔

گزشتہ صفحات میں جہاں ہم نے مقدمہ تفہیم کے حصہ سے تیسرا اقتباس  
نقل کیا تھا وہاں ہم نے یہ وعدہ بھی کیا تھا کہ آئندہ ہم اس حقیقت پر بھی روشنی ڈالیں گے  
کہ قرآن مجید کی اصل روح ہدایت پذیری ہے جو خود قرآن مجید ہی میں موجود بھی ہے  
اور اگر خود انسان کی چشم بصیرت پر پردہ نہ پڑا ہو تو قرآن مجید کی کوئی تعلیم کسی حجاب یا  
پردہ میں مستور بھی نہیں ہے جیسا کہ علامہ کو غلط فہمی ہو گئی ہے چنانچہ وہ اپنی ایک دوسری

مشہور تصنیف میں تحریر فرماتے ہیں :-

”بعد کی صدیوں میں رفتہ رفتہ ان سب الفاظ (الہ - رب - دین عبادت) کے وہ اصلی معنی جو نزول قرآن کے وقت سمجھے جاتے تھے بدلتے چلے گئے یہاں تک کہ ہر ایک اپنی پوری وسعتوں سے ہٹ کر نہایت محدود بلکہ مبہم مفہومات کیلئے خاص ہو گیا (چند سطروں کے بعد) نتیجہ ہوا کہ قرآن کا اصل مدعا ہی سمجھنا لوگوں کے لئے مشکل ہو گیا۔“

(چند سطروں کے بعد غلط فہمی کے نتائج کے زیر عنوان فرماتے ہیں) ”پس یہ حقیقت ہے کہ محض ان چار بنیادی اصطلاحوں کے مفہوم پر پردہ پڑ جانے کی بدولت قرآن کی تین چوتھائی سے زیادہ تعلیم بلکہ اس کی حقیقی روح نگاہوں سے مستور ہو گئی“ (قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں) (۱۱۱)

## ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی

علامہ کے مندرجہ بالا ارشادات کو بار بار غور سے پڑھیے اور ذرا ٹھنڈے دل سے یہ سوچنے کی کوشش کیجئے کہ نزول قرآن کے بعد کی صدیوں سے لیکر اب تک کتنی مدت گزر گئی اس مدت میں جو امت قرآن مجید کی تین چوتھائی سے زیادہ تعلیم بلکہ اسکی حقیقی روح سے محروم رہی ہو اسکی سلامتی و ایمان اور درست اعمال کا کیا اطمینان ؟

علامہ نے ایسی ہی تعبیرات اپنے خطبات میں بھی اختیار فرمائی ہیں اور اپنے ذہن و فکر کے خلاف دوسروں کو غیر مسلم، غیر مؤمن اور کافر تک قرار دیدیا۔ ان تحریکات

کے خلاف جب مختلف حلقوں سے آوازیں اٹھائی گئیں تو صرف یہ فرما کر چھٹی پاگئے کہ وہ خطبات فتوے کی کتاب نہیں ہیں (یعنی ان میں صرف زور قلم کی نمائش فرمائی گئی ہے دین و مذہب اور فتوے کی اصطلاحات شرعی سے اسکا تعلق نہیں ہے) بہر حال اہم علامہ پر یہ الزام تو نہیں لگا سکتے کہ موصوف نے نزولِ قرآن کے بعد کی صدیوں میں آنے والے لوگوں کو قرآن مجید کی تین چوتھائی تعلیم سے غفلت و تجاہل کی بنیاد پر کافر ہی قرار دیدیا کیونکہ اگر ہم علامہ کی اس منطق کو جوں کا توں تسلیم کر لیں تو اس کے نتیجہ میں نہ صرف یہ کہ امت محمدیہ علی صاحبہا السلام کا طبقہ عوام ہی جاہل و کافر قرار پائے گا بلکہ نزولِ قرآن کے بعد کی صدیوں میں ہونے والے تمام علماء تفسیر قرآن مجید کی تین چوتھائی سے زیادہ تعلیمات سے غافل و جاہل ٹھہریں گے اسلئے ہم اتنی بات تو ضرور ہی سمجھنا چاہیں گے کہ علامہ کی اس نرالی منطق کے بعد ہمارے لئے اس بات کا اطمینان کیسے ہو کہ بعد کی صدیوں کے لوگ جنہیں تین چوتھائی سے زیادہ تعلیم مل سکے حقیقی روح پرور ہی نہ سکی وہ لوگ دنیا سے اپنا ایمان صحیح سلامت لے گئے!

### علامہ کے اس ارشاد پر مولانا ندوی کا تبصرہ ملاحظہ ہو

حضرت مولانا ابوالحسن علی صاحب ندوی دامت برکاتہم نے علامہ کے ان ارشادات پر نہایت متوازن و معتدل اور چچا تلا تبصرہ فرمایا ہے ملاحظہ ہو فرماتے ہیں:-

”اس (علامہ مودودی کی تحریر) سے ثابت ہوتا ہے کہ اس طویل

مدت میں یہ کتاب (قرآن مجید) غفلت و جہالت کی نذر رہی اسکے

حقائق کو سمجھا نہیں جاسکا اور نزولِ قرآن کے تھوڑی ہی مدت کے

بعد اس سے استفادہ کا سلسلہ منقطع ہو گیا (چند سطروں کے بعد)  
 خود دیکھو کاریہ انداز جسے "بعض مفکرین" اور "آثار پرواز" اختیار کر رہے  
 ہیں اس ابدی اور انقلاب آفریں صلاحیتوں اور کارناموں سے  
 بھرپور امت پر ایک طویل السعادہ فکری قحط اور ذہنی و عملی تعطل کا  
 الزام عائد کرتا ہے (چند سطروں بعد) یہ نتیجہ اگرچہ بیاوی النظر میں کچھ زیادہ  
 اہم اور سنگین نہ معلوم ہو لیکن اسکے اثرات ذہن و دماغ اور طرز فکر پر  
 بڑے گہرے اور دور رس ہیں اس سے امت کی گزشتہ تاریخ اور  
 مجتہدین، مصلحین و مجتہدین کے علمی اور علمی کارنامے بھی مشکوک کم قیمت  
 ہو جاتے ہیں (چند سطروں کے بعد) اس طرز تحقیق اور طرز کلام سے کتنی  
 طور پر نتیجہ بھی نکالا جاسکتا ہے کہ امت پر ایک ایسا طویل دور گزار ہے  
 جب وہ قرآن کے ایسے اہم بیاری اصطلاحات کے صحیح مفہوم اور مضامین  
 سے نا آشنا ہی ہے (منصب نبوت اور اسکے عالمی مقام کا بیان)

## عالمی سطح پر مولانا کی یہ شہادت بھی علامہ کے حالات نوٹ کر لی جائے

مولانا ندوی کے مندرجہ بالا تبصرہ میں یہ بات نوٹ کرنے کی ہے کہ مولانا ندوی  
 اس مقام پر علامہ کو نہ تو عالم و فاضل فرما رہے ہیں نہ محقق و محقق بلکہ دور حاضر کے بعض  
 مفکرین اور آثار پرواز کے خوشامیاقظ سے یاد فرما رہے ہیں اور پھر کس لطیف انداز میں  
 علامہ کو اس ابدی اور انقلاب آفریں صلاحیتوں اور کارناموں سے بھرپور امت کی



روشن و تابناک تاریخ سے نادانیت اور بے خبری بھی قرار دے رہے ہیں اور مجددین  
و مصلحین اور مجتہدین کے علمی و عملی کارناموں کے خلاف انکار و تشکیک کی نظام رازی  
کا ترکیب بھی گردان رہے ہیں

## مرض اصلی کی نشاندہی

حضرت مولانا ندوی کے مذکورہ تبصرے سے علامہ موصوف کے اس ”مرض“ کی  
کی نشاندہی بھی ہو جاتی ہے جس کی طرف راقم اسطور بھی پہلے اشارہ کر چکا ہے۔ سمجھ میں بات  
ہیں آتی کہ علامہ موصوف انکار و تقلید کے باوجود خدا جانے کس کی تقلید میں یا کھلے بے جا  
اور غلط طور پر اس خام خیالی میں مبتلا ہو گئے ہیں کہ ”ہمچوں میں دیگڑے نیست“  
یہی وجہ ہے کہ موصوف کو اپنی ان ”تراحت کاویوں“ کا بھی کچھ اندازہ نہیں تھا  
کہ انکے بے لگام اشتہاب قلم نے تاریخ اسلام کے کچھ کچھ کار گذاروں اور روشن  
ستاروں کو خاک میں ملا دیا ہے انھیں کوئی پرواہ نہیں کہ امت کی گزشتہ تاریخ انکے  
مجددین و مصلحین کے علمی یا عملی کارنامے اگر کم قیمت یا مشکوک ہوتے ہوں جو جاتیں ان کی  
بلا سے انھیں اس کا غم ہی کب ہے انکا آؤغین و عا“ یہی ہے کہ انکی ”اپنی امت سلا“  
گن گائے تو انھیں کے گائے۔ قصیدہ خوانی کرے تو انھیں کی کرے۔ کسی کو اور اسے  
تنقید ہمتی تصور کرے تو انھیں کو کرے۔

اب کون کہہ سکتا ہے کہ علامہ کو اپنے اس ”عیار“ کا یہ بانی تہمت نہیں ہوئی۔

## ایک خلش

علامہ کی قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں ”الکتاب کا سند“ ”الافتتاح“

اور اس پر مولانا ندوی کا معتدل و متوازن تبصرہ پیش ہو چکا ہے اس سلسلہ میں  
 راقم السطور کو بھی ایک غلطی کا اظہار کرنا ہے وہ یہ کہ جب بقول علامہ "بعد کی صدیوں  
 میں رفتہ رفتہ ان سب الفاظ کے وہ اصلی معنی جو نزول قرآن کے وقت سمجھے جاتے  
 تھے بدلتے چلے گئے یہاں تک کہ ہر ایک لفظ اپنی پوری وسعتوں سے ہٹ کر نہایت  
 محدود بلکہ مبہم مفہومات کیلئے خاص ہو گیا" یا "قرآن مجید کی ان چار بنیادی اصطلاحوں  
 کے مفہوم پر پردہ پڑ جانے کی بدولت قرآن کی تین چوتھائی سے زیادہ تعلیم بلکہ اسکی  
 حقیقی روح نگاہوں سے مستور ہو گئی"۔ ایسی صورت میں خود علامہ موصوف پر  
 ان بنیادی اصطلاحوں کا حقیقی مفہوم کہاں سے القاء ہوا؟ اور انکی حقیقی روح علامہ  
 کے روبرو کیسے بے نقاب ہو گئی؟ کاش علامہ اس سلسلہ میں اپنے ذریعہ علم پر  
 بھی کچھ روشنی ڈال دیتے تو ہم جیسے ناظرین و ناقدین کو کبھی کچھ اطمینان ہو جاتا۔

## رجوع الی المقصد

قرآن کی چار بنیادی اصطلاحوں کا تذکرہ اور اس پر حضرت مولانا ندوی کا  
 تبصرہ تو ضمناً آگیا تھا ورنہ اصل بحث تو مقدمہ تفہیم پر چل رہی تھی۔ مقدمہ تفہیم میں  
 علامہ کا سارا زور قلم صرف اس بات پر صرف ہو رہا ہے کہ لوگوں کی رسانی قرآن مجید  
 کی اصل روح (ہدایت پذیری) تک اسلئے نہیں ہو پا رہی ہے کہ انھیں اب تک  
 مقدمہ تفہیم کے ناظر مباحث پڑھنے کو نہ مل سکے تھے اور علامہ جیسا رئیس التحریر و امیر قلم  
 انشا پر واد ہمسر نہ ہو سکا تھا اور جبکہ علامہ نے مقدمہ تفہیم بھکے قرآن کی روح تک رسانی  
 آسان کر دی ہے تو لوگوں کو چاہیے کہ وہ بھی تفہیم تک پہنچنے کیلئے صرف انکی تفہیم کی مطالقہ

## خردہ گیری ہمارا مقصد نہیں ہے

ہمارا مقصد علامہ کی خردہ گیری ہرگز نہیں ہے لیکن اگر واقعہ یہی ہے کہ علامہ بیچ بچ کچھ اسی قسم کی خوش فہمی کا شکار ہو گئے ہیں تو ہمیں افسوس بھی ہے اور انکے ساتھ ہمدردی بھی۔

علامہ اور ان جیسے دوسروں کو یہ حقیقت اچھی طرح ذہن نشین کر لینے کی ضرورت ہے کہ قرآن مجید سے ہدایت پذیری اور اس کی "اصل روح" اور قہر مفہوم تک رسائی معاذ اللہ منہ کسی صحافی کے "زور قلم" اور کسی مفکر کی "صلابت" تفہیم پر ہرگز موقوف نہیں ہے۔

قرآن مجید کے فہم و تدبر کی راہیں اللہ کے بندوں پر ہمیشہ کھلی رہی ہیں اور اس سے ہدایت پذیری کے دروازے کسی دور میں بھی انسانوں پر بند نہیں ہوئے اصل کلام الہی ہوا یا اسکی شرح حدیث رسول ہو ان دونوں میں سے کسی پر بھی کوئی دور غفلت اور زمانہ فرت نہیں گزرا ہے۔

## قرآن مجید کس طرح دل کی گہرائیوں میں اترتا ہے

علامہ کی اس غلط فہمی کو دہکے نے کیلئے کہ "قرآن فہمی" انکی تفہیم پر موقوف نہیں ہے بلکہ قرآن مجید سے اثر انگیزی اور ہدایت پذیری کے واقعات تاریخ اسلام کے اوراق میں بکھرے پڑے ہیں جنہیں سے صرف چند واقعات اپنی بات کی تائید میں مختصر طور پر ہم یہاں نقل کرتے ہیں:-

## ۱۔ قرآن اور حضرت عمر فاروقؓ

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہاں تو مسلمان ہونے سے پہلے دین اسلام کے سخت مخالف تھے اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے جانی دشمن تھے اور معاذ اللہ آپ کے قتل ہی کیلئے جارہے تھے جب رات میں یہ خبر ملی کہ آپ کی بہن فاطمہ اور بہنوئی مسلمان ہو گئے ہیں تو انکے گھر کا رخ کر لیا اور وہاں پہنچ کر دونوں کو بری طرح مار پیٹا آخر سورہ طہ کی چند ابتدائی آیات جب پڑھنے میں آئیں تو دل کی کایا ہی پلٹ گئی اور فوراً ہی خدمت اقدس میں حاضر ہو کر مشرف بہ اسلام ہو گئے رضی اللہ تعالیٰ عنہما۔

## ۲۔ حضرت جبر بن مطعمؓ اور قرآن

حضرت جبر بن مطعم یوں تو طبعاً نیک مزاج اور سلیم الطبع شخص تھے لیکن مذہبی عصبیت "عصبیۃ جاہلیۃ" قبول حق اور قبول اسلام سے رکاوٹ بن رہی تھی جنگ بدر کے بعد اپنے کسی قیدی کو چھڑانے کیلئے مدینہ طیبہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے آپ نماز میں مشغول تھے اور سورہ طہ کی یہ آیات تلاوت فرما رہے تھے :-

(ترجمہ) "طور کی قسم اس کتاب کی قسم جو بھی ہوئی ہے اوراق میں اور آباد گھر چھت کی قسم اور ابلتے ہوئے دریاؤں کی قسم ؛ بیشک تمہارے رب کا عذاب آگے رہے گا اور اس وقت کوئی بھی نہ ٹال سکے گا۔"

حضرت جبریل بھی پاس کھڑے ہوئے تھے تھوڑی دیر میں انہیں کے کہنے کے مطابق، انہیں ایسا لگا جیسے انکا دل ہی پھٹ جائے گا اور جب آپ نے خط کشیدہ فقروں والی آیت پڑھی تو ان پر کپکپی طاری ہو گئی کہ کہیں اسی وقت تو اللہ کا وہ عذاب نازل نہ ہو جائے گا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آپ اسی وقت ایمان لے آئے رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ (قرآن نمبر سارہ ڈائجسٹ ص ۳۷)

(بخاری شریف کتاب التفسیر میں حضرت جبریل کے قبول اسلام کا واقعہ اس سے کچھ مختلف طور پر ذکر کیا گیا ہے اور سورہ طور کی دوسری آیات کو ان کے لئے تحریک اسلام کا ذریعہ بتایا ہے)۔

### ۳۔ حضرت عثمان بن مظعونؓ پر تاثیر قرآنی

حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ جب میں نے یہ آیتیں سنیں تو اسی وقت اسلام میرے دل میں گھر کر گیا وہ آیات سورہ نحل کی وہی مشہور آیات ہیں جو عام طور پر خطبہ جمعہ میں پڑھی جاتی ہیں ترجمہ یہ ہے :-

”خدا عدل و احسان اور قربت داروں کے ساتھ حسن سلوک

کا حکم فرماتا ہے اور بدکاری و برائی اور ظلم سے ممانعت فرماتا ہے

وہ اس لئے نصیحت کرتا ہے کہ شاید تم نصیحت مان لو“

یہ تین واقعات بطور نمونہ دور صحابہ سے متعلق پیش کر دیئے گئے بعد کے

زمانوں میں بھی قرآن مجید سے اثر پذیری کے واقعات بکثرت موجود ہیں جنہیں بوجہ

اختصار نظر انداز کیا جاتا ہے۔

تاریخ اسلام میں اس قسم کے کتنے ہی واقعات خود علامہ نے بھی ضرور پڑھے ہوں گے اسکے باوجود انکا اس غلط فہمی میں مبتلا ہونا موجب حیرت ہے کہ قرآن فہمی "مقدمہ تفہیم کے بغیر ممکن ہی نہیں" اسکا واحد نسخہ یہی مقدمہ ہے۔

## ہم دور نکلے جا رہے ہیں

بات چل رہی تھی علامہ کے مقدمہ تفہیم کی جس کے تین اقتباسات ناظرین کے ملاحظہ کیلئے لائے جا چکے ہیں اب مقدمہ تفہیم کا چوتھا اقتباس پیش کیا جا رہا ہے۔

علامہ اپنے "منصوبہ کار" کے مطابق اپنی تفہیم القرآن یا اصل قرآن ہی کیلئے مقدمہ کتاب کی ضرورت و اہمیت پر مزید روشنی ڈالتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:-

"قرآن (مجید) کس قسم کی کتاب ہے؟ اسکے نزول کی کیفیت"

اسکے "ترتیب کی نوعیت" کیا ہے؟ اسکی ساری بحث کس مدعا

کیلئے ہے؟ "کس مرکزی مضمون" کے ساتھ اسکے بے شمار

مختلف النوع مضامین وابستہ ہیں؟ کیا طرز استدلال اور کیا

طرز بیان اس نے اپنے مدعا کیلئے اختیار کیا ہے؟ یہ اور ایسے ہی

چند ضروری سوالات ہیں جنکا جواب صاف اور سیدھے طریقے سے

آدمی کو اگر ابتداء ہی میں مل جائے تو بہت سے خطرات سے بچ سکتا

ہے اور اسکے لئے فہم و تدبر کی راہیں کشادہ ہو سکتی ہیں۔ جو شخص قرآن

(مجید) میں تصنیفی ترتیب تلاش کرتا ہے اور وہاں اسے نہ پا کر کتاب



کتاب کے صفحات میں بھٹکنے لگتا ہے اسکی پریشانی کی اصل وجہ یہی ہے کہ وہ مطالعہ قرآن کے ان سارے مبادیات سے ناواقف ہے اور وہ یہ گمان کرتا ہے کہ وہ مذہب کے موضوع پر ایک کتاب پڑھنے چلا ہے (چند سطروں بعد) مگر جب وہاں اسے اپنے ”ذہنی تصویق“ سے بالکل ہی مختلف ایک چیز سے سابقہ پیش آتا ہے تو وہ اپنے آپ کو اس سے انوس نہیں کر سکتا اور سررشتہ مضمون ہاتھ نہ آنے کے باعث اسکے بین السطور یوں بھٹکنا شروع کر دیتا جیسے وہ ایک غیبی مسافر ہے جو کسی نئے شہر کی گلیوں میں کھو گیا ہے، (مقدمہ تفہیم ص ۱۶۱)

## کمال صحافت کی داد دیجئے

راقم السطور کی بے کیف تحریر سے بے مزہ ہو جانے کے بعد ناظرین کرام نے علامہ کے اس طویل اقتباس سے یقیناً خاطر خواہ لطف اٹھایا ہوگا۔ اور واقعہ بھی یہی ہے کہ علامہ نے اس موقع پر ”مقدمہ تفہیم“ کی ضرورت و افادیت ثابت کرنے میں بڑا زور قلم صرف فرمایا ہے۔ موصوف نے اس مقام پر بغیر مقدمہ تفہیم ”قرآن فہمی“ کے دشوار ہونے کی جو تصویر کشی فرمائی ہے سچ پوچھئے تو انھیں کا حق بھی ہے۔ ذرا غور فرمائیے تو اندازہ ہوگا کہ علامہ کا ”کمال صحافت“ اور ”جادوئے تحریر“ اس حد تک پہنچا ہوا ہے کہ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ اگر کسی نے ”مقدمہ تفہیم“ سے استفادہ کئے بغیر ہی قرآن مجید کو کسی طرح کچھ تھوڑا بہت اگر سمجھا بھی ہوگا تو مقدمہ تفہیم پڑھنے کے بعد کہیں اس کی نیت نہ خراب ہو جائے اور وہ بھی از سر نو ”قرآن فہمی“ کی ضرورت نہ محسوس کرنے لگے

کیونکہ یہ تمام شرائط و قیود اور "بنیادی مقدمات" اب تک اسے معلوم ہی نہ تھے اسے اندازہ ہی نہ تھا کہ "قرآن فہمی" کیلئے ناظر قرآن کو مبادی سے واقف ہونا بھی ضروری ہے بغیر ان کے وہ بہت سے خطرات میں بھی مبتلا ہو سکتا ہے۔

اب مقدمہ تفہیم پڑھکر اسے یہ معلوم ہو گا کہ "قرآن فہمی" کے لئے اس "مفتخراں" سے بھی گذرنا ضروری ہے تو اسے اپنی لاعلمی و بے خبری کا شدید احساس ہو گا جس کے نتیجہ میں اندیشہ یہ بھی ہے کہ اسکی آنی سمجھ بھی جاتی رہے اور اب تک قرآن مجید کو وہ جتنا کچھ سمجھ سکا تھا اس سے بھی اپنے آپ کو ناواقف و جاہل نہ سمجھنے لگے اور پھر فرط غم و شدت حسرت میں وہ کف افسوس لے اور کہنے لگے کہ افسوس ہے میری حالت پر کس طرح میں اب تک — قرآن مجید کو ایک مکمل کتاب سمجھتا رہا اور اس حقیقت ہی سے بے خبر رہا کہ اللہ تعالیٰ کی اس آخری کتاب میں "تصنیفی ترتیب" اور کتابی اسلوب" کی اتنی بڑی خامی موجود ہے؛ جسے علامہ نے اپنے مقدمہ تفہیم میں ظاہر فرمایا ہے۔ افسوس ہے میری حالت جو میں نے اب تک یہ نہ معلوم کیا کہ اسکا موضوع گفتگو کیا ہے؟ اسکا مدعا کیا ہے؟ یہ جانے بوجھے بغیر یوں ہی اسے سمجھنا شروع کر دیا اور اپنا مدعا اس سے حاصل کرنے لگا۔

کیسے خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو تفہیم القرآن کا مقدمہ لکھ جانے کے بعد ہی دنیا میں آئے کہ انھیں مطالعہ قرآن سے پہلے ہی تفہیم کے ذریعہ یہ حقیقت تو معلوم ہو گئی کہ قرآن مجید تصنیفی ترتیب اور کتابی اسلوب کے معیار پر پورا نہیں اترتا، یہ تو علامہ ہی کی ہمت تھی جنھوں نے مختلف ترکیبوں اور متعدد پینتروں سے قرآن مجید تصنیفی ترتیب اور کتابی اسلوب کو بہت تنقید بنانے کیلئے ایسا شاندار مقدمہ لکھ دیا

یہ دوسری بات ہے کہ موصوف نے پہلے قرآن مجید کی تصنیفی ترتیب و کتابی اسلوب کو ہفت تنقید بنایا اور بعد میں اسکا مادا و ابھی خود ہی پیش فرما کر اپنے کو معالج اور مصلح کلام اللہ کے روپ میں بھی پیش فرما دیا ہے جیسا کہ مصرع مشہور ہے۔  
تمہیں نے درود دیا ہے تمہیں درود دیتا

## اعتراض میں چل دی نہ فرمایے

راقم السطور کی سطور بالا پڑھ کر شاید بعض حضرات حیران ہوں اور میری اس تحریر کو میری آشفتہ بیانی پر محمول فرماتے ہوئے کوئی اعتراض فرمانا چاہیں اسلئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ میں پہلے ہی بات صاف کرتا چلوں کہ میرا یہ انداز تحریر جو ابھی سطور بالا میں آپ نے ملاحظہ فرمایا یہ میری آشفتہ بیانی اور "پیشانی نگاہی" کا نتیجہ ہرگز نہیں ہے بلکہ یہ دراصل علامہ کے مندرجہ بالا فقروں کا "عکس مستوی" ہے (عکس مستوی یہاں جواب ترکی بہ ترکی کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے منطقی اصطلاح مراد نہیں ہے)۔ علامہ نے مندرجہ اقتباس میں جو فقرے بطور تمثیل استعمال فرمائے ہیں میرا مقصد علامہ کی اس تمثیل کو اپنی اس تمثیل کے ذریعہ صرف ذہن نشین کرانا ہے اور بس کہ ہمارے ناظرین کو ابھی طرح معلوم ہو جائے کہ کس طرح کوئی شخص "سراشتہ مضمون" ہاتھ نہ آنے پر بین السطور یوں بھٹکنا شروع کر دیتا ہے جیسے وہ ایک اجنبی مسافر ہو جو کسی نئے شہر کی گلیوں میں کھو گیا ہے بالکل اسی طرح جس طرح یہ راقم السطور مقدمہ تفہیم کا بین السطور پڑھنے میں سرگرداں ہو رہا ہے اور جس طرح شاید آپ میں سے بھی بعض حضرات میری تحریر کا سراشتہ مضمون تلاش

کرنے میں میرے تبصرے کے بین السطور بھٹکنے لگ رہے ہوں گے مگر خیر مجھ کو تو  
مقدمہ تفہیم کا سرشتہ نگارش ہاتھ نہ لگ نہ سکا البتہ آپ حضرات کو افشار اللہ میرا  
”دعا کے گزارش“ ضرور معلوم ہو جائے گا۔

## گل دیگر شگفت — کتابی سانچہ

ہمارے علامہ نے مقدمہ تفہیم لکھنے کے لئے جب قلم اٹھایا تھا تو  
یہ بات دل میں ٹھان لی تھی کہ جس طرح بھی بنے گا وہ اپنے ناظرین کو اپنے اس  
مقدمہ کی ضرورت تسلیم کرا کے ہی دم لیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ موصوف نے اصل  
مقدمہ کے مباحث ثلاثہ (مبادی ثلاثہ) یعنی موضوع - مرکزہ مضمون اور مدعا کی  
تعیین و توضیح (مجلد ۲۸ صفحات) صرف ڈیڑھ دو صفحوں ہی میں فرمائی ہے (ملاحظہ  
ہوں صفحات ۱۹ و ۲۰) بقیہ تقریباً ۲۶ صفحات میں انکی ہر بات کی تان مقدمہ نگاری کی  
ضرورت ہی ثابت کرنے پر لڑتی ہے اور ان میں کھلی شروع کے چار پانچ صفحات  
(۱۲ لغایت ۱۶) تو صرف اسی مقصد کے لئے محفوظ ہیں ان میں بس یہی ثابت  
کیا گیا ہے کہ یہ قرآن مجید معاذا اللہ تعالیٰ منہ علامہ کی مروجہ تصنیفی ترتیب اور کتابی  
اسلوب کے معیار پر پورا نہیں اترتا ہے یہ تو ایک غیر مرتب و غیر مربوط اور منتشر شدہ  
کا مجموعہ ہے یہی وجہ ہے کہ قرآن فہمی کی راہیں لوگوں پر بند ہیں اور علامہ نے انہیں  
راہوں کو کھولنے کیلئے مقدمہ نگاری اور تفسیر نویسی کی یہ زحمت گوارا فرمائی ہے۔  
مقدمہ تفہیم کی اسی ضرورت کو مزید ثابت کرنے کے لئے علامہ اپنی  
ایک ہی بات کو معمولی و لفظی ”ہیر پھیر“ کے ساتھ دہرائے چلے جا رہے ہیں تصنیفی ترتیب

اور کتابی اسلوب کی تعبیریں تو بار بار پڑھ ہی چکے اور "انشر الفنی" سے علامہ کی واقفیت کا اندازہ لگا ہی چکے اب ایک نئی تعبیر کتابی سانچہ "بھی ملاحظہ ہو۔

"اس گم گشتگی سے وہ بچ جائے اگر اسے پہلے ہی بتا دیا جائے کہ

تم جس کتاب کو پڑھنے جا رہے ہو وہ تمام دنیا کے لڑتے ہیں اپنے طرز کی ایک ہی کتاب ہے۔ اسکی تصنیف دنیا کی ساری کتابوں سے مختلف ہو۔

پر ہوئی ہے۔ اپنے "موضوع" اور "مضمون" اور "ترتیب" کے لحاظ سے

بھی وہ ایک نرالی چیز ہے۔ لہذا تمہارے ذہن کا "کتابی سانچہ" جو

کی کتب بینی سے بنا ہے اس کتاب کے سمجھنے میں تمہاری مدد نہ کرے گا

بلکہ الٹا مزاحم ہوگا اسے سمجھنا چاہتے ہو تو اپنے پہلے سے قائم کئے

ہوئے قیاسات کو ذہن سے نکال کر اسکی عجیب خصوصیات سے

شناسائی حاصل کرو" (مقدمہ تفہیم ص ۱۶)

## پہیلی کا جواب آگے آرہا ہے

"تصنیفی ترتیب" "کتابی اسلوب" اور کتابی سانچہ یہ سارے ہی

الفاظ ایک سے ایک چیتاں اور پہیلی بنکر بار بار آ رہے ہیں مگر یہ کچھ پتہ نہیں چلتا کہ

کہ آخر علامہ کی ان سے مراد کیا ہے؟ تو اس پہیلی کا جواب آگے آرہا ہے یہاں پہلے

تو میں اپنی پھیلی بات کا اعادہ کرتا چلوں کہ علامہ کو قرآن فہمی کی "شاہ کلید"

(Master Key) سمجھنے میں غلطی ہو رہی ہے۔ چنانچہ موصوف قرآن فہمی کی

رکاوٹ کبھی تو اسکی غیر مرتب اور غیر مربوط ہونے کو قرار دیتے ہیں اور کبھی اسکی

”تصنیفی ترتیب“ اور ”کتابی اسلوب“ کو ”نا فہمی“ کی بنیاد قرار دیتے ہیں اور کہیں  
 فرط میرانی میں ناظر کے ”کتابی سانچہ“ کا اختلاف انہیں قرآن فہمی کی راہ میں رکاوٹ  
 بنا نظر آتا ہے۔ حالانکہ ہم سے پہلے دوسری آسمانی کتابوں کے اقتباسات پر مشتمل  
 ایک تقابلی نقشہ بھی پیش کر کے یہ دکھلا چکے ہیں کہ قرآن مجید اپنی تصنیفی ترتیب یا  
 کتابی اسلوب کے اعتبار سے کسی طرح بھی قابل اعتراض یا ایسا غریب و غیر مانوس  
 بھی ہرگز نہیں ہے کہ اسکی روح تک رسائی علامہ کے مقدمہ تفہیم کے بغیر ہو ہی نہ سکتی ہو  
 جیسا کہ علامہ اپنے مقدمہ اور دیباچہ میں ثابت کرنے کی کوشش فرماتے ہیں۔

## بنیادی غلطی کا سراغ مل ہی گیا

علامہ کے مندرجہ بالا شبہ پارہ تحریر میں یہ عجیب و غریب بات بھی علامہ کے  
 قلم سے بیاختہ نکل ہی گئی کہ تمھارے ذہن کا وہ ”کتابی سانچہ“ جو اب تک کی  
 کتب بینی سے بنا ہے اس کتاب (قرآن مجید) کے سمجھنے میں تمھاری مدد نہ کرے گا  
 بلکہ الٹا مزاحم ہوگا\*

کس قدر پر لطف بات ہے یہ جو علامہ اپنے ناظرین تفہیم ہی کو مخاطب فرما کر  
 ارشاد فرما رہے ہیں جنکا مطالعہ یقیناً علامہ کے مطالعہ سے بہت ہی کم ہوگا، تو سوال  
 یہ ہوتا ہے کہ جب عام ناظرین کا مطالعہ علامہ کی نظر میں ”قرآن فہمی“ کی راہ میں معاون  
 ہونے کے بجائے الٹا مزاحم ہو سکتا ہے تو ذرا غور فرمائیے کہ خود اس علامہ کیلئے ان کا  
 زبردست مطالعہ کس قدر مزاحم ہو رہا ہوگا؟

جب ایک عام ناظر علامہ اینڈ کمپنی کی چند کتابیں پڑھ لے تو اس کے



نتیجہ میں اسکے ذہن کا کتابی سا پنہ، قرآن فہمی کی بیکسر صلاحیت ہی کھو بیٹھی تو اندازہ کیجئے علامہ کے اس کتابی چوکھٹے کا جو اتنی بڑی تعداد میں کتابوں کے مطالعہ سے تیار ہوا ہوگا۔ آخر وہ کتابی چوکھٹا قرآن فہمی کی راہ میں کیسا کچھ مزاحم اور حائل ہو رہا ہوگا؟ مگر علامہ کو اپنی ہی اس منطق کے خلاف یہ زعم بھی ہے کہ قرآن فہمی کا جو حق وہ ادا کر رہے ہیں۔

حق تو یہ ہے کہ صرف ان کے سوا دوسروں سے یہ حق ادا نہ ہوا

## کوئی صاحب بھی برا نہ مائیں

سطور بالا میں جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس سے کسی کی تھمیل و تحقیق ہرگز مقصود نہیں ہے بلکہ یہ علامہ کی مندرجہ بالا تحریک بلکہ نگارش جمیل کا ایک حسین و دلچسپ نتیجہ ہے جسے راقم السطور نے جامہ الفاظ پہنا کر ناظرین کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ اس وضاحت و صفائی کے باوجود اگر کسی صاحب کو راقم السطور کی ان گذارشات میں کچھ تیزی یا فشریت محسوس ہوتی ہے تو وہ براہ کرم دیباچہ تفہیم ص ۷ لغایت ص ۱۱ کی وہ جراحات کاریاں دوبارہ ملاحظہ فرمائیں جن میں علامہ نے انتہائی معصومیت و سادگی کے ساتھ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب علیہ الرحمہ سے لیکر حافظ فتح محمد خاں صاحب تک کے تمام تراجم میں طرح طرح کے کپڑے نکالے ہیں۔ مختصر طور سے چند فقرے ملاحظہ فرمائے جائیں:-

تو اگر بھول گیا ہو تو پتہ بتلا دوں کبھی قرآن میں تیرے کوئی نچر بھلی تھا  
علامہ دیگر تراجم کا ذکر فرما کر ان میں خامی اور کسر کی نشاندہی فرماتے ہوئے

اپنے دیباچہ تفہیم میں یوں ارشاد فرماتے ہیں :-

(الف) اس (ترجمے کے) طریقے میں کسی پہلو نقص کے بھی ہیں جنکی وجہ سے

ایک غیر عربی داں ناظر قرآن مجید سے اچھی طرح مستفید

نہیں ہو سکتا (ص ۶۵ و ۶)

(ب) پہلی چیز جو ایک لفظی ترجمہ کو پڑھتے وقت محسوس ہوتی ہے

وہ "روانی عبارت" "زور بیان" "بلاغت زبان" اور "تاثیر کلام"

کا فقدان ہے۔ قرآن کی سطروں کے نیچے آدمی کو ایک ایسی "بے جان

عبارت" ملتی ہے جسے پڑھکر نہ اسکی روح و ہڈ میں آتی ہے نہ اسکے

رونگے ٹکڑے ہوتے ہیں نہ اسکی آنکھوں سے آنسو جاری ہوتے ہیں

نہ اسکے جذبات میں کوئی طوفان برپا ہوتا ہے نہ اسے یہ محسوس ہوتا ہے

کہ کوئی چیز عقل و فکر کو تسخیر کرتی ہوئی قلب و جگر تک اترتی چلی جا رہی

ہے۔ اس طرح کا کوئی تاثر و نما ہونا تو درکنار ترجمے کو پڑھتے وقت تو

بسا اوقات آدمی یہ سوچتا رہ جاتا ہے کہ کیا واقعی یہی وہ کتاب ہے

جسکی نظیر لانے کیلئے دنیا بھر کو چیلنج دیا گیا تھا؟

اسکی وجہ یہ ہے کہ لفظی ترجمہ کی پھلنی صرف دوا کے خشک اجزاء

ہی کو اپنے اندر سے گذرنے دیتی ہے۔ رہی ادب کی وہ تیز و تند

اسپرٹ جو قرآن کی اصل عبارت میں بھری ہوئی ہے اسکا کوئی حصہ

ترجمے میں شامل نہیں ہونے پاتا وہ اس پھلنی کے اوپر ہی اڑ جاتی ہے

(ص ۶۵ و ۶ تا ۱۵)

(ج) اسکا نقصان یہ ہے کہ ایک آدمی جس طرح دوسری کتابوں کو پڑھتا اور ان سے اثر قبول کرتا ہے اس طرح وہ ترجمہ قرآن کو نہ مسلسل پڑھ سکتا ہے اور نہ اس سے اثر قبول کر سکتا ہے کیونکہ بار بار ایک اجنبی زبان کی عبارت اسکے مطالعہ کی راہ میں حائل ہوتی رہتی ہے (ص ۱۲ تا ۱۴)

(د) ایک اور وجہ اور بڑی اہم وجہ لفظی ترجمے کے غیر موثر ہونے کی یہ ہے کہ قرآن کا طرز بیان تحریری نہیں بلکہ تقریری ہے اگر اس کو منتقل کرتے وقت تقریر کی زبان کو تحریر کی زبان میں منتقل نہ کیا جائے اور جوں کا توں اسکا ترجمہ کر ڈالا جائے (علامہ کے نزدیک دوسرے مترجمین اس غلطی و غفلت کا شکار ہو گئے ہونگے) تو ساری عبارت غیر مربوط ہو کر رہ جاتی ہے (ص ۱۲ تا ۱۴)

(۵) اپنے اس پس منظر اور اپنی شان نزول کے ساتھ قرآن کی ان صورتوں کا تعلق اتنا گہرا ہے کہ اگر اس سے الگ کر کے مجرد الفاظ کا ترجمہ آدمی کے سامنے رکھ دیا جائے تو بہت سی باتوں کو وہ قطعاً نہیں سمجھے گا اور بعض باتوں کو الٹا سمجھ جائے گا اور قرآن کا پورا مدعا تو شاید کہیں اسکی گرفت میں آئیگا ہی نہیں (ص ۹ سطر ۱۲ تا ۱۴)

(و) پھر ایک بات یہ بھی ہے کہ قرآن مجید اگرچہ عربی میں نازل ہوا ہے لیکن اسکے ساتھ وہ اپنی مخصوص اصطلاحی زبان رکھتا ہے (جسکی حقیقت صرف علامہ پر ہی منکشف ہوئی ہے۔ حضرت

شاہ ولی اللہ صاحب سے لیکر حافظ محمد غاں صاحب تک سب  
 ہی اس نکتہ نادرہ سے ناواقف رہے ہونگے) اس نے بکثرت  
 الفاظ کو اصل لغوی معنی سے ہٹا کر ایک خاص معنی میں استعمال کیا ہے  
 (جب ان الفاظ کے وہ معانی لغت سے ثابت بھی نہیں ہیں اور  
 علمائے تفسیر کو بھی وہ معانی معلوم نہیں ہو سکے تو حضرت علامہ پر  
 کس نے انکار کئے ہیں) اور بہت سے الفاظ ایسے ہیں جنکو مختلف  
 مفہومات میں استعمال کرتا ہے۔ پابندی لفظ کے ساتھ جو ترجمے کئے  
 جاتے ہیں ان میں اس اصطلاحی زبان کی رعایت ملحوظ رکھنا بہت  
 مشکل ہے۔ اور اس کے ملحوظ نہ رہنے سے بسا اوقات ناظرین طرح  
 طرح کی الجھنوں اور غلط فہمیوں میں مبتلا ہو جاتے (ص ۱۹۳)۔

## ہر صاحب ایمان والہ صاف فہم کر سکتا ہے

دیباچہ تفہیم کے یہ اقتباسات حضرت شاہ ولی اللہ صاحب شاہ عبدالقادر  
 صاحب کے تراجم سے لیکر حضرت مولانا تھانوی علیہ الرحمہ اور مولانا فتح محمد غاں صاحب  
 تک بلکہ تفہیم القرآن کی تصنیف تک کے تمام مترجمین کی مساعی جمیلہ کو کس طرح لغوی و بیکار  
 غیر مفید بلکہ مضرت رساں ثابت کر رہے ہیں!

لہذا تکلف برطوت اگر حضرت علامہ کو یہ حق پہونچتا ہے کہ وہ زور صحافت  
 میں اپنے قلم کی جراحت کاریوں کا نشانہ ان حضرات اکابر کو بنائیں تو کوئی وجہ نہیں ہے  
 کہ موصوف کو ماورائے تنقید قرار دیکر ان کے مزخرفات سے یکسر صرف نظر کر لیا جائے اور

انہی ظلم تحریر کا پردہ چاک کر کے اصل حقیقت کو بے نقاب نہ کر دیا جائے۔

## بات کچھ دور جا پہنچی

بات چل رہی تھی غلطی کے بنیادی سراغ کی کہ علامہ نے بیاختہ غالباً بے شعوری میں یہ تحریر فرمادیا تھا کہ ”ذہن کا کتابی سا پنچہ“ جو اب تک کی کتب بینی سے بنا ہے اس کتاب کے سمجھنے میں تمھاری مدد نہ کریگا بلکہ الٹا مزاحم ہوگا۔ علامہ کے اس ارشاد پر مفصل تبصرہ کرتے کرتے ہم ذرا دور تک چلے گئے تھے۔

اب ہمیں کہنا یہ ہے کہ جب لوگوں کے ذہنوں کا کتابی سا پنچہ قرآن فہمی میں میں مزاحم ہوتا ہے تو ”سلاستی“ اسی پرانے دستور تعلیم میں نظر آتی ہے اور قرآن فہمی کی راہ کھٹنے کا طریقہ صرف ایک ہی نظر آتا ہے وہ یہ کہ جسے بھی قرآن فہمی منظور ہو وہ اپنی تعلیم کی ابتدا ہی قرآن مجید سے کرے۔ جب دوسری کتابوں کے مطالعہ سے تیار ہونے والا ”کتابی سا پنچہ“ یا چوکھٹا ”ذہن میں موجود ہی نہ ہوگا تو قرآن مجید میں ”کتابی اسلوب“ اور ”تصنیفی ترتیب“ کی کمی اور خامی بھی نظر نہ آئیگی (علامہ تو شاید تصوف اور صوفیاء کے قائل ہی نہیں ہیں، صوفیاء نے شاید ایسے ہی موقعوں کے لئے فرمایا ہے ”اعلم الحجاب الاکبر“)۔

شاید یہی وجہ ہے کہ قدیم زمانے میں سب سے پہلے قرآن مجید شی کی تعلیم دی جاتی تھی بلکہ اگلے وقتوں کے لوگ تو صرف قرآن مجید ہی کو کتاب ماننے اور کہنے کیلئے تیار تھے اور اسے بڑی کتاب ہی کے نام سے یاد کرتے تھے۔ ان بیچاروں کو اسکی کیا خبر رہی ہوگی کہ ایک وقت ایسا بھی آئے گا کہ جب کسی علامہ کے

زعم میں دوسری کتابیں تو کتاب ہونگی اور اللہ تعالیٰ کی اس بڑی کتاب کو کتاب ثابت کرنے کیلئے کسی علامہ کو ایڑی سے چوٹی تک زور بھی لگانا پڑے گا۔  
 اور خدا تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ اسے ہم مسلمانوں کا کون سا امتحان لینا ہے مقصود ہے کہ اس نے اپنی ایسی کتاب کو جو ڈاکٹر ٹیٹ کے لئے لکھے گئے کسی مقالہ کی من ترتیب تصنیفی اور کتابی اسلوب بھی نہیں رکھتی (معاذ اللہ منہ) جگہ جگہ اسے قرآن مجید میں کتاب اللہ اور ذالک الکتاب وغیرہ سے اسکا ذکر فرما دیا ہے اور انسان کے ذہن میں تیار ہونے والے کتابی سائچوں کا مطلق لحاظ نہ فرمایا۔

## سمجھ میں نہیں آتا

قرآن مجید کو جو اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے دوسری انسانی تصنیفات کے معیار پر پرکھنے کی ضرورت ہی کیا تھی کہ اس طرح اسکی تصنیفی ترتیب اور کتابی اسلوب کو بدعت ائراض و تنقید بنا دیا جائے۔ نظم قرآنی کے اس اعجاز کو جسے مجروح کرنے کی ہمت مخالفین اسلام بھی نہ کر سکے محض اپنا علمی رعب اور تحقیقی تفوق ثابت کرنے کیلئے مقدمہ تفہیم میں علامہ نے اس سے متعلق ”شک وارتباب“ کی جو نفا سازی فرمائی ہے اس پر تبصرہ کرنے کے لئے مناسب اور موزوں الفاظ آسانی سے میسر نہیں آ رہے ہیں۔

بہر حال قرآن مجید کی تصنیفی ترتیب و کتابی اسلوب سے متعلق کسر اور خامی کے یہ پہلو جو شاید ہی کسی کے حاشیہ خیال میں آئے ہوں انہیں اس شدت



کے ساتھ محسوس کرا کے اور باقاعدہ تکرار اسلوب و عبارات کے ذریعہ اچھی طرح ذہن نشین بھی فرما کر علامہ موصوف نے قرآن فہمی کی کونسی راہ نکالی ہے یہ خدا ہی بہتر جانتا ہے۔

## ہمیں تو پوری تفہیم میں یہی نظر آتا ہے

علامہ نے ہر موقع پر صرف یہی کوشش کی ہے کہ انکا پڑھنے والا صرف انھیں کو مانے انھیں کو جانے وہ قرآن مجید بھی پڑھے تو صرف اسی "عینک" سے پڑھے جو انھوں نے اپنی تفسیر تفہیم القرآن کے بین السطور ہر ناظر کیلئے ہیا فرمادی ہے اور ہمارا یہ تاثر ظن و تخمین پر مرکز مبنی نہیں ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ ہم علامہ کے اس منصوبہ بندی کی مثالیں آئندہ پیش کر کے اپنا دعویٰ مدلل و مستحکم کرتے رہیں گے۔

## آپ ہرگز یہ خیال نہ فرمائیں کہ

آپ بھی کسی "اجنبی مسافر" کی طرح تنقید و تبصرہ کے اس نئے شہر کی گلیوں میں یونہی گھومتے پھرتے اور بھٹکتے رہیں گے اور سر رشته مضمون آپ کے ہاتھ نہ لگ سکے گا، نہیں نہیں انشاء اللہ تعالیٰ ہرگز ایسا نہیں ہوگا۔

"مقدمہ تفہیم کا فیصلہ سناؤ جس کے بعد غفریب ہی علامہ کی اصل تفسیر پر بھی راقم السطور کو اپنی معروضات پیش کرنی ہیں اسوقت انشاء اللہ تعالیٰ تفصیل سے علامہ کی قرآن فہمی کے شاہکار اور خدمت قرآن و سنت کے نمونے

آپ کے سامنے آسکیں گے۔

## ناظرین کرام کو یاد ہوگا

ہم نے اثنائے تبصرہ پہلے کہیں یہ بات اشارۃً کہی تھی کہ علامہ نے اپنی یہ تفسیر تفہیم القرآن واقفاناً قرآن نہیں کیلئے لکھی ہی نہیں ہے بلکہ اسکی آرٹیں دراصل وہ اپنی تحریک کی تفہیم اور ذہن سازی "فرما ڈالنا چاہتے ہیں اسی لئے وہ جہاں کہیں موقع پاتے ہیں اپنے تفسیری دیباچہ و مقدمہ اور اصل تفسیر میں بھی نہایت صفائی و چابکدستی کے ساتھ آہستہ سے بالکل غیر محسوس طور پر کوئی ایسا لفظ بھی اپنی تحریر میں شامل کر دیتے ہیں جسے انکی تحریک و جماعت سے غیر متعلق لوگ تو زیادہ محسوس بھی نہ کر سکیں مگر انکی "امرت مسلمہ" اسکا بین السطوری مطلب اچھی طرح سمجھ لے اور پھر اپنے درس قرآن کے پروگرام میں انھیں خطوط پر مطالعہ قرآن کے ذریعہ روح قرآنی تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرے۔

علامہ نے اسی منصوبہ ذہن سازی کے تحت "تفہیم القرآن" کی تصنیف سے بہت پہلے "قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں" نامی رسالہ تصنیف فرمایا جس میں موصوف نے قرآن کی ان چار بنیادی اصطلاحوں پر ایک خاص انداز میں اور ایک نئے پہلو سے کلام فرمایا جس پر دین اسلام کا محور گردش کرتا ہے اور اپنی انہی تشریحات کو مرکزی خیال دیکر تفسیر قرآنی کیلئے ایک نیا نمونہ پیش کر دیا۔

موصوف کی اس نئی اچھ ہی نے انکے قلم سے وہ سطور نکلا دیں جو اوپر نقل

ہوئیں کہ:-

(الف) - "قرآن و سنت رسول کی تعلیم سب پر مقدم ہے مگر تفسیر و حدیث کے پرانے ذخیروں سے نہیں"۔ (تنقیحات ص ۱۲۶)  
 (ب) - "بعد کی صدیوں میں رفتہ رفتہ ان سب الفاظ (اللہ رب دین اور عبادت) کے وہ اصلی معنی جو نزول قرآن کے وقت سمجھے جاتے تھے بدلتے چلے گئے یہاں تک کہ ہر ایک اپنی پوری وسعتوں سے ہٹ کر نہایت محدود و بلکہ مبہم مفہومات کیلئے خاص ہو گیا"  
 (قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں)

## استاد حسن اسماعیل مہری مولانا ندوی کے ہم نوا ہیں

حضرت مولانا ابوالحسن علی صاحب ندوی دامت برکاتہم اپنی تازہ تصنیف "عصر حاضر میں دین کی تفہیم و تشریح" میں اخوان المسلمین کے مرشد عام فاضل استاد حسن اسماعیل البیضبی کی کتاب "دعاة لا قضاہ" سے نقل فرماتے ہیں

"(علامہ مودودی کا) یہ دعویٰ واقعہ اور تاریخی حقیقت کے مطابق نہیں ہے اسلئے کہ ان کلمات کے جاہلیت میں جو کبھی معنی و مفہومات رائج رہے ہوں قرآن کریم انہی اس خاص معنی کو متعین کرتا ہے جو ان کلمات سے اسکا مقصود ہے اور ان لفظوں میں سے ہر لفظ سے اسکی جو مراد ہے اسکا پورا تعارف کرتا ہے اور اسکو پوری وضاحت کے ساتھ بیان کرتا ہے اور اس مفہوم کے چہرے

سے اس طرح نقاب اٹھاتا ہے کہ اشتباہ یا ابہام کا کوئی شائبہ  
باقی نہیں رہتا۔ قرآن کی اس وضاحت نے ان کلمات کے اصل  
نعمی مفہوم کی طرف رجوع کرنے اور اس کے نزول سے پہلے  
انکے جو معانی تھے انکے سراغ لگانے کی ضرورت باقی نہیں رکھی  
کوئی مسلمان اس بارے میں ذرا بھی شک میں مبتلا نہیں ہو سکتا  
کہ قرآن کا طریقہ اور اسکی شرح و وضاحت سب سے زیادہ محکم و  
واضح، حاوی اور بلند پایہ ہے، بلکہ اسکا اختیار کرنا اسکی کلی اعتماد  
کرنا اور اسکے نتیجے اور مطالبہ کو تسلیم کرنا ضروری ہے خواہ ان  
مفہیم کے مطابق ہوں جو نزول قرآن سے پہلے عرب میں پائے  
جاتے تھے یا ان کے خلاف (دعا لا قضاۃ ص ۱۹، ۲۰ بحوالہ  
دین کی تفہیم و تشریح ص ۳۲)۔

فاضل موصوف مزید فرماتے ہیں :-

”کیا یہ حقیقت نفس الامری کے اعتبار سے درست ہوگا  
کہ جب عرب مختلف و متفرق قبائل میں بٹے ہوئے تھے اور انہیں  
سے ہر ایک کی ذیلی زبان (بولی اور انداز گفتگو کے لحاظ سے)  
الگ الگ تھی وہ کسی ایک حکومت و ثقافت و تہذیب اور یکساں  
عقائد کے جھنڈے کے نیچے نہیں تھے وہ ایک ناخواندہ قوم تھے  
جن میں ایسے افراد شاذ و نادر ہی پائے جاتے تھے جو پڑھنے لکھنے  
کے فن سے کسی قسم کی راہ و رسم رکھتے ہوں۔ ان سب پر جہالت

[illegible]

کیا اتنا بڑا دعویٰ اس حالت میں زیب دیتا ہے کہ اللہ کی کتاب مسلمانوں کے درمیان موجود و محفوظ ہے۔ اور ان میں سے کوئی شخص بھی سورہ فاتحہ، سورہ اخلاص یا معوذتین پڑھ یا سن لے وہ ان حقیقتوں کو سمجھ لے گا اور ان معانی تک پہنچ جائیگا جنکی زمانہ جاہلیت کے آدمی کو ہوا بھی نہیں لگی تھی۔

(دعاة للقضاة ص ٢٠ تا ص ٢٥ بحواله بالا)

”مصنف (مودودی صاحب) کا یہ دعویٰ کہ ————— ”اسلام  
سوسائٹی میں جو لوگ پیدا ہوئے تھے ان کے لئے الہ رب اور

دین و عبادت کے وہ معنی باقی نہیں رہے جو نزول قرآن کے وقت  
غیر مسلم سوسائٹی میں رائج تھے۔

بالکل ایک بے دلیل دعویٰ اور بے سند الزام  
ہے جس پر کسی عمارت کی بنیاد قائم نہیں کیجا سکتی۔ ہم نے  
ہم نے قرآن مجید کی جن آیات کو بطور نمونہ پیش کیا ہے ان سے  
”الوہیت“ اور ”ربوبیت“ کے معنی متعین ہو جاتے ہیں مفسرین نے  
کسی دور میں بھی (علی سبیل المثال) رب کے معنی میں سے کسی ایک  
معنی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ انھوں نے ہر موقع پر اس کلمہ کی وہی تشریح  
کی ہے جو سیاق و سباق کے مطابق تھی“ (حوالہ بالا)

### مشتہ نمونہ از خروارے

شاید ناظرین کرام راقم السطور کے اس دعوے کو بدگمانی پر محمول کریں  
”تفہیم القرآن“ قرآن فہمی کیلئے نہیں لکھی گئی ہے بلکہ اس سے مقصود تحریک مودودیت  
کی تفہیم اور اسکے لئے ناظرین کی ذہن سازی منظور ہے۔ اس لئے اس موقع پر تفہیم  
کے مقدمہ سے چند مثالیں بھی پیش کیا رہی جن پر غور کرنے سے یہ حقیقت واضح اور  
نمایاں ہو جائیگی کہ کس طرح علامہ نے درپردہ اپنے مدعاے ولی کو اپنے الفاظ کی  
جاد و نگاری کے ذریعہ ناظرین تک پہنچانے کی کوشش کی ہے ملاحظہ ہو فرماتے ہیں:

والفہم اس حقیقت کے لحاظ سے انسان کیلئے وہی ”رہب“ درست

اور خوش انجام ہے جسے پچھلے صفحات میں ہم ”صحیح رہب“ کے نام



سے بیان کر چکے ہیں (مقدمہ تفہیم ص ۱۹)

(ب) "اس (قرآن) کا مدعا افسانہ کو صحیح رویہ کی طرف دعوت دینا"  
(مقدمہ تفہیم ص ۲)

(ج) "پہنڈ صاحب آدمی اس دعوت کو قبول کر کے "امت مسلمہ" بننے  
کیلئے تیار ہو گئے" (ص ۲۱)

(د) "اس شدید اور روز افزوں مزاحمت کے باوجود یہ "تحریک"  
پھیلی جلی گئی" (ص ۲۲)

(۵) "لوگ پرانی جاہلیت سے ٹوٹ کر اس "نویز تحریک" کی طرف  
آ رہے تھے" (ص ۲۲)

(و) "خود امت مسلمہ" کے نظام میں مختلف قسم کے منافق گھس آئے"  
(ص ۲۳)  
(ز) "ان ہدایات (قرآنی) میں بتایا گیا کہ "جماعت" اور "ریاست"  
اور مدینیت صحابہ کی تعمیر کس طرح کی جائے" (ص ۲۴)

(ح) "غرض اسے (داعی الی اللہ کو) وہ سب کچھ کرنا ہوتا ہے  
جو ایک دعوت کے علمبردار اور ایک تحریک کے لیڈر کیلئے ضروری ہے"  
(ص ۲۵)  
(ط) "یہی وجہ ہے کہ "دعوت اسلامی" کے ایک مرحلہ میں قرآن کی  
بقینی سورتیں نازل ہوئی ہیں" (مقدمہ ص ۲۶)

(ی) "خلافت الہیہ کے قیام تک پورے تیس سال یہی کتاب  
اس عظیم الشان تحریک کی رہنمائی کرتی رہی" (مقدمہ ص ۲۷)

(ذ) "ایک چھوٹی سی اسلامی ریاست کی بنیاد پڑ گئی" (دیباچہ سورہ بقرہ ص ۲۸)

(د) "مدینہ پہونچکر اس قسم کے منافقین کے علاوہ چند اور قسموں کے منافق بھی "اسلامی جماعت" میں پائے جانے لگے "دیباچہ سورہ بقرہ" (ن) "دوسرے قسم کے منافق وہ تھے جو "اسلامی جماعت" کے دائرہ اقدار میں گھر جانے کی وجہ سے اپنا مفاد اسی میں دیکھتے تھے" (دیباچہ سورہ بقرہ)

## علامہ کی تجد و پسندی

مندرجہ ذیل فہرست الفاظ میں سے آخری تین مثالیں چھوڑ کر (جو سورہ بقرہ کے دیباچہ سے ماخوذ ہیں) بقیہ گیارہ مثالیں مقدمہ کے آخری دس صفحات سے ماخوذ ہیں ان مثالوں سے یہ حقیقت اچھی طرح کھل کر سامنے آ جاتی ہے کہ علامہ نے اپنی تفہیم میں کس ہوشیاری اور صفائی سے "اپنی تحریک مودودیت" کی روح سمودی ہے کہ کسی بھی ناقد کیلئے اس پردہ نظر فریب کو چاک کرنا مشکل ہو جائے۔

اقتباسات مندرجہ بالا کو اگر بغور دیکھا جائے تو یہ پوشیدہ حقائق سامنے آتے ہیں :-

(شق الف و ب میں) "رویہ" اور "صحیح رویہ" کے الفاظ جو یقیناً دین اسلام کی جگہ استعمال کئے گئے ہیں کس قدر بے روح اور غیر مقدس ہیں دین و مذہب کے متواتر اور اصطلاحی الفاظ کی جگہ "رویہ" کا لفظ بڑا ناٹوس بے روح اور بے جان نظر آ رہا ہے لیکن علامہ اپنی تجد و پسندی سے مجبور ہیں انھیں "دین و مذہب" اور "اسلام" جیسے الفاظ کی بجائے "رویہ" فرمانا ہی پسند آیا اور اپنے اسی رویہ پر اصرار بھی ہے۔

دشوق ج میں) "چند صالح آدمی" امت مسلمہ بننے کیلئے تیار ہو گئے، پڑھ کر کون ہے جسکا ذہن علامہ کی تحریک کے ابتدائی دور کی طرف منتقل نہ ہوگا۔ جب اسی طرح "چند صاحبین" علامہ کے خود ساختہ دارالاسلام (پٹھان کوٹ) میں موصوف کی تحریک سے متاثر ہو کر "امت مسلمہ" بننے کیلئے تیار ہو گئے تھے۔ اور یہ علامہ کی چابکدستی و ہوشیاری ہے کہ انھوں نے اصل دعوت اسلام اور اپنی تحریک کے مابین یکسانیت و مماثلت کا تصور پیدا کرنے کیلئے "چند صاحبین" کی معاثر پذیری ذکر فرمائی ورنہ ظاہر ہے کہ اصل دعوت اسلام کے موقع پر چند صاحبین اس طرح ایک ساتھ مجتمع نہ ہو سکے تھے جس طرح "پٹھان کوٹ" کے دارالاسلام میں ہو گئے تھے۔ (دشوق دال و یا میں) "دعوت اسلام اور تبلیغ اسلام کے مبارک و متواتر الفاظ کو چھوڑ کر صرف اپنے تفرد و شد و ذکی غمازی و نشانہ پی کیلئے "تحریک" کا غیر مقدس لفظ استعمال کرنا پسند کیا جو دینی روح اور شائبہ تقدس سے یکسر خالی ہے۔ پھر ہم یہ بھی نہیں سمجھ سکتے کہ علامہ اتنی موٹی حقیقت سے کبھی بے خبر ہو سکتے ہیں کہ تحریک کا مبنی انسانی افکار و نظریات ہوتے ہیں اور اسکا سررشتہ کسی انسان کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ جبکہ مذہب خداوندی اور دین اسلام کا مبنی وحی خداوندی سے ثابت شدہ ناقابل انکار حقائق ہیں جنکا سررشتہ انسان کے ہاتھوں کی بجائے "جبل اللہ المتین" سے وابستہ اور پیوستہ ہے تحریکیں انسان کے ہاتھوں وجود میں آتی ہیں اور اپنی موت مر جاتی ہیں اور دین اسلام منزل من اللہ اور تاقیام میت باقی رہنے والا ہے۔

(دشوق واو و زاء میں) ملاحظہ فرمائیے اور لطفت لیجئے کہ علامہ نے کس طرح

”امت مسلمہ“، ”جماعت“، ”ریاست“ اور ”مذہب“ اور مذہبیت صالحہ وغیرہ کے الفاظ استعمال فرما کر ناظرین تفہیم کے سامنے اپنے دارالاسلام مرحوم کی تصویر کشی فرما کر پرانی یا تازہ فراموشی ہے جو کسی زمانہ میں پٹھان کوٹ میں منہ خشب کی طرح رونما ہوا تھا (شوق ح میں) علامہ نے کس طرح حضرات انبیاء و رسول اور داعیان الی اللہ کو کسی بھی دعوت کے علمبردار اور کسی بھی تحریک کے لیڈر کے شانہ بشانہ لاکھڑا کر دیا۔

غور کیجئے تو حضرات انبیاء کرام کی شان اقدس میں بے ادبی اور جبارت ہونے کیلئے اتنی ہی بات بہت تھی لیکن علامہ صرف اتنی ہی بات پر اکتفا نہیں فرماتے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی فرماتے ہیں کہ

”اسے وہ سب کچھ کرنا ہوتا ہے جو ایک دعوت کے علمبردار اور ایک

لیڈر کیلئے ضروری ہے“

## خطہ کی گھنٹی

علامہ کے یہ الفاظ کسی داعی الی اللہ کو کسی لیڈر کی طرح اپنی تحریک کو چلانے اور کامیاب بنانے کیلئے کس حد تک پہنچنے کی نشاندہی کر سکتے ہیں ”لیڈروں“ کی تاریخ سے واقف حضرات ہی اچھی طرح سمجھ سکیں گے۔ ان الفاظ کے بین السطور علامہ نے اپنے دلی منصوبوں کی طرف بھی اشارہ فرما دیا ہے کہ خود آں موصوف ابنی تحریک کو پروان چڑھانے اور کامیاب بنانے کیلئے وہ سب کچھ کر گزرنے کو تیار ہیں جو کسی بھی لیڈر نے اپنے کو کسی منصوبہ اور ”ازم“ کو چلانے اور پھیلانے کیلئے کیا ہے۔

(شوق طاء و یا و میں) دعوت کے ساتھ ساتھ تحریک کا لفظ بھی چل رہا ہے

تاکہ پرانے الفاظ سے مانوس اذہان کہیں صرف لفظ "تحریک" کے استعمال سے کھٹک  
 نہ جائیں اسلئے دونوں ہی لفظ ساتھ ساتھ چلتے رہیں بقول اکبر مرحوم  
 پیتا میں شراب ہوں آب زمزم کے ساتھ

رکھتا اک اونٹنی بھی ہوں ٹم ٹم کے ساتھ

(شق کاف و لام میں) "خلافت الہیہ" اور چھوٹی سی "اسلامی ریاست" کے الفاظ  
 تحریر فرمائے ہیں کہ ناظرین تفہیم پر صرف یہ حقیقت منکشف ہو کہ ابتدائے دعوت اسلام  
 میں نہ تو اذانیں دی گئیں نہ نمازیں پڑھی گئیں نہ ہی اور کسی قسم کی عبادات کی فکری گئی  
 بلکہ خدا نخواستہ و نعوذ باللہ منہ حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی بالکل ہمارے  
 علامہ مودودی کی طرح "حکومت الہیہ" کا ایک نعرہ لگایا تھا اور نعرہ لگانے کے بعد چند  
 صاحبین کے تعاون سے دارالاسلام قائم کر دیا تھا اور آپ کا سارا کارنامہ بس یہی تھا  
 اناللہ وانا الیہ راجعون -

(شق میم و نون میں) "حضرات صحابہ" یا ابتدائی مسلمانوں کے الفاظ و  
 تعبیر کی بجائے "اسلامی جماعت" کا فقرہ سپرد قلم فرما کر کس لطیف انداز میں علامہ نے  
 اپنی جماعت اسلامی "کا شجرہ نسب" دور نبوت اور عصر صحابہ میں بھی نکال دکھایا اور  
 مزید لطف یہ کہ شاید بالکل غیر شعوری طور پر صرف اتنا فرق باقی رہنے دیا کہ دور صحابہ میں  
 تو اسلامی جماعت کا فقرہ تحریر فرمایا گیا ہے جبکہ علامہ نے اپنی موجودہ جماعت کے لئے  
 "جماعت اسلامی" کا نام تجویز فرمایا ہے۔ دونوں تعبیروں کا یہ فرق ظاہر کر رہا ہے کہ اس وقت  
 دور نبوت میں جو جماعت تھی یعنی حضرات صحابہ کرامؓ ان کے نزدیک اسلام کا تصور مقدم  
 اور جماعت کا تصور موخر تھا جسے علامہ نے اپنے دور تجدید میں "ترقی معکوس" کے

ذریعہ جماعت اسلامی کی ترکیب دیگر یہ تاثر بھی دیدیا کہ اب اس وقت کی جماعت میں تصور جماعت مقدم اور تصور اسلام موخر ہے۔ داد دیجئے علامہ کی اس شان تجدد کو۔ اور اتنی لطیفہ حقیقت بھی ہو چکا ہے

یہ صرف ظن و تخمین نہیں ہے بلکہ  
مبنی بر حقیقت حقیقی تنقید ہے

علامہ مودودی کے مصاحب خاص جناب کوثر نیازی نے اپنے ایک تفصیلی مکتوب میں ان حقائق سے پردہ اٹھایا ہے۔ یہ مکتوب یکم مارچ ۱۹۶۵ء کو قومی آواز لکھنؤ سے شائع ہو چکا ہے چند ضروری فقرے یہاں نقل کئے جاتے ہیں، ملاحظہ ہو :-

(الف) ”میں بہت گنہگار ہوں، میری پوری زندگی کے گناہ ایک طرف اور یہ اکیلا گناہ دوسری طرف کہ میں نے جس بات کو شرعاً درست نہیں سمجھا تھا صرف جماعتی قواعد و ضوابط کی وجہ سے اس معصیت پر مجبور ہو گیا کہ اب اسکی نمائندگی کروں۔ اللہ میرے اس جرم کو معاف فرمائے۔ ورنہ ڈرتا ہوں کہ کہیں اس جرم کی وجہ سے میرا دل رہے سہے ایمان ہی سے محروم نہ ہو جائے“

(ب) ”ہم نے امیدواری کو حرام قرار دیا اسکے لئے صحابہ تک کی کسی جلیل القدر شخصیت میں امیدواری کا کوئی پہلو ہمارے سامنے پیش کیا گیا تو ہم نے اپنی اجتہادی رائے کو نص کا درجہ دیکر اس پر



تنقید کرنے بھی دریغ نہیں کیا۔

(ج) پہلے ہم علماء کے اتحاد کی کوشش کرتے اور موجودہ پارٹیوں کے

ساتھ ملانا غلط سمجھتے تھے اب علماء کے اتحاد سے بے نیاز اور سیاسی

پارٹیوں کے محاذ کو مضبوط کرنا تقاضائے اسلام سمجھتے ہیں۔

(د) رائج الوقت سیاسی بحثیں اتنی مرغوب ہو چکی ہیں کہ ہماری مجلس

میں خدا و رسولؐ کا تذکرہ بھی برائے بیت رہ گیا ہے۔ عبادت میں ہم

سخت تساہلی کا شکار ہیں اور شاید یہ بھی ہمارے لڑیچر کا غیر شعوری

اثر ہے جس میں عبادات کو مقصود کیلئے ذریعہ اور وسیلہ قرار دیا گیا ہے۔

(جماعت اسلامی کاشیش محل ۲۵ تا ۲۹)

## راز سے پردہ اٹھتا ہے

مقدمہ تفہیم پر تبصرہ کے دوران قرآن مجید کے اسلوب کی تعیین و وضاحت

کے سلسلے میں یہ بات تو آپ بار بار پڑھ چکے کہ علامہ مودودی کے خیال میں قرآن مجید

”تصنیفی ترتیب“ اور کتابی اسلوب سے خالی ہے مگر اب تک پتہ نہ چل سکا کہ آخر

علامہ کے نزدیک کتابی اسلوب کا مطلب کیا ہے؟ تو لیجئے علامہ اپنے مقدمہ تفہیم

میں قرآن مجید کی کیفیت نزول کی بحث کا آغاز فرماتے ہوئے اس راز سے یوں

پردہ اٹھاتے ہیں۔ فرماتے ہیں:-

(۸) ”اس بیان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن ایک دعوت کے

ساتھ اترنا شروع ہوا اور وہ دعوت اپنے آغاز سے لیکر اپنی انتہائی

تکمیل تک تیس سال کی مدت میں جن جن مرحلوں اور جن جن منزلوں سے گذرتی رہی انکی مختلف النوع ضرورتوں کے مطابق قرآن کے مختلف حصے نازل ہوتے رہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی کتاب میں وہ تصنیفی ترتیب نہیں ہو سکتی جو ڈاکٹر ٹیٹ کی ڈگری لینے کیلئے کسی مقالہ میں اختیار کیجاتی ہے (مقدمہ تفہیم ص ۲۵)

## بازی بازی بارش بابا ہم بازی

مقدمہ تفہیم کی مندرجہ بالا عبارت کو پورے غور و فکر کے ساتھ پڑھیے اور علامہ کی جو دت و جدت کی داد دیجئے کہ موصوف کو اکابر و اسلاف پر بیدھڑاک تنقید کرنے کی ایسی لت پڑ گئی ہے کہ وہ اپنی تنقید سے نفوذ باللہ منہ خدا تعالیٰ کو بھی بچنے کیلئے تیار نہیں۔

خدا را انصاف فرمائیے کہ عبارت بالا کا حاصل اور تاثر یہی تو ہے کہ "روح محفوظ میں عند اللہ قرآن مجید کسی خاص ترتیب کے ساتھ پہلے سے مرتب و مکتوب اور محفوظ نہ تھا۔ بلکہ صورت یہ ہوئی کہ قرآن ایک دعوت کے ساتھ اترنا شروع ہوا اور وہ دعوت اپنے آغاز سے لیکر اپنی انتہائی تکمیل تک تیس سال کی مدت میں جن جن مرحلوں اور جن جن منزلوں سے گذرتی رہی انکی مختلف النوع ضرورتوں کے مطابق قرآن کے مختلف حصے نازل ہوتے رہے، ایسے غیر متعین اور ہنگامی حالات میں ظاہر ہے کہ ہم میں سے کوئی انسان بھی ان مختلف النوع اور مختلف الاحوال احکام میں وہ تصنیفی ترتیب کیسے قائم کر سکتا ہے جو ڈاکٹر ٹیٹ کی ڈگری لینے کیلئے کسی مقالہ میں

اختیار کیجاتی ہے تو جو بات ہم انسانوں میں سے کوئی بھی انجام نہ دے سکے اس بات کی اللہ تعالیٰ سے انجام دہی کا تصور کیسے قائم کر لیا جائے، تو بہ تو بہ سو بار توبہ۔  
یہ ہے علامہ کی نگارش جمیل کا ایک نمونہ اور یہ ہے موصوف کی جادو نگاری کا فتنہ! افسوس کہ انہی امت مسلمہ کے افراد موصوف کی ایسی ہی عبارتوں پر سر دھنتے ہیں اور بڑے فخر سے دعویٰ کرتے ہیں کہ تفہیم القرآن سے بہتر کوئی تفسیر قرآن فہمی کے لئے آج تک وجود ہی میں نہیں آئی۔

### مرعوب ہو گئے ہیں ولایت سے شیخ جی

آپ کو چاہئے اتفاق ہو یا نہ ہو مجھے کہنا یہی ہے کہ علامہ نے اس طرح قرآن کا تقابل ڈاکٹر میٹ کے مقالہ سے فرما کر صرف ولایت سے اپنی مرعوبیت ہی کا ثبوت فراہم فرمایا ہے ورنہ اہل سعادت و ادب اور اہل ایمان و احسان ایسے موازنہ و تقابل کو منافی ایمان و ادب تصور کرتے ہیں مگر کیا کیا جائے مجبور ہی ہے اور بقول شخصہ یہی کہنا پڑتا ہے۔

صفائی روح کی کس بات میں ہے آپ کیا جانیں  
کہ کالج میں کوئی اس علم کا ماہر نہیں ہوتا

### یہ ارشاد سراسر خلاف واقعہ ہے

علامہ نے اپنے مقدمہ تفہیم میں قرآن مجید کے موضوع مرکزی مضمون اور مدعا کا تعارف فرما دینے کے بعد قرآن مجید کی کیفیت نزول کو اپنا موضوع بحث

بنایا ارشاد فرماتے ہیں :-

(۹) "اللہ تعالیٰ نے عرب کے شہر مکہ میں اپنے ایک بندے کو پیغمبری کی خدمت کیلئے منتخب کیا اور اسے حکم دیا کہ اپنے شہر اور اپنے قبیلہ (قریش) سے دعوت کی ابتداء کرے (مقدمہ ص ۲۱)

علامہ کا یہ مندرجہ بالا ارشاد سراسر خلاف واقعہ ہے کیونکہ صحیح صورت واقعہ تو یہ ہوئی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے عرب کے شہر مکہ میں اپنے جس بندے کو پیغمبری کی خدمت کیلئے منتخب کیا تھا اسے سب سے پہلے تو یہ حکم دیا تھا اقراء باسم ربك الذی خلقہ خلق الانسان من علقہ اقراء وربك الاكرم الذی علم بالقلمہ علم الانسان ما لم یعلمہ (اے نبی) آپ اپنے پروردگار کا نام لیکر پڑھیں جس نے سب کو پیدا کیا انسان کو خون کی پھٹکی سے پیدا کیا۔ آپ پڑھیں اور آپ کا پروردگار بہت کریم ہے جس نے قلم کے ذریعہ علم سکھایا، انسان کو وہ سب کچھ سکھایا جس سے وہ بے علم تھا۔ سورہ علق (اقراء) کی یہ مندرجہ بالا پانچ آیات پہلی وحی کی تعلیمات ہیں اور یہ تاریخی حقیقت اتنی مشہور ہے کہ تقریباً ہر وہ انسان اس سے باخبر ہے جو دین کی معمولی شد بد بھی رکھتا ہے بلکہ خود علامہ مودودی بھی سورہ العلق کی تفسیر (پارہ ۱) میں ان آیات کو پہلی وحی تسلیم فرما رہے ہیں۔

ایسی صورت میں علامہ نے دعوت اسلام کی اصل ترتیب کو محض اپنے ذہنی منصوبہ کے مطابق ثابت کرنے کے لئے کار نبوت کو جس ترتیب سے پیش فرمایا ہے وہ خلاف واقعہ ہونے کے باعث موصوف کیلئے مفید مدعا ہرگز نہیں۔

یہ بات یہاں تک تو صحیح ہے کہ حضور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کو اثنا عشر دعوت یہ نہایت

بھی ملی تھی کہ آپ اپنے شہر اور اپنے قبیلہ (قریش) سے دعوت کی ابتداء کریں لیکن یہ ہدایت پہلے نمبر پر ہرگز نہیں دی گئی ہے جیسا کہ موصوف اپنی منصوبہ بند تحریر میں ارشاد فرما رہے ہیں۔

مقصد دراصل یہ ہے کہ چونکہ علامہ کو تو یہ دھن لگی ہوئی ہے کہ کسی طرح اصل دعوت اسلام اور کیفیت نزول کو ڈاکٹر ٹیٹ کے مقالہ کی طرح باقاعدہ مرحلہ وار مرتب انداز میں پیش کر دیں ہو سکتا ہے اسی طرح انھیں دیباچہ تفہیم اور مقدمہ تفہیم ہی تحریر فرمانے پر ڈاکٹر ٹیٹ کی ڈگری مل جائے اس لئے موصوف قرآن مجید کی کیفیت نزول کو بھی اصل صورت حال سے قطع نظر فرماتے ہوئے صرف اپنے منصوبہ کے مطابق ہی پیش کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ پوری تفسیر میں شان نزول کی بیشتر بحثیں موصوف نے اپنے منصوبہ کے مطابق ہی تحریر فرمائی ہیں، جنکی تفصیلات انشاء اللہ تعالیٰ اپنے اپنے موقع پر پیش کی جاتی رہیں گی۔

عجارت بالا کے بعد ہی متصلاً اسی کیفیت نزول پر مزید روشنی ڈالتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں :-

(۱۰) "یہ کام شروع کرنے کیلئے آغاز میں جن ہدایات کی ضرورت تھی صرف وہی دی گئیں اور وہ زیادہ ترین مضمونوں پر مشتمل تھیں (۱) پیغمبر کو اس امر کی تعلیم کہ وہ خود اپنے آپ کو اس عظیم الشان کار کیلئے کس طرح تیار کرے (۲) حقیقت نفس الامری کے متعلق ابتدائی معلومات اور حقیقت کے بارے میں ان غلط فہمیوں کی محفل تردید جو گرد و پیش کے لوگوں میں پائی جاتی تھیں جنکی وجہ سے انکار و یہ غلط ہو رہا تھا (۳) صحیح رویہ کی طرف دعوت اور

”ہدایت الہی“ کے ان بنیادی اصول اخلاق کا بیان جسکی پیروی میں  
انسان کی فلاح و سعادت ہے“ (مقدمہ تفہیم ص ۲۱)

## ہدایت افسوس کے ساتھ

کہنا پڑتا ہے کہ موصوف ڈاکٹر مودودی صاحب قرآن مجید کی ”تصفیفی ترتیب“  
اور کتابی اسلوب ”کو موضوع بحث اور نشانہ تنقید“ اس حد تک بنائے ہوئے ہیں  
کہ انھیں قرآن مجید کو ڈاکٹر ٹیٹ کے مقالہ سے کم معیار اور فرد تر قرار دینے میں بھی کوئی  
باک نہیں محسوس ہوتا۔ کاش موصوف ڈاکٹر صاحب اپنے مقدمہ پر بھی ایسی ہی تنقیدی نظر  
ڈال لیتے تو شاید ہماری طرح خود انھیں نظر آجاتا کہ ان کا یہ مقدمہ جسے انھوں نے صرف  
اس لئے تحریر کیا ہے کہ وہ پہلے قرآن مجید کو ”بے ترتیبی“ ”بے اسلوبی“ ”تنگی بیان“  
اور ”تکرار مضامین“ وغیرہ جیسے نقائص اور اعتراضات کا محل ثابت کریں اور بعد میں  
اپنی ”کارگزاری“ کی نمائش میں ہر نقص و اعتراض کو اپنی نگارشات جمیل کے ذریعہ  
دور فرمانے کی بھی کوشش فرمائیں مگر افسوس صد افسوس کہ موصوف کا یہ مقدمہ کبھی اپنے  
تو دامن دہی سب عیوب و نقائص چھپائے ہوئے ہے جسے وہ قرآن مجید میں دکھلانا  
چاہتے ہیں۔

موصوف نے کیفیت نزول کو سمجھانے کیلئے کل زمانہ نزول کو تین مرحلوں  
میں تقسیم فرما کر ہر مرحلہ سے متعلق مضامین ہدایت کی صرف تعیین فرمائی ہے حالانکہ ضرورت یہ بھی  
تھی کہ موصوف اپنے تفہیم مطالعہ اور تدبر قرآن کو اپنے ناظرین اور معتقدین پر مزید روشن  
و آشکارا فرمانے کیلئے ہر مرحلہ سے متعلق آیات قرآنی کی کچھ مثالیں بھی نقد ہی پیش فرمادیتے



جیسا کہ ڈاکٹر ریٹ کے لئے لکھے گئے مقالوں میں ہوتا ہے۔ ان مقالوں میں یشتنگی اور بقیانگی نہیں ہوتی جو علامہ نے اپنے اس مقدمہ میں روارکھی ہے ان میں یا تو اسی جگہ مثال دیدی جاتی ہے اور کہیں اگر اختصار مد نظر ہوتا ہے تو کم از کم مثالوں کا حوالہ تو اسی جگہ دیدیا جاتا ہے۔ علامہ ڈاکٹر صاحب کو بھی کرتا تھا کہ وہ دعوت کے ہر سہ مرحلہ سے متعلق مضامین کی ہدایات کی کچھ مثالیں بھی یہیں بیان فرما دیتے کہ مضمون ۱ کی مثالیں فلاں فلاں سورتوں کی فلاں فلاں آیات ہیں اور مضمون ۲ کی مثالیں فلاں فلاں آیات اور مضمون ۳ کی مثالیں فلاں فلاں آیات ہیں تب کہیں جا کر موصوفت کا یہ مقدمہ ڈاکٹر ریٹ کے مقالہ کی مشیت کا ہو سکتا تھا لیکن موصوفت نے یہ صورت اختیار نہ فرمائی بلکہ کیا بھی تو صرف یہ کیا کہ اپنی تحریک مودودیت "کو منظر عام پر لانے سے پہلے انھوں نے جو منصوبہ اس کے لئے تیار کیا تھا اور جس کو برپا کرنے کیلئے دارالاسلام کی تخلیق فرمائی تھی اسی منصوبے کے "چوکھٹے" میں اصل دعوت اسلام اور قرآن مجید کی "کیفیت نزول" کو کسی طرح فٹ کر کے یہ تاثر دینے کی کوشش فرمائی ہے کہ انکی یہ اپنی تحریک بھی بالکل اسی اصلی دعوت اسلام کے خطوط پر اور اسکی صحیح نقل مطابق اصل اور اسکا اکلوتا نمونہ ہے مگر ظاہر ہے کہ کہاں وہ اصل دعوت اسلام جسکا نقشہ اور منصوبہ لوح محفوظ میں تیار ہو کر وہیں مکتوب و محفوظ رہا اور وقت مقررہ پر خداوند عالم کی ہدایات کے مطابق نزول قرآن کے ذریعہ حضور رسول مقبول صلی اللہ علیہ کی طرف منتقل اور آپ کے ذریعہ دنیا میں شایع و دہرایا ہوتا رہا اور کہاں علامہ موصوفت کی اپنی یہ تحریک جو ان کے اپنے ذہن و فکر کی پیداوار اور انکی تجدید پسندی کا شاہکار ہے جسکا نقشہ و منصوبہ پٹھان کوٹ میں مرتب و تیار ہوا جو ان دونوں منصوبوں میں مطابقت و یکسانیت پیدا کر دینا اور انسانی دماغ

جو کھٹے میں اللہ تعالیٰ کے الہامی منصوبہ دعوت کو نٹ کر دینا کسی بھی علامہ یا پروفیسر کے بس کی بات نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ موصوف ڈاکٹر ٹریٹ کیلئے لکھے گئے مقالہ کو آئینہ اور مثالی تسلیم فرمالینے کے باوجود اپنے مقدمہ تفہیم میں ان مقالوں جیسی ترتیب و تہذیب ملحوظ نہ رکھ سکے اور دعوت اسلام کی مرغلہ و ارتقیم تو فرمادی لیکن کیفیت نزول کے بیان میں اپنے متعینہ موضوعات و مضامین سرگاہ نہ کوتالوں کے ذریعہ ذہن نشین اور مستحکم نہ فرما سکے

بہت ممکن ہے موصوف اپنی کسی بات کو دلیل اور مثال کے ذریعہ مستحکم فرمانا ضروری نہ خیال فرماتے ہوں کیونکہ انکی اپنی "امت مسلمہ" تمام علما سے امت کو مستحق تہذیب سمجھ لینے کے بعد خود آں موصوف کو تو اور اسے تنقید تصور کرتی ہی ہے اور انکی ہر بات کو بے چون و چرا تسلیم کر لینے کیلئے ہر وقت گوش برآواز رہتی ہی ہے

### تفسیر نویسی طرہی کھیر نکلی

مقدمہ تفہیم میں علامہ کا یہ انداز و اردو می موصوف کا یہ اشارت و اختصار اور دلائل و امثلہ سے یوں صرف نظر ظاہر کرتا ہے کہ انھوں نے یہ تفہیم یا تو صرف اپنے انھیں معتقدین اور مومنین صاداتین کیلئے تحریر فرمائی ہے جو اپنی ذہنی خلائی اور نبیائی عقیدت مندی کے باعث اپنے "مرشد" سے کسی قسم کے مطالبہ ثبوت و دلیل کے قائل ہی نہ ہوں گے یا پھر علامہ کے مخاطب صرف وہ حضرات ہیں جنہیں قرآن مجید اور اس سے متعلق تمام ضروری معلومات پوری طرح مستحضر اور پیش نظر ہوں اور ان کیلئے یہ بہم سے اشارت ہی کافی ہوں لیکن ایک عام ناظر تو اس قسم کے اشاروں سے ہرگز

مطابقت نہ ہو سکے گا بلکہ علامہ کی اس مرحلہ وار تقسیم کو نزول قرآن کی مثالوں سے بھی سمجھنا چاہیے گا مگر افسوس کہ علامہ ایسے عام ناظر قرآن ہی کو نظر انداز فرما گئے۔ حالانکہ علامہ نے اپنے دیباچہ تفہیم میں ناظرین کو یہی امید دلائی تھی کہ وہ اپنی یہ تفسیر متوسط درجہ کے لوگوں ہی کیلئے تحریر فرما رہے ہیں، ملاحظہ ہوا ارشاد فرماتے ہیں۔

"میں جن لوگوں کی خدمت کرنا چاہتا ہوں وہ اوسط درجہ کے تعلیم یافتہ لوگ ہیں جو عربی سے اچھی طرح واقف نہیں ہیں اور علوم قرآن کے وسیع ذخیرے سے جن کے لئے استفادہ کرنا ممکن نہیں ہے انہی کی ضرورت کو میں نے پیش نظر رکھا ہے (دیباچہ تفہیم ص ۶)

### یا پھر قصہ ہی یہ ہے

کہ علامہ نے اپنے ذہنی و فکری طور پر تو اپنے منصوبہ تحریر کے مطابق اصل دعوت اسلام اور کیفیت نزول قرآن کی مرحلہ وار تقسیم اور ترتیب کا ترتیب متعین فرمالی اور پھر مقدمہ تفہیم کے صفحات میں اسے کاغذی وجود بخشی دیا مگر جب وقت آیا کہ اب ہر مرحلہ دعوت پر موضوع و مضمون سے متعلق آیات قرآنی اور ہدایات ربانی کو بھی اپنے خانہ ساز چوکھٹے میں فٹ کر کے علی رؤس الشہاد (سب کے سامنے اسکی نمائش بھی کر دیں تو موصوف کو اندازہ ہوا کہ تفسیر نویسی اور اسکے لئے اس قسم کی مقدمہ نگاری کوئی معمولی کھیر نہیں ہے یہ تو خاصی ٹیرھی کھیر ہے۔

اب علامہ کو عافیت اسمیں نظر آئی کہ وہ نزول قرآن سے متعلق صرف اپنا ذہنی منصوبہ اور کاغذی نقشہ تو پیش کر دیں مگر اسے مثالوں کے ذریعہ ذہن نشین و

مستحکم کرنے اور سمجھانے کی کوشش ہرگز ہرگز نہ کریں کہ یہ بات عملی طور پر ان کے لئے بہت مشکل ہے جیسا کہ آئندہ انشاء اللہ تعالیٰ ہم پوری تفصیل سے عرض کریں گے

## توضیح و تمثیل

سطور بالا میں علامہ مودودی کی مقدمہ نگاہی میں جسم قسم کے نقص و عیب کا ذکر کیا گیا ہے ممکن ہے بعض حضرات راقم السطور کے اس نقد و تبصرہ میں وہی خامی و تشنگی محسوس فرمائیں اسلئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر اپنے دعا کی قدرے توضیح بھی پیش کر دی جائے۔

صورتِ واقعہ یہ ہے کہ اصل دعوتِ اسلام اور کارِ نبوت کا آغاز تو اس وقت ہوتا ہے جب اللہ تعالیٰ حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کو رسالتِ نبوت کے لئے منتخب فرماتے کے بعد پہلی وحی کے ذریعہ پہلا حکم نازل فرمایا۔ وہ حکم کیا تھا؟ "اقرأ باسم ربك" اے نبی آپ اپنے رب کا نام لیکر پڑھیں یعنی آغازِ نبوت ہی میں آپ کو اشارتاً یہ اطلاع دیدی گئی تھی کہ آپ کو ایک کتاب پڑھنا ہے۔ انہی ابتدائی آیات میں علم و تعلیم اور قلم و کتابت (علم سے متعلق متعدد چیزوں) کا تعارف بھی کر دیا گیا تھا نیز تخلیقِ انسانی اور مادہِ تخلیق کا ذکر بھی فرما دیا گیا تھا۔

علامہ مودودی صاحب کو دھن یہ ہے کہ وہ نزولِ قرآن کی کیفیت اپنے منصوبہ کے تحت پیش کریں اسی لئے وہ دعوتِ اسلام کے تین مرحلوں میں نازل ہونے والی ہدایات کو اپنے مفروضہ منصوبہ کے مطابق پیش کر رہے ہیں جس کا نتیجہ

یہ ہوا کہ موصوف نے دعوت کے پہلے مرحلہ میں اپنے قبیلہ سے دعوت کی ابتداء کرنے کی بات تحریر فرمادی حالانکہ وہ حکم آغاز نبوت کے کافی بعد نازل ہوا تھا۔ موصوف نے جن الفاظ میں وہ حکم ذکر فرمایا ہے وہ چونکہ بغیر آیت قرآنی صرف مفہوم پر مشتمل ہے اسلئے یقینی طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ موصوف نے کس آیت قرآنی کا مفہوم یوں نقل فرمایا ہے :-

”اپنے شہر اور اپنے قبیلہ سے دعوت کی ابتداء کریں“

قرآن مجید کے الفاظ اور ترتیب نزول دونوں ہی کو ملحوظ رکھتے ہوئے اگر دیکھا جائے تو یہ حکم تو آغاز نبوت کے بہت بعد کا ثابت ہو سکے گا کیونکہ ظاہر الفاظ کو دیکھتے ہوئے علامہ کا نقل کردہ مفہوم ”وَ اَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ“ کا ترجمہ معلوم ہوتا ہے جو سورہ شعراء کی مشہور آیت ہے اور سورہ شعراء ترتیب نزول کے اعتبار سے بہت بعد کی سورہ ہے۔

اگر علامہ کے نقل کردہ مفہوم میں کچھ مسامحت سے کام لیا جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ موصوف نے شاید سورہ مدثر کی آیت ”قُمْ فَأَنْذِرْ“ (آپ انداز و تبلیغ کیلئے اٹھ کھڑے ہوں) کے عام حکم میں اپنے منصوبہ اور اپنی مفروضہ ترتیب کار کو ملحوظ رکھتے ہوئے ”اپنے شہر اور اپنے قبیلہ“ کا اضافہ اپنی جانب سے فرما دیا ہو گا اور مراد انکی یہی سورہ مدثر کی آیت ہو گی۔

بہر صورت یہ تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں کہ ترتیب نزول قرآن کو علامہ اپنے منصوبہ کے مطابق بنا کر پیش کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ کیونکہ واقعہ یہ ہے کہ نزول قرآن کی مشہور ترتیب تو کچھ اس طرح ہوئی ہے :-

(۱) سورہ علق ۲۱ سورہ قلم کی کچھ آیات (۳) سورہ نزل کی چند آیات (۴) سورہ مدثر کی کچھ آیات (۵) سورہ فاتحہ — اس اہمال کی تفصیل اس طرح پیش کی جا سکتی ہے :- (سورتوں کی ترتیب نزول اتقان کے قول پر متعین کی گئی ہے)

## آغاز نبوت میں ابتدائی آیات اور ”بنیادی تعلیمات“

پہلی وحی : (اے نبی) آپ اپنے پروردگار کا نام لیکر پڑھیں جس نے سب کو پیدا کیا، انسان کو خون کی پھٹکی سے پیدا کیا، آپ پڑھیں اور آپ کا رب بہت کریم ہے جس نے قلم کے ذریعہ علم سکھایا، انسان کو وہ سب کچھ سکھا دیا جس سے وہ بے علم تھا (سورہ علق آیات ۱ تا ۵)

نہم قسم ہے قلم کی اور اس کے نکلنے کی کہ آپ اپنے رب کے فضل سے مجنون نہیں ہیں اور بیشک آپ کے لئے ایسا اجر ہے جو ختم ہونے والا نہیں ہے اور بیشک آپ اخلاق کے اعلیٰ پیمانہ پر ہیں سو عنقریب آپ بھی دیکھ لیں گے اور یہ لوگ بھی دیکھ لیں گے کہ تم میں سے کس کو جنون تھا۔ آپ کا پروردگار اس شخص کو بھی خوب جانتا ہے جو اسکی راہ سے بھٹکا ہوا ہے۔ اور وہ راہ چلنے والوں کو بھی خوب جانتا ہے، تو آپ ان تکذیب کرنے والوں (جھٹلانے والوں کا کہنا نہ مانیئے یہ لوگ چاہتے ہیں کہ آپ ڈھیلے ہو جائیں تو یہ بھی ڈھیلے ہو جائیں۔ آپ کسی ایسے شخص کا کہنا نہ مانیں جو بہت قسمیں کھانے والا ہو، بے وقوت ہو، طعنہ



دینے والا ہو۔ چنلیاں لگاتا پھرتا ہو، نیک کام سے روکنے والا ہو، حد سے گزرنے والا ہو۔ گناہوں کا کرنے والا ہو۔ سخت مزاج ہو۔ اس کے علاوہ بذات ہو اس سبب سے کہ مال و اولاد والا ہو جب ہماری آیتیں اس کے سامنے پڑھ کر سنائی جائیں تو وہ کہتا ہے کہ یہ بے سند باتیں ہیں، ہم عنقریب انکی ناک پر داغ لگا دیں گے (سورہ قلم ۱۶ آیات)

● اے نبی جو مکلی اوڑھے ہوئے ہو رات کو (خدا کے آگے) کھڑے ہو جایا کرو، آدھی رات کو یا کچھ کم یا اس سے کچھ زیادہ اور قرآن کو آہستہ آہستہ پڑھا کرو، ہم عنقریب تم پر بھاری فرمان نازل کریں گے، اس میں کچھ شک نہیں کہ رات کا قیام نفس بہیمی کو سخت پامال کرتا ہے (اس وقت دل و زبان کا خوب میل ہوتا ہے) اس وقت ذکر بھی خود بہت ہوتا ہے، دن کے وقت تو تمہیں اور بہت سے کام ہوتے ہیں۔ تم اپنے رب کا نام یاد کرتے رہو اور ہر طرف سے بے تعلق ہو کر اسکی طرف متوجہ ہو جاؤ وہی مشرق و مغرب کا مالک ہے اور اس کے سوا کوئی معبود نہیں تو اسی کو اپنا کار ساز بناؤ اور جو دل آزار باتیں یہ لوگ کہتے ہیں انکو سہتے رہو اور اچھے طور پر ان سے الگ ہو جاؤ اور مجھے ان جھٹلاتے والوں سے جو دولت مند ہیں سمجھ لینے دو اور انکو تھوڑی سی مہلت دیدو۔ (سورہ مزمل ۱۱ آیات)

● اے جو کپڑا پیٹے ہوئے ہو اٹھو اور ہدایت کرو اور اپنے رب کی بڑائی کرو اور کپڑوں کو پاک رکھو اور ناپاکی سے دور رہو اور اس نیت سے احسان نہ کرو کہ اس سے زیادہ بدلہ چاہو، اور اپنے پروردگار کیلئے صبر کرو، جب صبر پھونکا جائے گا وہ دن مشکل کا دن ہوگا یعنی کافروں پر آسان نہ ہوگا، ہمیں اس شخص سے سمجھ لینے دو جو

ہم نے اکیلا پیدا کیا اور مال کثیر دیا اور ہر وقت اسکے پاس جا کر رہنے والے  
بیٹے دیئے اور ہر طرح کے سامان میں وسعت دی ابھی خواہش رکھتا ہے کہ  
اور زیادہ دیں، ایسا ہرگز نہیں ہوگا یہ ہماری آیتوں کا دشمن رہا ہے ہم اسے  
صعود پر چڑھائیں گے (سورہ مدثر، آیات)

● سب تعریفیں اللہ ہی کو لائق ہیں جو مربی ہیں ہر عالم کے، جو بڑے مہربان  
نہایت رحم والے ہیں، جو مالک ہیں روز جزا کے ہم آپ ہی کی عبادت کرتے  
ہیں اور آپ ہی سے اعانت کی درخواست کرتے ہیں، بتلا دیجئے ہم کو رستہ  
سیدھا، رستہ ان لوگوں کا جن پر آپ نے انعام فرمایا ہے، نہ رستہ ان لوگوں کا  
جن پر آپ کا غضب کیا گیا نہ ان لوگوں کا جو رستہ سے گم ہو گئے (سورہ فاتحہ مکمل)  
یہ ابتدائی پانچ سورتوں کی چند آیات کے مفہام ہیں جو اعلان نبوت  
کے بعد ہی بالکل ابتدائی دور میں بالترتیب اسی طرح نازل ہوئیں انکا پس منظر  
بھی بہت کچھ تو ان آیات ہی میں غور کرنے سے ظاہر ہو جاتا ہے اور ساتھ ہی  
ساتھ ان آیات کا مطلب بھی بڑی حد تک واضح ہو جاتا ہے۔ راقم السطور  
کے پیش نظر اس وقت ان کے پس منظر اور تفصیلی مطلب سے بحث کرنا نہیں ہے  
بلکہ اصل مقصد تو اس امر کی توضیح ہے کہ ناظرین غور فرما کر خود ہی ملاحظہ فرمائیں  
کہ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم  
کو دین کے بنیادی عقائد (یعنی توحید باری تعالیٰ، نبوت محمدی نیز عقیدہ آخرت  
مع سزا و جزا وغیرہ اور بعض عبادات نیز اصول اخلاق حسنہ وغیرہ کی تعلیم  
و ہدایت فرمائی گئی ہے لیکن علامہ مودودی جو صرف قرآن فہمی کی راہیں کشا دہ

فرمانے میں کوشاں نظر آئے ہیں ان کے نزدیک ان ابتدائی تعلیمات و ہدایات میں عقائد و عبادات کا کوئی ذکر ہی نہیں ہے جیسا کہ اشارۃً پہلے بھی ذکر کیا جا چکا ہے موصوف اپنے مقدمہ میں پہلے فرما چکے ہیں :-

”ان سب کا ایک ہی دین تھا ——— وہ سب ایک ہی

ہدایت کے پیرو تھے یعنی اخلاق و تمدن کے وہ ازل وابدی اصول

جو آغاز ہی میں انسان کیلئے تجویز کر دیئے گئے تھے“

اور یہاں بجلی فرما رہے ہیں

”صحیح رویہ کی طرقت و دعوت اور ہدایت الہی کے ان بنیادی

اصول اخلاق کا بیان جنکی پیرومی میں انسان کیلئے فلاح و سعادت

ہے“ (مقدمہ تفہیم ص ۲۱)

## آخر ایسا کیوں ہے ؟

اصحاب علم و حکمت اور ارباب نظر و انصاف کو غور فرماتا ہے کہ آنحضرت

ایسا کیوں ہے کہ علامہ مودودی صاحب دین کے بنیادی عقائد (اثبات توہید و

ابطال شرکت، رسالت و نبوت اور عقیدہ آخرت وغیرہ) نیز بنیادی عبادات نماز

و ذکر خالق وغیرہ سے صرف نظریوں فرما رہے ہیں، اور دین کی یہ بنیادی تعلیمات موصوف

کے نزدیک قرآن مجید کی ابتدائی تعلیمات و ہدایات میں جگہ کیوں نہ پاسکیں ؟ اور

موصوف نے سارا زور تلم اصول اخلاق اور اصول تمدن کی اہمیت پر ہی کیوں صرف

فرمادیا ؟ کیا اسکی وجہ یہ تعین نہیں ہو جاتی کہ موصوف کے نزدیک عقائد و عبادات کو ا

وہ اہمیت حاصل ہی نہیں رہے جو حقیقت ہونی چاہئے۔ ملاحظہ ہو: موصوف  
فرماتے ہیں:۔

”الف“ آپ سمجھتے ہیں کہ ہاتھ باندھ کر قبلہ رخ کھڑے ہونا  
گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر جھکنا، زمین پر ہاتھ ٹیک کر سجدہ کرنا اور چند مقررہ  
انفاذ زبان سے ادا کرنا بس یہی افعال اور حرکات بجائے خود  
عبادت ہیں۔ آپ سمجھتے ہیں کہ رمضان کی پہلی تاریخ سے۔ روزانہ  
صبح سے شام تک بھوکے پیاسے رہنے کا نام عبادت ہے۔  
آپ سمجھتے ہیں کہ مکہ معظمہ جا کر کعبے کے گرد طواف کرنے کا نام عبادت  
ہے۔ غرض آپ نے افعال کی چند ظاہری شکلوں کا نام عبادت  
رکھ چھوڑا ہے۔ لیکن اصل حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے جس  
عبادت کیلئے آپ کو پیدا کیا ہے اور جس کا آپ کو حکم دیا ہے وہ کچھ  
اور ہی چیز ہے“ (خطبات ۸۷، ۸۸)

آپ پوچھیں گے کہ نماز روزہ اور حج وغیرہ کیا چیز ہے؟ اسکا  
جواب یہ ہے کہ دراصل یہ عبادتیں جو اللہ نے آپ پر فرض کی ہیں انکا  
مقصد آپکو اس بڑی عبادت کیلئے تیار کرنا ہے جو آپ کو زندگی میں  
ہر وقت ہر حال میں ادا کرنی چاہئے“ (۸۹ خطبات مطبوعہ دارالاسلام)  
(ب) ”اس غلط مذہبیت کا پہلا بنیادی نقص یہ ہے

کہ اسکی عبادات محض پوجا پاٹ بنا کر رکھ دی گئیں، حالانکہ وہ ان  
ذہنی و اخلاقی بنیادوں کو مستحکم کرنے کے وسائل ہیں جن پر اسلام

نے اپنا نظام اجتماعی تعمیر کیا ہے" (ترجمان القرآن ج ۱، ص ۲۶۱)  
 علامہ کی مندرجہ بالا تحریرات تو وہ ہیں جن میں موصوف اپنے نظریے کے  
 مطابق عبادت کا مفہوم متعین کرنے کی کوشش فرمائی ہے۔ اب ایک  
 ایسی تحریر بھی ملاحظہ ہو جس میں عبادت کا استہزار ہے اور مضحکہ اڑایا گیا ہے:-  
 "آپ ان کے منہ پر پورے ناپ کی داڑھیاں دیکھ کر ان کے  
 ٹخنوں سے دود داغ اڑنے پا جائے دیکھ کر ان کی پٹیاں پر نماز  
 کے گٹے دیکھ کر اور ان کی لمبی لمبی نمازیں اور موٹی موٹی تسبیحیں دیکھ کر  
 سمجھتے ہیں کہ بڑے دیندار اور عبادت گزار ہیں یہ غلط فہمی بھی  
 اسی وجہ سے ہے کہ آپ نے عبادت اور دینداری کا مطلب  
 ہی غلط سمجھا ہے" (خطبات ص ۷، دارالاسلام)

علامہ کے خطبات کے مندرجہ بالا اقتباسات سے یہ حقیقت اچھی طرح  
 واضح ہو جاتی ہے کہ موصوف یا تو غلامی اور بندگی کے مابین پائے جانے والے  
 عظیم فرق کو بے غیری اور بے شعوری میں نظر انداز فرما گئے ہیں یا پھر دانستہ تجاہل فرماتے  
 غلط بحث کے ذریعہ اپنے انکار و نظریات کی تبلیغ و ترویج چاہتے ہیں ویسے گمانِ غلط  
 تو یہی ہے کہ علامہ جیسا "مجتہد مطلق" غلامی اور بندگی کے درمیانی فرق سے  
 بے خبر ہو گئے ہو گا۔ ہاں جہاں تک تجاہل برت کر غلط بحث کرنے کی بات ہے  
 اس الزام سے علامہ کو محفوظ رکھنے کیلئے حق ظن کی فراہمی ضرور مشکل نظر آتی ہے۔  
 علامہ کے دین پر بھی ایک نظر

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلہ میں علامہ کی "تشریح دین" پر بھی

ایک نظر ڈال لی جائے کیونکہ عبادت کی طرح علامہ کا دین بھی جمہور علماء کے دین سے مختلف ہے۔ موصوف نے اپنے دین پر روشنی بھی مختلف مقامات پر ڈالی ہے چنانچہ خطبات میں ایک جگہ فرماتے ہیں :-

(الف) "دین اور اصل حکومت کا نام ہے" (خطبات ص ۲۳۸ خطبہ جہاد)

(ب) "حکومت کے بغیر دین بالکل ایسا ہے جیسے ایک عمارت کا

نقشہ آپ کے دماغ میں ہو مگر عمارت زمین پر موجود نہ ہو" — جس طرح

خیالی نقشے کا نام عمارت نہیں اسی طرح خیالی دین کا نام بھی دین نہیں

ہے" (خطبات خطبہ جہاد ص ۲۴۱ سطر ۱۲ اور ۱۳ و ۱۴)

(ج) اس کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ وہ (قرآن) لفظ دین کو ایک

جامع اصطلاح کی حیثیت سے استعمال کرتا ہے اور اس سے مراد

ایک نظام زندگی لیتا ہے جس میں انسان کسی کا اقتدار اعلیٰ تسلیم کر کے

اسکی اطاعت اور فرماں برداری قبول کر کے اس کے حدود و ضوابط اور

قوانین کے تحت زندگی بسر کرے (چار بنیادی اصطلاحیں ص ۱۶۸) -

علامہ کے انھیں بنیادی تصورات اور افکار و نظریات نے نہ صرف "مقدمہ تفہیم"

بلکہ انکی دوسری تصنیفات میں بھی موصوف کو اسلامی عقائد و عبادات کو ثانوی درجہ

میں ہی رکھنے پر مجبور کر دیا۔ چنانچہ علامہ نے جس طرح اسلامی عقائد و عبادات کو یہاں

مقدمہ تفہیم میں نظر انداز فرمایا ہے اسی طرح اپنے خطبات میں بھی متعدد مقامات پر یہی

روش اختیار فرمائی ہے۔ اس سلسلہ میں موصوف کی تحریروں کے بعض اقتباسات

حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی دامت برکاتہم کی تازہ تصنیف "عصر حاضر میں دین کی



تفہیم و تشریح" کے حوالے سے نقل کئے جاتے ہیں، ملاحظہ ہو فرماتے ہیں :-

(الف) "اسلام کا اصل مقصد صاحبین کی ایک ایسی جماعت"

بنانا ہے جو انسانی تمدن کو خیر و فلاح کی بنیادوں پر تعمیر کرے"

(اسلامی عبادات پر ایک تحقیقی نظر حصہ اول)

(ب) "اسی تہذیب و تمدن کو دنیا میں قائم کرنے کیلئے انبیاء

علیہم السلام پے درپے بھیجے گئے تھے" (تجدید احیاء دین ص ۱۲)

(ج) "پس دنیا میں انبیاء علیہم السلام کے مشن کا منہائے مقصود

یہ رہا ہے کہ حکومت الہیہ قائم کر کے اس پورے نظام زندگی کو نافذ

کر دیں جو وہ خدا کی طرف سے لائے تھے" (تجدید احیاء دین ص ۱۲)

(د) "اسی وجہ سے تمام انبیاء نے سیاسی انقلاب برپا کرنے

کی کوشش کی بعض کی ماسعی صرف زمین تیار کرنے کی حد تک رہیں

جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام (حضرت آدم و نوح و شعیب علیہ السلام

کس طبقہ میں گئے یہ نہ ارشاد فرمایا) اور بعض نے انقلابی تحریک شروع

کر دی مگر حکومت الہیہ قائم کرنے سے پہلے ہی انکا کام ختم ہو گیا

جیسے حضرت مسیح علیہ السلام اور بعض نے اس تحریک کو کامیابی کی منزل

تک پہنچا دیا جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم

(تجدید احیاء دین ص ۱۲)

حضرت مولانا ندوی دامت برکاتہم نے علامہ کے ان اقتباسات کو

کو نقل فرماتے سے پہلے یہ سوال بھی قائم فرمایا ہے :-

”ان اقتباسات پر نظر ڈالی جائے اور رائے قائم کیجئے  
 کہ فکر کے اس سانچے سے کس طرح کے دل و دماغ ڈھل کر نکلیں گے؟  
 دیکھئے علامہ اور ان کے متبعین اس سوال کا کیا جواب دیتے ہیں؟ — اقتباسات  
 مندرجہ بالا نقل فرمانے کے بعد حضرت مولانا ندوی فرماتے ہیں :-

”اسی کے ساتھ اس بات کا اضافہ کیجئے کہ مصنف و داعی پر  
 یہ مرکزی خیال اتنا مستولی ہو جاتا ہے کہ اسکو تمام اسلامی عبادات  
 اور اسلام کے ارکان اربعہ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ سب اسی  
 مقصد اصلی کے حصول کے وسائل و ذرائع اور اسکے لئے  
 مشق و تمرین نظر آنے لگتے ہیں“ (چند سطروں کے بعد فرماتے ہیں)  
 ”حالانکہ قرآن شریف اسکے برعکس جہاد و حکومت کو وسیلہ اور اقامت  
 صلوات، کو مقصد و نتیجہ بتاتا ہے“ (اگلے صفحہ پر فرماتے ہیں) ”وسائل  
 سے قدرتا ایک ضابطہ اور ضرورت کا تعلق ہوتا ہے اور انکو ایک  
 عبوری مرحلہ سمجھنے کا ذہن پیدا ہونا ناگزیر ہے۔ انسان میں انکے  
 بارے میں ترقی کرنے، انکے مراتب عالیہ تک پہنچنے کا ذوق و فکر  
 اور اس سے لذت و سکون حاصل کرنے کا جذبہ پیدا نہیں ہوتا“ اور  
 آگے چل کر فرماتے ہیں) ”وسائل سے بقدر ضرورت اشتغال  
 ہوتا ہے ان سے شغف اور ان میں انہماک پیدا نہیں ہوتا“ (اور  
 آگے چل کر فرماتے ہیں) ”اس طرز فکر کا نتیجہ ہے کہ عبادات سے قلبی  
 ان میں روح اور کیفیت پیدا کرنے، اپنے اندر خشوع و خضوع، انبات

دانا بت، استحقاق، دوام ذکر، اخلاص و ایمان و احتساب کی دہی  
کیفیت پیدا کرنے کا جذبہ صادق ہی نہیں پیدا ہوتا

”عصر حاضر میں دین کی تفہیم و تشریح بطور اختصار از ص ۸۳ تا ۸۴

حضرت مولانا ندوی نے اپنی مندرجہ بالا تحریرات سے پہلے ہی بالکل بجاطور  
یہ حقیقت بھی سپرد قلم فرمادی ہے :-

”اس طرز فکر اور طرز تحریر سے (جس کے کچھ نمونے اوپر پیش کئے گئے  
ہیں) اندیشہ پیدا ہوتا ہے (اور اسکے آثار علامات ظاہر ہو چکی  
ہیں) کہ جن لوگوں کے دینی معلومات اور اسلام سے واقفیت کا تنہا  
ذریعہ اسلام کی یہی تفہیم و تشریح ہوگی انکا تعلق اللہ کی ذات سے ایک  
محدود، خشک، بے روح اور ضابطہ کا تعلق ہوگا جو ان اندونی کیفیات  
سے خالی ہوگا جو مومن سے مطلوب ہیں خصوصیت کیا تھ جب بار بار انبیاء  
علیہم السلام کی بعثت کا مقصد اور انکی تعلیمات کا ماحصل (بلکہ منہائے  
مقصود) اسی دنیا اور اسکی محدود زندگی میں تبدیلی پیدا کرنے کا صلاح انفرادی  
لانے اور انسانی تمدن کو صحیح بنیادوں پر قائم کرنے کو قرار دیا جائے  
اور اسکو بار بار پوری بلند آہنگی سے اس طرح بیان کیا جائے کہ محبت و  
رضائے الہی اور فلاح اخروی کے تصورات و توقعات اسکے نیچے  
دب کر رہ جائیں، تو یہ امر بالکل قدرتی ہے اور اسکا نتیجہ بالکل خلافت  
عقل و فطرت نہیں ہے کہ دفن و اہتمام سعی و عمل کی پوری گاڑی ایمان  
بالغیب شوق آخرت، طلب محبت و رضا کی اس پٹری سے ہٹ کر

جس پر انبیاء علیہم السلام اسکو ڈالتے ہیں طلب عزت و غلبہ اور شوق اقتدار  
اور بالاختصار مادیت کی پٹری پر پڑ جائے۔

(عصر حاضر میں دین کی تفہیم و تشریح ص ۷)

ناظرین کرام اپنے ذہن سے موضوع بحث  
اور اپنے ہاتھ سے سرشتہ مضمون جانے نہ دیں

علامہ کے نظریہ دین کی تفہیم و تشریح میں حضرت مولانا علی میاں ندوی  
دامت برکاتہم کے طویل اقتباسات کبھی اپنے موضوع بحث ہی سے متعلق تھے اس لئے  
امید تو یہی ہے کہ ناظرین تبصرہ کے ذہن میں مقدمہ تفہیم کا وہ اقتباس محفوظ ہو گا جو چند  
صفحات پہلے "مقدمہ تفہیم" ص ۱۵ و ۱۶ سے نقل کیا جا چکا ہے۔

علامہ نے اپنے ان اقتباسات کے ذریعہ قرآن فہمی کے نام پر یہی خدمت  
انجام دینی چاہی ہے جس کا اندیشہ مولانا ندوی صاحب محسوس فرما رہے ہیں کہ :-

"فکروا اتمام سعی و عمل کی پوری گاڑی ایمان بالغیب، شوق آخرت

طلب محبت و رضا کی اس پٹری سے ہٹ کر جس پر انبیاء علیہم السلام

اسکو ڈالتے ہیں طلب عزت و غلبہ اور شوق اقتدار اور بالاختصار مادیت

کی پٹری پر پڑ جائے۔"

فقہ و فتویٰ کی زبان میں

حضرت مولانا ندوی دامت برکاتہم اپنی تازہ تصنیف میں جس کے اقتباسات

اد پر نقل ہوئے اپنی مخصوص متانت و سنجیدگی کے تحت ارشاد فرماتے ہیں:۔  
 ”پیش نظر کتاب ————— نہ مناظرہ کے انداز میں لکھی گئی ہے  
 نہ فقہ و فتویٰ کی زبان میں، وہ ایک اندیشہ کا اظہار ہے اور ”الدین النصیحة“  
 کے حکم پر عمل کرنے کی ایک غلصانہ کوشش ————— اس ناخوشگوار  
 کام کو (خدا علیم و خیر ہے کہ) عند اللہ مسؤلیت اور شہادت حق کے خیال  
 سے انجام دیا گیا (مختصر ۱۵ و ۱۶)

حضرت مولانا ندوی دامت برکاتہم اپنی متانت و سنجیدگی یا انکار و فرد تنی کے باعث  
 کتاب کو فقہ و فتویٰ کی زبان و اصطلاح سے علیحدہ رکھیں یہ حق یقیناً اکھنیں حاصل ہے  
 لیکن راقم السطور اسی مسؤلیت عند اللہ اور شہادت حق کے تحت اپنے لئے ایسے موقع پر  
 زبان فقہ و فتویٰ اور غیر زبان فقہ و فتویٰ کی تفریق بھی مصلحت دین کے خلاف تصور کرتا ہے  
 اور بالکل صاف اور بے لاگ طور پر عرض کر دینا چاہتا ہے کہ ”جب فکر و اہتمام اور  
 سعی و عمل کی پوری گاڑی ایمان بالغیب، شوق آخرت، طلب محبت و رضا کی اس  
 پٹری سے ہٹ کر جس پر انبیاء علیہم السلام اسکو ڈالتے ہیں طلب عزت و حکومت اور  
 شوق غلبہ و اقتدار کی پٹری پر پڑ جائے“۔ تو اس قسم کی صورت حال کو ”دین“ کہتا  
 سب سے بڑی ”دنیا داری“ ہے اور اس قسم کی حکومت کیلئے جہد و جہد کرنا سب سے  
 بڑھکیر ”طاغوت و دستی“ ہے ”فما ذا بعد الحق الا الضلال“۔

ترتیبِ خداوندی اور نصرتِ آسمانی سے صرف نظر اور چشم پوشی  
 قرآن مجید کی ترتیبِ نزول اور کیفیتِ نزول سے بحث فرماتے ہوئے علامہ نے

اپنے مقدمہ میں ارشاد فرمایا ہے اس کے بعض اقتباسات اور ان پر اپنے کچھ تبصرے  
 اوپر پیش کئے جا چکے ہیں۔ اب ہم مقدمہ تفہیم کا ایک اقتباس جس پر بعض پہلوؤں سے تبصرہ  
 بھی ہو چکا ہے بعض دوسرے پہلوؤں سے تبصرہ کرنے کیلئے پیش کرتے ہیں۔ علامہ موصوفی  
 دعوت اسلام کے دور آغاز سے بحث فرماتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں :-

”یہ کام (دعوت) شروع کرنے کیلئے آغاز کار میں جن ہدایات کی ضرورت  
 تھی صرف وہی دی گئی ہیں اور زیادہ تر تین مضمون پر مشتمل تھیں۔

”ایک پیغمبر کو اس امر کی تعلیم کہ وہ خود اپنے آپ کو اس  
 عظیم امان کیلئے کس طرح تیار کریں اور کس طرز پر کام کریں“

”دوسرے حقیقت نفس الامری کے متعلق ابتدائی معلومات  
 اور حقیقت کے بارے میں ان غلط فہمیوں کی محمل تردید جو گرد و پیش  
 کے لوگوں میں پائی جاتی تھیں جن کی وجہ سے انکار و یہ غلط ہو رہا  
 تھا۔“

”تیسرے صحیح رویہ کی طرف دعوت اور ہدایت الہی کے بنیادی  
 اصول اخلاق کا بیان جن کی پیروی میں انسان کیلئے فلاح و سعاد  
 ہے۔“

(مقدمہ تفہیم ص ۲۱)

علامہ کے اس ارشاد میں ”تشنگی“ و ”غامی“ پائے جانے اور بعض پہلوؤں سے خلاف  
 واقعہ ہونے پر تبصرہ تو گزشتہ صفحات میں کیا جا چکا ہے اب اس موقع پر علامہ کے  
 متعین فرمودہ ہر سہ نمبروں پر نمبر وار کچھ عرض کرنا ہے۔



## ابتدائی ہدایات کا پہلا نمبر

اس نمبر میں علامہ نے جو کچھ فرمایا ہے بڑی ہدایت تک صحیح و درست ہونے کے باوجود ان اثرات سے محفوظ نہیں رہ سکا ہے جس کے لئے علامہ کی تحریک مودودہ بجا طور پر بدنام ہے۔

علامہ کے اس ارشاد کا تاثر کچھ اس طرح سامنے آتا ہے کہ نبوت و دعوت کی انجام دہی صرف ان ہدایتوں پر عمل پیرا ہو جانے کا لازمی و منطقی نتیجہ تھی جن سے اللہ تعالیٰ نے حضور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کو آغاز کار ہی میں روشناس اور واقف کرا دیا تھا اس تعلیم قرآنی کے علاوہ اللہ تعالیٰ کی کوئی خصوصی تربیت و نصرت آپ کے شامل حال نہیں رہی کیونکہ علامہ موصوف کے الفاظ اس سلسلہ میں صرف یہ ہیں کہ ”آپ اپنے آپ کو کس طرح تیار کریں“ ظاہر ہے کہ ان الفاظ کا تاثر یہی قائم ہوتا ہے کہ آپ کی تیاری اس عظیم الشان کام کیلئے خود اپنے ہی علم و ہنرمند اور جہد و جہد کا نتیجہ تھی، اس میں اللہ تعالیٰ کی نصرت غیبی اور خصوصی تربیت یا خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وہی فضیلت اور صفت نبوت و رسالت کو مطلق دخل نہ تھا۔ علامہ کے ان ارشادات کے بین السطور یہ عبارت بھی پڑھی جاسکتی ہے کہ قرآن مجید میں آئی ہوئی ہدایات پر عمل پیرا ہو کر کوئی بھی شخصیت اسی طرح کار دعوت انجام دے سکتی تھی۔

ممکن ہے بعض حضرات اسے راقم السطور کی بدگمانی پر محمول فرمائیں لیکن کیا کیا جائے موصوف کے لٹریچر میں پنہاں خطرناکیاں اور نہ ہرناکیاں اس طرح

سامنے آتی رہتی ہیں کہ موصوف کی عبارات و تحریرات کو کما حقہ سمجھنے کا حق ہی ادا نہ ہو  
اگر ان میں پوشیدہ خطرناکی کا نوٹس نہ لیا جائے اسلئے کہنا پڑتا ہے کہ راقم السطور نے  
اقتباس مندرجہ بالا میں پوشیدہ مودودیت (یعنی تربیت خداوندی سے صرف نظر) کا  
سراغ بالکل صحیح طور پر ہی لگایا ہے جسکی تائید "مقدمہ تفہیم" کے مندرجہ ذیل اقتباس سے  
بھی ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں :-

"یہ ایک دعوت و تحریک کی کتاب ہے۔ اس نے آتے ہی ایک  
خاموش طبع اور نیک نہاد انسان کو گوشہ عزلت سے نکال کر خدا سے پھر ہی  
ہوئی دنیا کے مقابلے میں لاکھڑا کیا، باطل کے خلاف اس سے آواز اٹھوائی  
اور وقت کے علمبرداران کفر و فسق و ضلالت سے اسکو لڑوا دیا۔ گھر گھر سے ایک  
ایک سعید روح اور پاکیزہ نفس کو پہنچ کھینچ کر لائی اور داعی حق کے جھنڈے  
تले ان سب کو اکٹھا کیا، گوشہ گوشہ سے ایک ایک فتنہ جو اور فساد پرور  
کو بھر کا کر اٹھایا اور حامیان حق سے انکی جنگ کرائی۔ ایک فرد واحد کی پکار  
سے اپنا کام شروع کر کے خلافت الہیہ کے قیام تک پورے ۲۳ سال تک  
یہی کتاب اس عظیم الشان تحریک کی رہنمائی کرتی رہی اور حق و باطل کی اس  
طویل و جاں گسل کشمکش کے دوران میں ایک ایک منزل اور ایک ایک  
مرحلہ پر اسی نے تخریب کے ڈھنگ اور تعمیر کے نقشے بتائے۔ اب بھلا  
یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ سرے سے نزاع کفر و دین اور معرکہ اسلام و جاہلیت  
کے میدان میں قدم ہی نہ رکھیں اور اس کشمکش کی کسی منزل سے گزرنے  
کا آپ کو اتفاق ہی نہ ہوا ہو اور پھر محض قرآن کے الفاظ پڑھ پڑھ کر اسکی ساری

حقیقتیں آپ کے سامنے بے نقاب ہو جائیں، اسے تو پوری طرح  
 آپ اسی وقت سمجھ سکتے ہیں جب اسے لیکر اٹھیں اور دعوت الی اللہ  
 کا کام شروع کر دیں اور جس طرح یہ کتاب ہدایت دیتی جائے اسی طرح  
 قدم اٹھاتے چلے جائیں۔ تب وہ سارے تجربات آپ کو پیش آئیں گے جو  
 نزول قرآن کے وقت پیش آئے تھے اور حبش و طائف کی منزلیں بھی  
 آپ دیکھیں گے اور بدر و احد سے لیکر حنین اور تبوک تک کے مراحل بھی  
 آپ کے سامنے آئیں گے، ابو جہل اور ابو لہب سے بھی آپ کو واسطہ  
 پڑے گا، منافقین اور یہود بھی آپ کو ملیں گے اور سابقین و مؤخنین  
 (حضرت ابو بکرؓ، حضرت خدیجہؓ، حضرت علیؓ جیسے حضرات) سے لیکر  
 مولفہ القلوب تک سبھی طرح کے انسانی نمونے آپ دیکھ بھی لیں گے، یہ  
 ایک اور قسم کا "سلوک" ہے جس کو میں "سلوک قرآنی" کہتا ہوں اس  
 سلوک کی شان یہ ہے کہ اسکی جس منزل سے آپ گزر جائیں گے قرآن  
 کی کچھ سورتیں اور آیتیں خود آکر آپ کو بتاتی جائیں گی کہ وہ اسی منزل  
 میں اُتر رہی تھیں اور یہ ہدایت لیکر آئی تھیں۔

اسوقت یہ تو ممکن ہے کہ لغت اور نحو و معانی و بیان کے کچھ نکات  
 سالک کی نگاہ سے چھپے رہ جائیں لیکن یہ ممکن نہیں ہے کہ قرآن اپنی  
 دُوح کو اسنے سامنے بے نقاب کرنے سے نکل برت جائے۔

(مقدمہ تفہیم ص ۳۳ و ۳۴)

## یہ زورِ قلم ہے یا قلمِ زور ہے؟

مقدمہ کا یہ طولِ طویل اقتباس جس میں علامہ نے اپنے زورِ قلم اور جادوئے تحریر کی خوب ہی نمائش فرمائی ہے ناظرین کو غور و فکر کی دعوت دیتا ہے اور عدل و انصاف کے فیصلہ کا مطالبہ کرتا ہے۔ کیا اس اقتباس میں وہ بات کھل کر سامنے نہیں آگئی جو اس سے پہلے اقتباس میں کسی قدر پوشیدہ طور پر کہی گئی تھی جس کا تاثر اور ماحصل یہی ہے کہ ابتدائے اسلام میں نبوت و رسالت کی بنیاد پر دعوت و تبلیغ کا جو کام انجام دیا گیا تھا وہ قرآن مجید کے ان ظاہری الفاظ ہی کی بدولت انجام دیا گیا تھا اس میں نہ تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کو کوئی دخل تھا نہ ہی اللہ تعالیٰ کی کوئی نصرت و تربیت شامل حال تھی۔ یہی وجہ ہے کہ موصوف نزولِ قرآن کے تقریباً چودہ سو سال بعد بھی اپنے زمانہ میں مکے اور حبشہ و طائف کی منزلیں بھی دیکھ رہے ہیں بدروخین کے معرکے بھی سر کر رہے ہیں، ابوہل و ابولہب کی شرارتوں اور اذیت کو شیوں سے بھی گزر رہے ہیں، موصوف کو حضرات (ابوبکر و خدیجہ و علی و زید رضی اللہ عنہم جیسے) سابقین اولین بھی مل گئے اور مولفہٗ القلوب بھی (یہ شاید وہ لوگ ہوں گے جو صرف تفصیل زر کی نیت سے وابستہ جماعت ہو جاتے ہوں)۔

## چبھتا ہوا ایک سوال

ناظرین کرام نے ابھی چند سطروں پہلے علامہ کی پر زور صحافت کا ایک

طویل نمونہ ملاحظہ فرمایا ہے، علامہ نے تمثیل کے پردہ میں جو کچھ فرمایا ہے اس پر بھی ضرور غور فرمایا ہوگا؟ علامہ کے اقتباس بالا پر راقم السطور نے بطور تمثیل ہی مختصراً جو تبصرہ اشاروں میں کرنا چاہا ہے امید یہی ہے کہ اس پر کبھی خاطر خواہ توجہ فرمائی گئی ہوگی۔

اسی سلسلہ میں بطور تجربہ و تبصرہ یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ دور نبوت اور دعوت اسلام کے ابتدائی دور کی ساری تمثیلات تو علامہ نے ایک ہی سانس میں دوہرا دیں لیکن اصل صاحب قرآن حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم اور واسطہ نزول قرآن حضرت جبریل علیہ السلام کو اس تمثیل میں بالکل ہی نظر انداز فرما گئے؟

دوسرا ایک قابل غور پھیلتا ہوا سوال یہ ہے کہ ابتدائے دعوت اسلام میں جب کچھ حضرات صحابہ جہشتہ کو ہجرت کر گئے ہیں اور وہاں نجاشی نے ابوسفیان کی شکایت پر تحقیق حال کرنی چاہی ہے تو مجملہ دوسرے سوالات کے اسکا ایک سوال یہ بھی تھا کہ اسلام میں شامل و داخل ہونے کے بعد پھر کوئی اپنے پرانے دین کی طرف واپس بھی لوٹتا ہے یا نہیں جسکا جواب یہ دیا گیا تھا کہ جو کوئی مذہب اسلام میں داخل ہو جاتا ہے وہ پھر اپنے پرانے دین کی طرف نہیں لوٹتا " دور نبوت اور ابتدائے دعوت اسلام کی یہ تصویر و تمثیل علامہ اپنی "دعوت مودودیت کے سلسلے میں پیش کرنے سے کیوں عاجز رہ گئے؟ اور ان کے "سابقین اولین" جو انھیں مکمل اسلام کا لقب دیتے تھے انھیں امیر المومنین مان کر ان سے بیعت بھی ہوئے تھے وہ سب مرتد کیسے ہو گئے؟ "تحریک مودودیت کی یہ تصویر و تمثیل دور نبوت اور آغاز دعوت اسلام سے ناپید کیوں ہے؟ آغاز دعوت اسلام میں ابو بکرؓ و ابو جہل و والگ الگ

شخصیتیں تھیں جو روز اول سے روز آخر تک بالکل الگ ہی رہی ہیں لیکن تحریکِ مودیت میں تو ایک ہی شخصیت روز اول تو ابو بکرؓ بنی اور وہی شخصیت آخر کو ابو جہل بھی بن گئی یہ کیا قصہ ہے؟

## ایک دوسرا اقتباس بھی

”مقدمہ تفہیم“ کے مندرجہ بالا اقتباسات کی روشنی میں ”منصب رسالت“ کی خصوصیت و امتیازی شان جس طرح مجروح ہوتی ہے اور نبی و رسول کے حق میں تربیت خداوندی اور نصرت الہی سے علامہ کی چشم پوشی کھلی آنکھوں نظر آتی ہے اسکی تائید علامہ کی ایک دوسری تحریر سے بھی ہوتی ہے جو موصوف نے اپنی مشہور ویدنامہ تصنیف ”تجدید و احیائے دین“ میں سپرد قلم فرمائی ہے فرماتے ہیں:-

”عقیدہ ظہور ہمدی کے متعلق لوگوں کے تصورات

کچھ اس قسم کے ہیں مگر میں جو کچھ سمجھا ہوں اس سے مجھکو معاملہ بالکل برعکس نظر آتا ہے۔ میرا اندازہ یہ ہے کہ آنے والا اپنے زمانہ میں بالکل جدید طرز کا لیڈر ہوگا۔ وقت کے تمام علوم جدیدہ پر اسکو مجتہدانہ بصیرت ہوگی۔ زندگی کے سارے مسائل ہمہ کو وہ خوب سمجھتا ہوگا۔۔۔۔۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اسکی ہدایتوں کے خلاف مولوی اور صوفی صاحبان ہی سب سے پہلے شورش برپا کریں گے۔۔۔۔۔ نہ میں یہ توقع رکھتا ہوں کہ وہ اپنے ہمدی ہونے کا اعلان کریں بلکہ شاید اسے خود بھی اپنے ہمدی ہونے کی خبر نہ ہوگی



اور اسکی موت کے بعد اسکے کارناموں سے دنیا کو معلوم ہو گا کہ  
یہی تھا وہ خلافت کو منہاج النبوة پر قائم کرنے والا جسکی آمد کا مردہ  
سنا یا گیا تھا جیسا کہ میں پہلے اشارہ کر چکا ہوں۔ بنی کے سوا کسی کا یہ  
منصب نہیں ہے کہ دعوے سے کام کا آغاز کرے اور نہ بنی کے  
سوا کسی کو یہ یقینی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس خدمت پر مامور ہے  
ہدیت دعویٰ کرنے کی چیز نہیں ہے کہ کے دکھانے کی چیز ہے  
اس قسم کے دعوے جو لوگ کرتے ہیں اور جو ان پر ایمان لاتے ہیں  
میرے نزدیک دونوں اپنے علم کی کمی اور ذہن کی پستی کا ثبوت  
دیتے ہیں — مجھے اسکے کام میں خوارق، کشف و الہامات  
اور چلوں اور مجاہدوں کی کوئی جگہ نظر نہیں آتی میں یہ سمجھتا ہوں کہ  
انقلابی لیڈر کو دنیا میں جس طرح شدید جدوجہد اور کشمکش کے مرحلوں  
سے گذرنا پڑتا ہے انھیں مرحلوں سے ہمدی کو بھی گزرنا ہو گا۔ وہ  
خالص اسلام کی بنیادوں پر ایک نیا مذہب فکر (SCHOOL  
OF THOUGHT) پیدا کرے گا ذہنیوں کو بدلے گا۔ ایک زبردست  
تحریک اٹھائے گا جو بیک وقت تہذیبی بھی ہوگی اور سیاسی بھی  
جاہلیت اپنی تمام طاقتوں کے ساتھ اسکو کچلنے کی کوشش کرے گی  
مگر بالآخر وہ جاہل اقتدار کو الٹ کر پھینک دیگا اور ایک بردست  
اسلامی اسٹیٹ قائم کرے گا جس میں ایک طرف اسلام کی پوری روح  
کار فرما ہوگی اور دوسری طرف سائنٹفک ترقی اور کمال پڑھیں

جائیگی (تجدیدِ احیائے دین بحوالہ جماعت اسلامی کا شیش محل)

## دونوں جگہ علامہ کے تیسرا ایک ہی نظر آ رہے ہیں

”مقدمہ تفہیم“ میں جو تصویر علامہ نے ”داعی الی اللہ“ کی کھینچی ہے اور جس طرح ہدایات قرآنی پر عمل پیرا ہونے والے ہر انسان کیلئے اسکی گنجائش رکھی ہے کہ وہ جب چاہے اپنی دعوت کے ذریعہ دور اسلام کی وہ تاریخ دہرا سکتا ہے جو نزول قرآن کے وقت خود حضور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم پر گزری تھی۔ اس اقتباس مندرجہ بالا میں علامہ نے حضرت ہمدی علیہ الرحمہ کی کھلی وہی تصویر کھینچی ہے بلکہ دستگیری رب اور تربیت حق کے درپردہ انکار کی جو بات مقدمہ تفہیم میں اشارۃ النہی اور اقتضار النہی کے طور پر ارشاد فرمائی گئی تھی وہ تجدید و احیائے دین میں حضرت ہمدی کا ذکر فرماتے ہوئے صاف و صریح طور پر عبارتۃ النہی کے طور پر فرمادی گئی کہ:-

”مجھے اس کام میں کرامات و خوارق، کشف و الہامات اور

چلوں اور مجاہدوں کی کوئی جگہ نظر نہیں آتی“

## مقطع میں آپرٹی ہے سخن گسترانہ بات

تجدید و احیائے دین میں حضرت ہمدی سے متعلق علامہ کے ارشادات مدلول سے موضوع بحث اور معرکہ آرا بنے رہے علامہ کے بعض متاثرین اسکی وجہ سے انکار ہمدی کی طرف مائل ہوئے گئے اور بہت سے ناقدین نے ان عبارات کے بنی اسلوب

یہ پڑھا کہ علامہ درپردہ ہمدی بننے کا خواب دیکھنے میں مبتلا ہیں اور اب اعلان کیا ہی چاہتے ہیں بلکہ بعض بزرگوں نے تو اس قسم کی بات بھی فرمادی کہ لوگوں نے اعتراض کر کے اور شور و غوغا کر کے علامہ کو چوکنا کر دیا ورنہ وہ بالکل ہی تیار ہو گئے تھے کہ ”ہمدویت“ کا اعلان فرمادیں لیکن راقم السطور کا خیال ہے کہ علامہ اپنے سے پیشرو و علاموں کا مشترکہ پیچھے ہیں ایک علامہ قادیانی دوسرے علامہ مشرقی اسلئے اب وہ اس غلطی کو ہرگز نہ دہرائیں گے وہ خود نہ کوئی دعویٰ کریں گے نہ اعلان انھیں جو کچھ کرنا تھا وہ کر چکے اب اس قسم کے اعلان کا کام ان کی امت ہی کو کرنا ہے۔ وہ اس سلسلہ میں پوری صفائی پیش بندی اور منصوبہ بندی اپنے اسی مضمون میں پہلے ہی فرما چکے ہیں جس کا طول طویل اقتباس نقل بھی ہو چکا ہے چند فقرے مکرر ملاحظہ ہوں :-

”مجھے اندیشہ ہے کہ اسکی جدتوں کے خلاف مولوی اور صوفی صاحبان ہی سب سے پہلے شورش برپا کریں گے — نہ میں یہ توقع رکھتا ہوں کہ وہ اپنے ہمدی ہونے کا اعلان کرے گا — اسکی موت کے بعد اسکے کارناموں سے دنیا کو معلوم ہوگا کہ یہی تھا خلافت کو منہاج النبوة پر قائم کرنے والا جس کی آمد کا مشرودہ سنایا گیا تھا“

ظاہر ہے کہ دوسروں کی جانب سے اس قسم کے اعلان کا ذمہ دار موصوف کو قرار دینا یقیناً غیر معقول ہی ہوگا موصوف نے تو ”بقید ہوش و حواس“ اپنے آپکو دعویٰ کی تہمت سے بچائے رکھنے کی کوشش فرمائی ہے کہ :-

”ہمدویت دعویٰ کرنے کی چیز نہیں کر کے دکھانے کی چیز ہے“  
 کرنے والے نے تو اپنا کام کر کے دکھا دیا اب جسے جو دعویٰ کرنا ہو کرتا رہے  
 موصوف نے تو اپنے آپ کو صاف بچا لیا ہے۔

## ابتدائی ہدایات کا دوسرا نمبر، ایہام در ایہام

دعوت کے ابتدائی مرحلہ میں جو تین ہدایات علامہ نے متعین فرمائی ہیں  
 ان کے پہلے نمبر پر کلام سطور بالا میں بڑی تفصیل سے ہو چکا ہے اب ان ابتدائی  
 ہدایات کا دوسرا نمبر بکلی ملاحظہ ہو:-

(۲) ”حقیقت نفس الامری کے متعلق ابتدائی معلومات اور حقیقت

کے بارے میں ان غلط فہمیوں کی تجل ترویج جو گرد و پیش کے لوگوں

میں پائی جاتی تھیں جنکی وجہ سے انکار وہ غلط ہو رہا تھا“ (مقدمہ ص ۲)

عربی کے قدیم مدارس میں درسیات کی بعض پرانی مشہور کتابوں (مثلاً

کنز و کافیہ اور سلم العلوم و سلم الثبوت وغیرہ) کی ایجاد نویسی اور ہستیاں نگاری تو

ان مدارس میں مشہور ہے مگر یہ انکشاف ناظرین کیلئے شاید بالکل ہی نیا اور ناقابل

یقین ہو گا کہ علامہ مودودی جیسا فاضل اکل اور ہر فن مولیٰ رئیس التحریر و امیر الصفت

شخص بھی ایسی چیتانی تحریر پر قادر ہے۔ موصوف کی عبارت کو بار بار پڑھیے اور پوری

کوشش کیجئے کہ موصوف کا سرشتہ مفہون ہاتھ لگ جائے آپ اپنی اس کوشش میں شاید ہی کامیاب ہو سکیں

آگہی دام شنیدن لاکھ گو چاہے بچھائے

مدعا غنقا ہے اس کے عالم تقسیر کا

عبارت مندرجہ بالا کا ایسا صاف اور واضح مفہوم ہے ہر ناظر آسانی سمجھ لے متعین نہیں ہوتا کہ آخر علامہ اس موقع پر کیا کہنا چاہتے ہیں؟ کیونکہ اہل علم اور اصحابِ دین تو جانتے ہی ہیں کہ "حقیقت نفس الامری" کوئی مفہوم حقیقی تو ہے نہیں بلکہ ایک مفہوم اضافی ہے۔ ہر شے کی "حقیقت نفس الامری" علیحدہ علیحدہ ہو سکتی ہے اور ہوتی ہی ہے۔ لہذا یہ تہ کیسے چلے کہ نزولِ قرآن اور دعوتِ اسلام کے پہلے مرحلہ میں کس چیز کی "حقیقت نفس الامری" سے متعلق معلومات حضورِ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کو ہم پہنچائی گئی تھیں؟ علامہ کی اس تحریر مندرجہ بالا سے اس امر کی وضاحت و تعیین بالکل ہی نہیں ہوتی اور نہ ہی علامہ نے ازراہِ بے نیازی کسی مثال کے ذریعہ اسکی تفہیم و تشریح ضروری ہی سمجھی اور ضروری بھی کیوں سمجھتے انھیں "تفہیم قرآن" مقصود ہی کب ہے؟ جو مقصود ہے وہ حاصل ہو ہی رہا ہے۔

الغرض علامہ کی مندرجہ بالا عبارت کو دیکھ کر یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ عبارت مصنفِ تفہیم علامہ مودودی کی ہے یا کسی انارڈمی نے صدرِ دانشمندانہ یا سلم العلوم اور مسلم الثبوت کی کسی عبارت کا صرف لفظی ترجمہ کر کے چھوڑ دیا ہے۔ اس میں مطلب ڈالنا بھی باقی ہے فانتظروا انی معکم من المنتظرین۔

## ابتدائی ہدایات کا تیسرا نمبر

موصوف نے اس نمبر میں ارشاد فرمایا ہے :-

"صحیح رویہ کی طرف دعوت و ہدایت الہی کے ان بنیادی اصول اخلاق کا بیان جنکی پیروی میں انسان کیلئے فلاح و سعادت ہوگا (۲۱)

اس نمبر میں علامہ نے جو کچھ ارشاد فرمایا ہے اس پر کسی حد تک تبصرہ گذشتہ صفحات میں گذر چکا ہے۔ مزید ایک بات یہاں یہ کہنی ہے کہ غور کرنے سے حقیقت یہی سمجھ میں آتی ہے کہ علامہ کے نزدیک عقائد اور عبادات کی کوئی اہمیت ہے ہی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فہم قرآن کیلئے راہیں کھولنے کی کوشش میں عقائد و عبادات پر مطلق روشنی نہیں ڈالتے۔

اس موقع پر شاید کوئی صاحب علامہ کی وکالت میں یہ فرمانا چاہیں کہ موصوف قرآن مجید کی ابتدائی ہدایات ہی تو بیان فرما رہے ہیں اس وقت تک عقائد و عبادات سے متعلق ہدایات شاید نازل ہی نہ ہوئی ہوں تو انکا ذکر کیسے کر دیا جائے لیکن جیسا کہ راقم السطور گذشتہ صفحات میں ابتدائی پانچ سورتوں کی ابتدائی تعلیمات کا ایک سرسری خاکہ پیش کر کے واضح کر دیا ہے کہ ان ابتدائی تعلیمات و ہدایات میں عقائد و عبادات کی بھی تعلیم و تلقین موجود ہے لیکن علامہ نے چونکہ اپنے نزدیک ان سے صرف نظر فرمانے اور چشم پوشی ہی کرنے کا فیصلہ فرما رکھا ہے اسلئے انھیں اگر دعوت اسلام کے ابتدائی مرحلہ میں عقائد و عبادات کی تسلیم نظر نہ آسکی تو کوئی محل تعجب نہیں ہے۔ موصوف تو دوسرے انبیاء کرام علیہم السلام کے مشن کو بھی اسی طرح تعبیر فرما چکے ہیں، ملاحظہ ہو فرماتے ہیں:-

”اسی تہذیب و تمدن کو دنیا میں قائم کرنے کیلئے انبیاء علیہم السلام

پے درپے بھیجے گئے تھے (تجدید اعیان دین ص ۲۱)

## قرآنی اسلوب

علامہ مودودی نے اپنے مقدمہ تفہیم میں ”قرآن فہمی“ کی رکارڈوں کا جائزہ



لیتے ہوئے یہ بحث بھی چھیڑی ہے کہ قرآن کا اسلوب بیان تحریری نہیں تقریری ہے اور چونکہ سابق مترجمین و مفسرین اس حقیقت تک نہیں پہنچ سکے اسلئے وہ حضرات اپنے تراجم میں نہ تو ہر دو اسلوبوں کا باہمی فرق ہی ملحوظ رکھ سکے اور نہ اس کے تقریری اسلوب کو تحریری اسلوب میں تبدیل ہی کر سکے۔ اسی وجہ سے ان حضرات کے تراجم میں صلاحت تفہیم پیدا ہی نہیں ہوئی اور بدرجہ مجبوری عوام کی تشنگی بجھانے کیلئے ”تفہیم القرآن“ کے ذریعہ قرآن مجید کی ترجمانی کرنی پڑی۔

موصوف نے یہ بحث اپنے تفسیری دیباچہ میں بھی چھیڑی ہے بلکہ سچ پوچھئے تو اس موضوع پر دیباچہ ہی میں زیادہ تفصیلی طور پر گفتگو فرمائی ہے اس لئے ہم بھی اس موقع پر پہلے دیباچہ ہی کا ایک اقتباس پیش کرتے ہیں ملاحظہ ہو:-

”یہ تو سب کو معلوم ہے کہ قرآن مجید ابتداءً لکھے ہوئے رسالوں کی شکل میں شائع نہیں کیا گیا تھا بلکہ ”دعوت اسلامی“ کے سلسلے میں حسب موقع و ضرورت ”ایک تقریر“ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیجاتی تھی اور آپ اسے ”خطبہ“ کی شکل میں لوگوں کو سنا دیتے تھے (دیباچہ تفہیم ص ۷)

## دکھپٹ خوش فہمی اور دلفریب متعالفہ

علامہ کی بظاہر ”سادہ اور معصوم“ سی اس عبارت پر یہ سرخی اور یہ رویا کہ شاید آپ کو بر محل نظر آئے اس لئے میں آپ کی توجہ مقدمہ تفہیم کے آغاز میں آئے ہوئے علامہ کے اسی دفع و قبل کی طرف مبذول کرنا چاہوں گا جہاں موصوف کو

اپنے ناظرین سے یا تو ایسی بدگمانی تھی کہ انھوں نے بڑی آسانی سے یہ فرض فرمایا تھا کہ کہیں ان کے ناظرین "مقدمہ" کا صرف عنوان ہی دیکھ کر اسے قرآن کا مقدمہ نہ سمجھ لیں اور یا وہی علامہ اس موقع پر اپنے انھیں ناظرین سے یہ خوش فہمی بھی رکھتے ہیں کہ وہ اپنے ناظرین کو اپنی ہی جیسی علمی سطح پر دیکھ رہے ہیں اور یہ خیال فرما رہے ہیں کہ اسلوب قرآنی سے متعلق ان کے نظریہ کی جو بنیاد ہے وہ انکی ہی طرح دوسرے تمام ناظرین کو بھی معلوم ہی ہے۔ دیکھئے ناموصوف کس سادگی سے ارشاد فرما رہے ہیں "یہ تو سب کو معلوم ہے کہ قرآن مجید ابتداءً لکھے ہوئے رسالوں کی شکل میں شائع نہیں کیا گیا تھا" داد دیجئے موصوف کی اس صحافت کو کس چھوٹے انداز میں اسلوب قرآنی کا تقریری ہونا اور تحریری نہ ہونا ثابت فرما دیا ہے۔ ع

"لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں"۔

## بسیار شیوہ راست پٹاں را

علامہ کی صحافتی چابکدستی نہیں تو اور کیا ہے کہ قرآن مجید جو ابتداءً رسالوں کی شکل میں محض اسوجہ سے شائع نہیں ہو سکا تھا کہ اس دور میں کتابت و اشاعت کے ذرائع و اسباب اور سہولتیں موجود ہی نہ تھیں اس تمدنی بے سامانی اور قلت اسباب و وسائل سے فائدہ اٹھاتے ہوئے علامہ اسے کیا رنگ دیکر پیش فرما رہے ہیں اور اس دور کی علمی بے سروسامانی کی بنیاد پر کس طرح ایک غیر معقول اور خلاف عقل نظریہ کو جنم دے رہے ہیں۔

راقم السطور کو کہنا یہ ہے کہ علامہ کے نزدیک کسی معقول اور تاریخی ثبوت

کی بنیاد پر یا بغیر ثبوت ہی سہی (کہ موصوف تو شاید اپنے آپ کو ہم لوگوں کی طرح کسی نقل و حال یا دلیل و ثبوت کا محتاج نہیں سمجھتے) بالفرض یہ بات طے تھی کہ قرآن مجید کا طرز تحریری نہیں بلکہ تقریری ہے تو شوق سے اسکا اظہار فرماتے اور پھر اس بنیاد پر کچھ فرمایا جاتے تو وہ بھی فرمادیتے لیکن یہ موصوف کی صریح جرات اور زبردستی ہے کہ وہ محض قرآن مجید کے رسالوں کی شکل میں ابتداءً شایع نہ ہو سکتے ہی کو اسلوب قرآنی تقریری ہونے کی بنیاد قرار دیکر اس پر اپنی تحقیق انیت کا شیش محل تعمیر فرمادیں اور جب اس پر تبصرہ کیا جائے تو شیش محل کے تماشائی موصوف کے محل کے چکنا چور ہونے کی دہائی دینے لگیں۔ ع۔ جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہوگا۔

### مگر آپ کو تعجب ہوگا

علامہ مودودی قرآن مجید کے متعلق اس کے تقریری ہونے کا جو انکشاف فرما رہے ہیں اور اپنے ناظرین کو بجلی اپنی سطح پر سمجھتے ہوئے اس انکشاف سے واقف و باخبر قرار دے رہے ہیں وہ انکشاف عام لوگوں کو تو کیا ہوتا استاد علمائے ہند حضرت شاہ ولی اللہ صاحب علیہ الرحمہ بھی شاید اس انکشاف سے باخبر نہ تھے۔ چنانچہ حضرت شاہ صاحب موصوف اصول تفسیر کی اپنی مشہور کتاب الفوز البکیر میں تحریر فرماتے ہیں ملاحظہ ہو الفوز البکیر ص ۳۴ تا ۴۲ ذیل میں ہم ازراہ اختصار صرف مطلب نیز ترجمہ ہی پر اکتفا کرتے ہیں :-

”تیسرا باب قرآن مجید کے اسلوب سے متعلق ہے جسے ہم تین فصلوں میں بیان کرتے ہیں :-

پہلی فصل: ”قرآن مجید“ ابواب و فصول پر منقسم نہیں ہے کہ ہر مسئلہ کو کسی متعین باب یا فصل میں تلاش کیا جائے بلکہ تفہیم حقیقت کے لئے بطور فرض مثالیوں کہا جاسکتا ہے کہ یہ قرآن مجید شاہی فرامین و مکاتیب کا مجموعہ ہے، جس طرح شاہان جہاں حسب موقع و ضرورت اپنی رعایا کیلئے شاہی فرامین جاری فرماتے ہیں کسی موقع پر کوئی فرمان اور کسی دوسرے موقع پر کوئی دوسرا فرمان تحریر فرماتے ہیں اور اسی طرح جب بہت سے فرامین اور مکاتیب جمع ہو جاتے ہیں تو کوئی شخص انہیں بدون ترتیب کے باقاعدہ ایک مرتب مجموعہ تیار کر دیتا ہے۔ بالکل اسی طرح شہنشاہ مطلق خداوند عالم نے اپنے بندوں کی ہدایت کیلئے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر حسب موقع و ضرورت (جس کا علم خداوند تعالیٰ کو پہلے ہی سے تھا) یکے بعد دیگرے ایک سورۃ پھر دوسری سورۃ نازل فرمائی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ تک تمام سورتیں علیحدہ علیحدہ ہی محفوظ رہیں انہیں ایک ”مجلد“ میں یکجا نہیں کیا گیا۔ پھر حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے زمانہ میں اس ترتیب خاص کے ساتھ یکجا مجلد کیا گیا۔ (پندرہ سطروں کے بعد فرماتے ہیں) چونکہ ان سورتوں کے اسلوب بیان اور شاہی فرامین کے اسلوب بیان میں پوری پوری یکسانیت بھی پائی جاتی ہے اسلئے ان سورتوں کے آغاز و اختتام میں بھی انہیں ”شاہی فرامین“ کا انداز ملحوظ رکھا گیا ہے ” (الفور الجبر ص ۳۴)

اس کے بعد حضرت شاہ صاحب علیہ الرحمہ نے قرآن مجید کی مختلف و متعدد سورتوں کی ابتدائی و آخری آیات کو بطور نمونہ پیش کرتے ہوئے شاہی فرامین سے انہی بچانیت و مطابقت ظاہر فرمائی ہے جسے انشاء اللہ تعالیٰ ہم بھی آئندہ قریب ہی نقل کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

فی الحال ہم یہی مناسب سمجھتے ہیں کہ اس موضوع سے متعلق علامہ کے کچھ ارشادات اور پیش کردیے جائیں کہ ہمارے ناظرین کو اچھی طرح یہ اندازہ ہو جائے کہ موصوف کو اپنی اس رائے پر کتنا اصرار ہے۔ اسی ”دیباچہ تفہیم“ کے ص ۹ پر تحریر فرماتے ہیں

(الف) ”علاوہ بریں جیسا کہ میں ابھی اشارۃً عرض کر چکا ہوں (اشارہ کو شاید ناکافی سمجھتے ہوئے اب صراحتاً فرمانا چاہتے ہیں) قرآن مجید کی ہر سورۃ دراصل ایک تقریر تھی جو دعوت اسلامی کے کسی مرحلے میں ایک خاص موقع پر نازل ہوئی تھی“ (دیباچہ ص ۹)

(ب) ”اس طویل اور شدید کشمکش کے دوران اللہ تعالیٰ حرب موقع اور حرب ضرورت اپنے نبیؐ پر ایسے ”پرجوش خطبے“ نازل کرتا رہا جنہیں دریا کی سی روانی، سیلاب کی سی قوت اور تیز و تند آگ کی سی تاثیر تھی (مقدمہ تفہیم ص ۲۳)

**صرف دعویٰ ہی دعویٰ**

علامہ کو خدا جانے کیسے یہ گمان پیدا ہو گیا ہے کہ جو کچھ جی میں آئے وہ بے جھجک

فرماتے چلے جائیں ان کے کسی دعویٰ پر کوئی دلیل و برہان طلب کرنا والا نہیں ہے  
جیسے کسی نے ان سے کہہ دیا ہو۔ صر۔ آپ جو کہتے ہیں علامہ بجا کہتے ہیں۔

اسی غلط فہمی کا نتیجہ ہے کہ وہ اپنی تفہیم القرآن اور اسکے دیباچہ و مقدمہ  
میں بھی جگہ جگہ صرف دعویٰ ہی دعویٰ کرتے چلے جاتے ہیں اپنے کسی دعویٰ کی دلیل  
اور اپنی کسی بات کی مثال پیش کرنے کی ضرورت وہ بالکل نہیں محسوس فرماتے۔ بلکہ  
ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے وہ اس قسم کی علمی و صحافتی پابندیوں کو اپنے مقام تحقیق  
کے خلاف اور اپنے مرتبہ بلند سے فرد تر سمجھتے ہوں۔

موصوف کو چاہیے تھا کہ اسلوب قرآنی سے متعلق جب وہ ایسا چونکا دینے والا  
دعویٰ اور انکشاف فرماتے تو اسکی کچھ مثالیں بھی دیدیتے تاکہ جس سے ان کے دعویٰ میں  
کچھ تواستحکام پیدا ہو جاتا اور انکی یہ بات کسی درجہ بھی تو قابل تسلیم ہو جاتی۔ اب اگر کوئی  
شخص دیباچہ تفہیم کی عبارت منقولہ بالا (شت الف) کو دیکھ کر موصوف کے اس دعویٰ  
کو کہ قرآن مجید کی ہر سورت ایک تقریر تھی (کسی مثال و دلیل کے ذریعہ ثابت و مستحکم  
دیکھنا چاہے اور اصل کیفیت نزول اور ترتیب نزول کے مطابق اس دعویٰ کی  
واقعیت کو پرکھنا چاہے تو ہمیں مطلق یقین نہیں کہ ہمارے علامہ اپنے اس دعویٰ کو  
میزان حقیقت پر پورا اتار سکیں گے اور کسی بھی طرح یہ خلاف حقیقت بات ثابت  
کر سکیں گے کہ قرآن مجید کی ہر سورۃ دراصل ایک تقریر تھی۔

ایسی صورت میں جبکہ موصوف کا یہ انکشاف صرف انکی ذہنی و خیالی  
اتج اور یہ دعویٰ صرف دعویٰ ہی دعویٰ ہو تو کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ علامہ مودودی  
اپنے مطالعہ قرآن اور تعمق مطالعہ کی جتنی نمائش فرماتے ہیں اصل حقیقت اتنی نہیں ہے

## یہ تضاد بیانی ملاحظہ

علامہ موصوف جو اپنے دیباچہ و مقدمہ میں اشارتاً و صراحتاً یہ دعویٰ فرما چکے تھے کہ ”قرآن مجید کی ہر سورت ایک تقریر تھی“ آگے چل کر اپنی تفسیر و تفہیم میں اپنا سارا منصوبہ و دعویٰ فراموش فرما جاتے ہیں چنانچہ ہم علامہ کی اسی تفہیم سے چند اقتباسات ایسے بھی پیش کرنے جا رہے ہیں جس میں علامہ اپنے سابق دعویٰ کے برخلاف یہ ارشاد فرماتے نظر آ رہے ہیں کہ فلاں فلاں سورتیں مختلف اوقات کی متعدد تقریروں پر مشتمل ہیں گویا موصوف ہر سورہ کے ایک تقریر ہونے کے دعویٰ سے خود ہی دستبردار ہو گئے ہیں یہ چند مثالیں ملاحظہ ہوں :-

(مثال ۱) سورہ بقرہ کے زمانہ نزول سے بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں  
 ”اس سورہ کا بیشتر حصہ ہجرت مدینہ کے بعد مدنی زندگی کے بالکل ابتدائی دور میں نازل ہوا اور اکثر حصہ ایسا ہے جو بعد میں نازل ہوا اور مناسبت مضمون کے لحاظ سے اس میں شامل کر دیا گیا، حتیٰ کہ سورہ کی ممانعت کے سلسلہ میں جو آیات نازل ہوئی ہیں وہ بھی اس میں شامل ہیں حالانکہ وہ (آیات ربوہ) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے بالکل آخری زمانہ میں اتری تھیں۔ سورہ کا خاتمہ جن آیات پر ہے وہ ہجرت سے پہلے مکہ میں نازل ہو چکی تھیں مگر مضمون کی مناسبت سے انکو بھی اسی سورہ میں ضم کر دیا گیا ہے“ (تفہیم جلد اول ص ۴۶)

(مثال ۲) سورہ آل عمران کے نزول اور اجزائے مضمون پر روشنی



ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں :-

”اس میں چار تقریریں شامل ہیں (۱) پہلی تقریر آغازِ سورت سے چوتھے رکوع کی ابتدائی آیتوں تک ہے (۲) دوسری تقریر آیت ۱ ان الله اصطفى آدم ونوحا (الایہ) سے شروع ہوتی ہے اور چھٹے رکوع کے اختتام پر ختم ہوتی ہے یہ سہ میں وفدِ نجران کی آمد کے موقع پر نازل ہوئی (۳) تیسری تقریر ساتویں رکوع کے آغاز سے لیکر بارہویں رکوع کے اختتام تک چلتی ہو اسکا زمانہ پہلی تقریر سے متصل ہی معلوم ہوتا ہے (۴) چوتھی تقریر تیرہویں رکوع سے ختم سورۃ تک جنگِ احد کے بعد نازل ہوئی“  
(تفہیم ص ۲۲۸ جلد اول)

(مثال ۳) سورۃ نسا کا زمانہ نزول اور مضمون بیان فرماتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں :-

”یہ سورت متعدد خطبوں پر مشتمل ہے جو غالباً سہ کے اواخر سے لیکر سہ کے اواخر یا سہ کے اوائل تک مختلف اوقات میں نازل ہوئی ہیں اگرچہ یہ تعیین کرنا مشکل ہے کہ کس مقام سے کس مقام تک کی آیات ایک سلسلہ تقریریں نازل ہوئی تھیں اور انکا ٹھیک زمانہ نزول کیا ہے؟“ (تفہیم جلد اول ص ۳۱۶)  
(مثال ۴) سورہ توبہ کے زمانہ نزول اور اجزائے سورہ کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں :-

”یہ سورہ تین تقریروں پر مشتمل ہے۔ پہلی تقریر آغاز سورہ سے  
سے پانچویں رکوع کے آخر تک چلتی ہے۔ دوسری تقریر رکوع ۶  
کی ابتدا سے رکوع ۹ کے اختتام تک چلتی ہے، تیسری تقریر رکوع ۱۰  
سے شروع ہو کر سورت کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے۔

اس میں متعدد ذکرے ایسے بھی ہیں جو انھیں ایام میں مختلف  
مواقع پر اترے اور بعد میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد الہی سے  
ان سب کو یکجا کر کے ایک سلسلہ تقریریں منسلک کر دیا مگر چونکہ وہ  
ایک ہی مضمون اور ایک ہی سلسلہ واقعات سے متعلق ہیں اسلئے ربط  
میں کہیں خلل نہیں پایا جاتا“ (تفہیم جلد ۲)

مندرجہ بالا چار مثالیں تفہیم القرآن کی پہلی دو جلدوں ہی سے پیش کر دی گئیں ہیں تاہم  
ملاحظہ فرمائیں کہ ہر سورت کو ایک تقریر پر ارشاد فرمانے والے علامہ نے آغاز دعوت اور ترتیب  
نزدل قرآن کا جو منصوبہ صرف اپنے دماغ کے بل بوتے پر تیار فرمایا تھا حقائق و واقعات کے  
عالم میں وہ کس طرح بے حقیقت ثابت ہوا اور موصوف کو دبی زبان میں اپنے سابق موقف کو  
چھوڑ دینے ہی میں عافیت نظر آئی اور کیسی خاموشی کے ساتھ موصوف نے مندرجہ بالا سورتوں  
کو ایک ایک تقریر کی بجائے ”متعدد تقریروں کا مجموعہ تسلیم فرمایا۔

(مثال ۷) (اب تفہیم کی پہلی جلد سے ایک مثال ایسی بھی ملاحظہ فرمائیے)

جمعیں موصوف سورہ مائدہ (جو پورے ایک پارہ کی سورت) سے متعلق  
ایک تقریر ہونے کا دعویٰ تو فرماتے ہیں مگر ساتھ ساتھ یہ امکان بھی تسلیم  
فرمالتے ہیں کہ ہو سکتا ہے یہ سورہ ”پورا ایک خطبہ“ نہ ہو۔ فرماتے ہیں :-

”بیان کے تسلسل سے غالب گمان یہی ہوتا ہے کہ یہ پوری سورہ ایک ہی خطبہ ہے جو بیک وقت نازل ہوا ہوگا ہو سکتا ہے کہ متفرق طور پر اسکی بعض آیتیں بعد میں نازل ہوئی ہوں اور مضمون کی مناسبت سے انکو اس سورت میں مختلف مقامات پر پیوست کر دیا گیا ہو، لیکن سلسلہ بیان میں کہیں کوئی خفیف سا خلا بھی محسوس نہیں ہوتا جس سے یہ قیاس کیا جاسکے کہ یہ سورہ دو یا تین خطبوں کا مجموعہ ہے“  
(تفہیم القرآن جلد اول ص ۴۳۴)

## یہ سیما پ و شئی کیسی؟

ناظرین کرام علامہ مودودی کے وہ ارشادات یقیناً ابھی بھولے نہ ہوں گے جو موصوف نے قرآن مجید کی تصنیفی ترتیب ”اور کتابی اسلوب“ وغیرہ سے متعلق فرمائے تھے اور کس ہمت و جرات کے ساتھ اسے غیر مربوط اور غیر مرتب کلام اور مختلف شذرات کا مجموعہ بھی قرار دے چکے تھے اور اب ان مندرجہ بالا ارشادات میں جبکہ قرآن مجید کی ہر سورہ کو ”ایک تقریر“ کہنے کا مرحلہ پیش آگیا تو کس صفائی اور سلیقہ دہی کے ساتھ سورہ مائدہ کو دو تین خطبوں اور تقریروں کا مجموعہ مانتے ہوئے بھی اس میں کسی قسم کے خلا اور جھول کا وجود بھی ان کے نزدیک ممکن نہیں ہے

## پائے استدلالیاں چوبیس پود

حضرت مولانا روم علیہ الرحمہ نے کیسی عمدہ بات اس شعر میں بیان فرمائی ہے

مستوفی حضرات کی ٹانگیں چوبیس (بکڑی کی) ہوتی ہیں اور ظاہر ہے کہ بکڑی کے پاؤں ثبات اور جماد نہیں رکھتے۔ حضرت مولانا رومؒ کی بیان فرمودہ یہ حقیقت علامہ کی تفہیم میں بار بار مشاہدہ میں آتی ہے

اوپر دی ہوئی پانچ مثالوں میں سے مثال ۴ میں خط کشیدہ فقرہ پر غور فرمائیے علامہ کے ارشادات کے آس پاس بھی اس حقیقت کا سایہ بھی آپ کو نظر نہ آسکے گا کہ اصل قرآن مجید ازل سے ہی اپنی اسی موجودہ ترتیب و شکل میں لوح محفوظ میں مکتوب تھا، اللہ تعالیٰ کو آیات قرآنی اچانک بغیر کسی منصوبے کے نازل نہیں کرنی پڑ گئی تھیں کہ ان میں سلسلہ مضامین یا ربط آیات کے خلل پذیر ہونے کا شبہ بھی کیا جاسکے لیکن علامہ کے ارشادات کا خلاصہ صرف یہ ہے کہ "ہو سکتا ہے کہ متفرق طور پر اسکی بعض آیتیں بعد میں نازل ہوئی ہوں اور مضمون کی مناسبت سے انکو اس سورہ میں مختلف مقامات پر پیوست کر دیا گیا ہو لیکن سلسلہ بیان میں کہیں کوئی خفیت سا خلا بھی محسوس نہیں ہوتا جس سے یہ قیاس کیا جاسکے کہ یہ سورہ دو یا تین خطبوں کا مجموعہ ہے" — گویا علامہ "خلا" اور "بے ربطی" کی نفی صرف اتفاقی طور پر تسلیم فرما رہے ہیں اس میں ارادۃ الہی کا دخل مطلق نہیں ہے۔

## مجھے احساس ہے کہ

ابھی تو مقدمہ تفہیم ہی زیر تبصرہ ہے اس موقع پر علامہ کی اصل تفہیم القرآن پر تبصرہ اور اسکے اغلاط پر کوئی کلام قبل از وقت ہو جائے گا اس لئے اصل تفہیم پر تبصرہ کو درست طریقہ کرتے ہوئے پھر علامہ کے مقدمہ ہی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

جو تکہ قرآنی سورتوں کے اسلوب اور شاہی فرامین کے انداز و اسلوب میں پوری پوری مناسبت دیکھانیت پائی جاتی ہے اسی وجہ سے قرآنی سورتوں کی ابتداء و انتہاء میں بھی شاہی فرمانوں کی ابتداء و انتہاء کا وہی انداز پایا جاتا ہے۔

Scanned with CamScanner

کیا جاتا ہے اور خود حضور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی صلح حدیبیہ کے موقع پر جو معاہدہ نامہ املا کرایا تھا اسکی ابتداء بھی اسی متعارف انداز میں کی گئی تھی۔ یعنی

هَذَا مَا قَضَىٰ عَلَيْهِ هَجْدٌ (صلی اللہ علیہ وسلم)

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے بعض سورتیں مرسل و مرسل الیہ کے ذکر سے شروع فرمائی ہیں مثلاً تَنْزِيلُ الْكِتَابِ مِنَ اللَّهِ الْعَزِيزِ الْحَكِيمِ كِتَابُ الْحِكْمَةِ آيَاتُهُ ثُمَّ فَصَّلَتْ مِنْ كَدِّ حِكِيمٍ خَبِيرٍ ان سورتوں کا یہ انداز اس قسم کے شاہی فرامین و احکام سے مشابہت رکھتا ہے جن میں کوئی حکم جاری کرتے ہوئے آغاز حکم میں یوں لکھا جاتا ہے کہ ”دور بار خلافت سے فرمان جاری کیا جاتا ہے“ یا اس طرح کہ ”فلاں شہر کے باشندوں کو دور بار خلافت سے آگاہی دی جاتی ہے“ خبردار کیا جاتا ہے، اور خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی متعدد سلاطین کو دعوت اسلام کے سلسلے میں جو والانامے روانہ فرمائے تھے وہ بھی اسی اسلوب ہی کے مطابق تھے۔ مثلاً من محمد رسول الله الى هرقل عظيم الروم (حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کی جانب سے روم کی عظیم شخصیت ہرقل کے نام)۔

اور قرآن مجید کی بعض سورتوں میں رقعات شفات کا انداز اختیار فرماتے ہوئے بغیر سرنامہ و عنوان براہ راست اصل مضمون ہی سے سورہ شروع کر دی گئی ہے مثلاً قَدْ سَمِعَ اللَّهُ قَوْلَ الَّتِي تُجَادِلُكَ فِي زَوْجِهَا (سورہ نحر)۔ یا اِذَا جَاءَكَ الْمُنَافِقُونَ قَالُوا لَوْ أَنَّهُمْ هَدَانَاكَ لَكَسُورُوا اللَّهُ (سورہ منافقون) حضرت شاہ صابوؒ مزید ارشاد فرماتے ہیں کہ چونکہ اہل عرب کے نزدیک ان کے قصائد خصوصاً طویل پرشہرت رکھتے تھے اور قصیدوں میں تشبیب کا ذکر بھی مستعار

و متعل تھا اور تشبیہ کے مضامین میں ایسے مضامین بھی داخل تھے جو ہولناک واقعات یا عجیب مقامات کے ذکر پر مشتمل ہوں تو اللہ تعالیٰ نے بعض قرآنی سورتوں میں اس اسلوب کو بھی اختیار فرمایا ہے مثلاً وَالصَّافَّاتِ صَفًّا لِّزَاجِرَاتٍ زُجْرَاهُ وَالذَّارِيَّاتِ ذُرًّا وَافَاتِ حَامِلَاتٍ وُجْرًا وَغَيْرُہُ۔ (الفوز الکبیر ص ۳۵)

## میں تفاوت رہ

کچھ ادیبوں نے ایک ذیلی سرخی ”صرف دعویٰ ہی دعویٰ“ قائم کی تھی جس کے تحت علامہ کی یہ کمزوری ظاہر کی تھی کہ موصوف دعویٰ تو بڑے سے بڑا کر جاتے ہیں مگر کسی مثال و دلیل کے ذریعہ اسے سمجھانے اور ثابت کرنے کی ضرورت مطلق نہیں سمجھتے لیکن جیسا کہ آپ نے ابھی ملاحظہ فرمایا کہ موصوف کے اس طرز عمل کے بالکل برخلاف حضرت شاہ علیہ الرحمہ کی مندرجہ بالا تحقیق جو آپ کے سامنے پیش کر دی گئی اس میں حضرت شاہ صاحب نے قرآن مجید کے اسلوب سے متعلق جو دعویٰ کیا ہے تو آخر تک کس لطف خوبی سے مثالوں کے ذریعہ سمجھاتے اور ہر دو اسلوبوں کے مابین مناسبت و مطابقت اور یکونگی و یکسانیت بھی ثابت فرماتے چلے گئے ہیں کہ ہر ناظر اس بحث سے پوری طرح لطف اندوز و مطمئن بھی ہو جائے۔ لیکن علامہ موصوف ہیں کہ وہ اس قسم کی تصنیفی و صحافتی ذمہ داری سے شاید ایسے بالا تر ہیں کہ موصوف کو اپنی اس کمزوری کا مطلق احساس تک نہیں ہے یا شاید جذبہ انکار اسلاف و اکابر اور شوق اجتہاد نے موصوف کے ذہن میں کچھ اس قسم کا زعم و پندار پیدا فرما دیا ہے جسے ایک عربی شاعر نے اپنے الفاظ میں یوں ادا کیا ہے ۵



وَنُذَكِّرُكَ بِشُكْرِنَا عَلَى النَّاسِ قَوْلَهُمْ  
وَلَا يُذَكِّرُونَ الْقَوْلَ حِينَ نَقُولُ

ہم جو چاہیں تو کریں شوق سے اپنی تمغہ یہ مجال انہی نہیں ہم پر وہ تمغہ کریں

علامہ سے یہ بات تو کہی جاسکتی ہے

حضرت! چلے ہم مان لیتے ہیں کہ ہر سورہ دراصل ایک تقریر تھی جو دعوتِ اسلامی کے کسی خاص مرحلہ میں ایک موقع پر نازل ہوئی تھی "حالانکہ آپ ہی کے تحریری اقرار سے ہم یہ بات ثابت کر آئے ہیں کہ سورہ سے متعلق "ایک تقریر" ہونے کے دعویٰ پر تو خود آپ بھی زیادہ دیر تک قائل و قائم نہیں رہ سکے ہیں۔ لیکن جہاں تک قرآنی سورتوں کے تقریر ماننے کی بات ہے تو شاید اس پر آپ کو اصرار ضرور ہے۔ تو براہ کرم ذرا یہ تو ارشاد فرمایا جائے کہ اگر کوئی شخص آپ کے اس دعویٰ کو "میزان حقیقت" میں رکھ کر مندرجہ ذیل سورتوں میں انداز تقریر و خطابت تلاش کرتے کرتے حیران ہو جائے اور اپنا اطمینان چاہے تو آپ کس طرح ان سورتوں کو تقریر کے قالب میں ڈھال سکیں گے ہم نے آپ کی صلاحیت تحریر تو دیکھ لی کہ آپ نے تمام مترجمین کے برخلاف یہ حقیقت دریافت فرمائی کہ قرآن مجید کی سورتیں دراصل تقریر و خطبہ کا انداز رکھتی ہیں اس لئے ترجمہ کرتے وقت اگر تقریری اسلوب کو تحریری اسلوب میں صحیح طور پر منتقل نہ کیا جائے گا تو قرآن مجید کی بے ربطی و در نہ ہوگی اور فہم قرآن آسان نہ ہو سکے گا۔ اب ہم یہ بھی دیکھنا چاہتے ہیں کہ جناب والا ان مندرجہ سورتوں کو ان کے اصلی رنگ تقریر و خطبہ میں بھی ذرا پیش کر کے دکھلا دیں، مثلاً

۱۱) ”سورہ فاتحہ کو دعوت اسلام کے کسی مرحلہ کی تقریر کا روپ دیدیں۔ یا

(۲) ”سورہ کوثر“ کو کسی طرح بھی (ایڑی سے چوٹی تک زور لگا کر ہی سہی) دعوت اسلام کے کسی مرحلہ کی تقریر ثابت فرمادیں تو ہم آپ کی قدرت کلام کے قائل ہو جائیں گے اور اس پر غور کرنا شروع کر دیں گے کہ آپ نے اپنی تفسیر اور اسکا دیباچہ و مقدمہ اپنے افکار و نظریات کی اشاعت اور ترویج کے لئے نہیں لکھا ہے لیکن یہ پتہ کی بات ہرگز نہ بھولے گا کہ سورہ کوثر کا خاتمہ و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین پر نہیں ہوا ہے بلکہ اسکی آخری آیت اِنَّ ثَمَانِيْنَ هُوَ الْاَبْتَرُ ہے۔

(۳) ”سورہ لہب“ (تَبَّتْ يَدَا اَبِيْ لَهَبٍ) کو کسی طرح خطبہ و تقریر کے انداز میں منتقل فرمادیجئے جسکی ابتداء ہی سراپا عتاب و سزا فقرہ سے ہو رہی ہے۔ ہم تو یہی سمجھتے ہیں کہ کوئی معمولی اور موٹی عقل کا آدمی بھی اس سراپا جلال و عتاب اور نکال و عذاب حکم سزا پر مشتمل شاہی فرمان کو تقریر و خطبہ سمجھنے کی ہمت و جرات نہ کر سکے گا۔ البتہ وہ حقیرات خود و سروں پر ”حق تنقید“ خیرات کر کے اپنے کو ماورائے تنقید سمجھتے ہوئے کسی شیش محل میں محفوظ ہو گئے ہوں وہ اگر ایسی بات کہیں تو ضرور کہہ سکتے ہیں کہ انکے قطب مینار عقل و فہم تک ہم جیسوں کی تنقید کہاں پہنچ سکتی ہے۔

یہ خیال ہرگز نہ فرمایا جائے کہ

ہم نے موصوف کے دعویٰ کی حقیقت پر کھنے کیلئے ان چھوٹی چھوٹی سورتوں کا انتخاب صرف اس لئے کیا ہے کہ انھیں تقریر و خطبہ کا روپ دینا واقعی دشوار ہو جائے۔ اس غلط فہمی کو بھی دور کیا جاسکتا ہے لیجئے اب ہم کچھ بڑی سورتوں کے نام بھی بطور نمونہ

(۱) سورہ نوح جو یوں شروع ہوتی ہے اِنَّا ارْسَلْنَا نُوحًا اِلٰی قَوْمِهٖ (مابدولت نے نوح کو انہی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجا) کیا اس سورہ کا یہ طرز آغاز کسی طرح بھی رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبہ و تقریر کا ہو سکتا ہے؟ یقیناً نہیں ہو سکتا ہاں اگر اسے زمانہ ماضی میں جاری شدہ کسی شاہی فرمان کی نقل و حکایت کہنا چاہیں تو کہہ سکتے ہیں اور یہ بات بالکل قرین عقل ہوگی اور حضرت شاہ صاحبؒ کی توجیہ و تحقیق کے عین مطابق ہوگی

اسی طرح سورہ قدر اَنَا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ ۚ اور سورہ علق اِقْرَأْ بِأَسْمِ  
رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ ۝ کو بھی تقریر و خطبہ ثابت کر دینا جو سب سے شیر لانے سے کم

(۲) وہ سورتیں جنہیں حضور پر توہ صلی اللہ علیہ وسلم کو شخصی و ذاتی طور پر مخاطب فرماتے ہوئے براہ راست آپ ہی کو کوئی حکم دیا گیا ہے جیسے **يَا أَيُّهَا الْمَرْسَلُ قُمْ إِلَيْكَ الْبَيْتُ** **إِلَّا قَلِيلًا يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَأَنْذِرْ** **يَا طه مَا أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْآنَ** **تَشْقِي** وغیرہ میں براہ راست مخاطب خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کہ فرمایا گیا ہے ایسی سورتوں پر خطبہ و تقریر کا اطلاق مضمی کہ غیری کے سوا اور کیا نتیجہ دے سکتا ہے انہیں خطبہ و تقریر وہی کہہ سکتا ہے جو تقریر کے مفہوم ہی سے بالکل نا بلند ہوا اور دیکھے ہوئے مقالوں کا پڑھ دینا بھی اسکے نزدیک خطبہ و تقریر کا مقام رکھتا ہو۔

## حقیقت کا سرع اور معالطہ کی بنیاد

مقدمہ تفہیم پر اپنے تبصرہ کے آغاز میں ہم نے علامہ کی روشنی طبع کو یاد کرتے ہوئے فارسی کا ایک مصرع بھی نقل کر دیا تھا، یہی بات یہ ہے کہ دوران تبصرہ وہ فارسی مصرعہ مہکوبار بار یاد آتا رہا۔ ایں روشنی طبع تو برمن بلاشدی - ہم نے برابر یہی محسوس کیا کہ علامہ کا جذبہ انکار تقلید و اتباع اور وفور شوق اجتہاد انھیں اس قسم کی غیر ضروری مونثکافیوں اور نکتہ آفرینیوں پر مجبور کرتا ہے موصوف کی انتہائی کوششیں یہ ہوتی ہیں کہ انکی کسی بات پر اخذ و نقل اور اتباع و تتبع کا ذرا داغ دھبہ بھی نہ آنے پائے اور وہ جو بات بھی کہیں وہ صرف انکی اپنی "ایج" اور دماغی و خیالی "پیداوار" ہو۔ حالانکہ واقعاً وہ ایسا کرتے تو نہیں سکتے ہیں لیکن نمائش پوری یہی کی ہے کہ ساری تفہیم انکی طبعزاد ہے۔

اسی جذبہ شوق نے انھیں اس مضحکہ خیز انکشاف پر آمادہ و مجبور کر دیا کہ وہ اسلوب قرآنی کی بحث میں اتنے آگے نکل جائیں کہ دوسروں کے لئے انکا تعاقب بھی مشکل ہو جائے۔

علامہ موصوف قرآن مجید کی کیفیت نزول سے بحث کرتے ہوئے بھول کر بھی وہ تعبیریں اختیار نہیں فرماتے جو عام طور پر کتب تفسیر میں مروج و متداول ہیں حضرات مفسرین بالعموم نزول آیت و سورہ کو یوں تعبیر فرماتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہوئی یا سورہ یا یہ آیت اتنی وغیرہ وغیرہ مگر علامہ یوں ارشاد فرماتے ہیں (الف) (سورہ آل عمران) اس میں چار تقریریں شامل ہیں (ب) (سورہ نسا) یہ سورہ

متعدد خطوں پر مشتمل ہے (ج) سورہ توبہ) یہ سورہ تین تقریروں پر مشتمل ہے۔ ظاہر ہے کہ جو روح تقدس و نورانیت خدا و رسول کے تجویز فرمودہ لفظ وحی وغیرہ میں ہے وہ علامہ کے خطبہ و تقریر میں کہاں سے آسکتی ہے۔

اندازہ یہ ہوتا ہے کہ علامہ کے ذہن و قیاد نے پہلے تو اسلوب قرآنی کے تقریری ہونے کا فیصلہ کیا ہوگا پھر ترقی فرما کر یہ سمجھ لیا کہ قرآن مجید کی ہر سورہ دراصل ایک تقریر ہے حالانکہ کسی اسلوب کا تقریری ہونا اور بات ہے اور سورہ کا تفسیر یہ ہونا اور بات ہے اسلئے اگر قرآن مجید کے اسلوب کو بالفرض تقریری تسلیم بھی کر لیا جائے تو بھی ہر سورہ قرآنی پر خطبہ و تقریر کا اطلاق اپنے جواز کیلئے محتاج دلیل ہوگا اور بغیر دلیل یہ اطلاق نہ صحیح ہوگا نہ قابل قبول ہی کہا جائے گا۔

## اسمار کلام اللہ حقیقی ہیں

علامہ تفسیر اسکی تصریح فرما چکے ہیں کہ مجموعہ کلام اللہ کیلئے بھی صرف وہی نام استعمال ہو سکتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اسکے لئے تجویز اور استعمال فرمائے ہیں (وہ مجموعی نام ۵ یا کچھ زائد ہیں جنکی تفصیل آرہی ہے۔ اسی طرح قرآن مجید کے مختلف اجزاء کے لئے بھی وہی الفاظ اور نام استعمال ہو سکتے ہیں جو ان کے لئے مقرر ہیں مثلاً سورہ کو صرف سورہ ہی کہا جائیگا اسے خطبہ و تقریر کہنا صحیح نہ ہوگا۔ آیت کو آیت ہی کہیں گے شعرو بیت نہ کہیں گے۔ آیت کے آخری ٹکڑے کو فاصلہ ہی کہیں گے قافیہ و ردیف سے تعبیر صحیح نہ ہوگی

## اتقان میں ہے

علامہ سیوطی علیہ الرحمہ اپنی مشہور تصنیف "اتقان" میں علامہ جاعظ سے

نقل فرماتے ہوئے لکھتے ہیں :-

”اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب (کلام اللہ) کے لئے ایسے نام مقرر فرمائے ہیں جو ان ناموں سے بالکل مختلف اور علیحدہ ہیں جنہیں اہل عرب اپنے کلام کیلئے استعمال کرتے تھے اور ناموں کا یہ اختلاف مجموعی طور پر کبھی ملحوظ رہا اور تفصیلی طور پر کبھی۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنے مجموعی کلام کو قرآن کا نام دیا جب کہ اہل عرب اپنے مجموعہ کلام کو دیوان کہتے تھے۔ اسی طرح قرآن مجید کے مختلف اجزاء کو سورہ فرمایا جبکہ اہل عرب اپنے دیوان کے اجزاء کو قصیدہ کہتے تھے۔ پھر سورہ کے اجزاء کو آیت کا نام دیا جبکہ اہل عرب اپنے اجزاء کو قصیدہ کو بیت (شعر) کہتے تھے اور آیت کے آخری ٹکڑے کو فاصلہ کا نام دیا جسے اہل عرب اپنے قصیدہ و بیت میں قافیہ کہتے تھے (اتقان جلد اول طہ)

## ”البرہان للناظر فی القرآن“ میں ہے

اس کے بعد شیخ جلال الدین سیوطی علامہ ابوالمعالی عزیزی کی کتاب البرہان سے نقل فرماتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب (کلام اللہ) کے ۵۵ نام خود قرآن مجید میں ذکر فرمائے ہیں (علامہ سیوطی نے تو بطور حوالہ ان ناموں میں سے ہر نام سے متعلق آیت کی طرف اشارے بھی فرما دیئے ہیں مگر ہم ازراہ اختصار صرف ان ناموں کے نقل ہی پر اکتفا کرتے ہیں۔ وہ آیات ”اتقان“ میں دیکھی جاسکتی ہیں۔

## اسماء کلام الہی ۵۵ ہیں

"کتاب - مبین - قرآن - کریم - کلام - نور - ہدی - رحمۃ - فرقان - شفا  
 مدعظہ - ذکر - مبارک - علی - حکمت - حکیم - مہمین - جبل - صراط - مستقیم  
 قیم - قول - فصل - نبار عظیم - احسن الحدیث - مشابہ - ثانی - تنزیل  
 روح - وحی - عربی - بصائر - بیان - علم - حق - ہادی - عجب - تذکرہ  
 العروۃ الوثقی - صدق - عدل - امر - منادی - بشری - مجید - ذبور - بشیر  
 نذیر - عزیز - بلاغ - قصص - صحف - مکرمہ - مرفوعہ - مطہرہ"

(الاتقان جلد اول ص ۵۵ و ۵۶)

## خطبہ و تقریر کا کوئی ذکر نہیں

قرآن مجید میں مزید غور و تفحص اور تلاش و جستجو کے ذریعے حضرات علماء کرام نے  
 کچھ اور بھی نام تلاش کر لئے ہیں مثلاً برہان - امام - خیر - مصدق بھی قرآن مجید میں مذکور  
 ہوئے ہیں لیکن کافی تلاش کے باوجود یہ کہا جاسکتا ہے کہ قرآن مجید کے ناموں میں علامہ  
 کے تجویز فرمودہ نام یعنی خطبات و تقریر کا استعمال کہیں بھی دیکھنے سننے میں نہ آسکا نہ ہی  
 یہ الفاظ قرآنی سورتوں کیلئے مستعمل ہوئے ہیں۔

## قابل غور بات

ابھی چند سطور پہلے علامہ سیوطی کی اتقان کے حوالہ سے علامہ جاحظ کی یہ بات نقل



کی گئی کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کیلئے ایسے نام مقرر فرمائے جو ان ناموں سے بالکل مختلف اور علیحدہ ہیں جنہیں اہل عرب اپنے کلام کیلئے استعمال کرتے تھے۔

اس سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ کلام الہی کے ناموں کی تجویز اللہ تعالیٰ ہی نے فرمائی ہے انسانوں کو یہ حق نہیں دیا کہ وہ اس کے نام اپنی طرف سے مقرر کریں۔ اور دوسری بات یہ بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نام بھی ایسے مقرر فرمائے جو کلام انسانی کیلئے استعمال نہیں ہوتے تھے اسکی بنیاد پر یہ بات بھی ثابت ہو جاتی ہے کہ جو الفاظ کلام انسانی کیلئے استعمال ہوتے ہوں کلام الہی کے لئے انکا استعمال غیر صحیح اور نادرست ہی کہا جائے گا۔

اور واقعہ بھی یہی ہے کہ جب خود فصحاء عرب نے بھی کلام بشر سے اسکا تفوق و امتیاز تسلیم کرتے ہوئے اسے کلام الہی مان لیا تو اب اس کے لئے ایسے الفاظ و تعبیرات کب صحیح ہونگی جو صرف کلام بشر کیلئے مستعمل ہوں۔

## تاریخ مظفری میں ہے

علامہ جلال الدین سیوطی اسمائے قرآنی نقل فرمانے کے بعد اسی سیاق کلام میں تاریخ مظفری کے حوالہ سے نقل فرماتے ہیں :-

”فائدہ : مظفری نے اپنی تاریخ میں یہ بات نقل کی ہے کہ ”حضرت

ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے عہد میں جب قرآن مجید کو

یکجا جمع کیا تو لوگوں سے (بطور طلب مشورہ) فرمایا اس کے لئے کوئی

نام تجویز کرو تو بعض لوگوں نے کہا انجیل نام رکھ دیا جائے مگر اس

تجزیہ کو بقیہ سب لوگوں نے ناپسند کیا تو کسی اور نے کہا سفر (بمعنی کتاب) نام مقرر کر لیں تو چونکہ یہ لفظ کتاب یہود کیلئے مستعمل تھا اس قلعن کی بنا پر یہ نام بھی ناپسند کیا گیا تو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ میں نے جہنہ میں دیکھا ہے کہ کسی کتاب کو (غالباً آسمانی ہی کتاب ہوگی ممکن ہے انجیل ہی ہو) وہ لوگ مصحف کہتے ہیں لہذا سب کی پسند سے بالاتفاق یہ نام مقرر کر دیا گیا (کہ خود قرآن مجید میں آیا ہوا نام بھلی ہے) (الاتقان جلد اول ص ۵۳)

چند سطروں کے بعد ہی علامہ سیوطی ارشاد فرماتے ہیں :-  
 ”اب یہ جائز نہیں ہے کہ قرآن مجید پر توراۃ یا انجیل وغیرہ کا اطلاق کیا جائے اور یہ الفاظ اسکے لئے استعمال کئے جائیں (الاتقان ج ۱ ص ۵۳)

## اگر اسی طرح ڈھیل دیدی جائے

تو جیسے آج علامہ مودودی نے اپنے خطبات کا شیوہ قرآن مجید سے ثابت کرنے کیلئے سارے قرآن مجید ہی کو مجموعہ تقاریر و خطبات ثابت کر دیا ہے کل کو ولایت سے مرعوب کوئی دوسرا مصلح اعظم ان قرآنی سورتوں کو اسپینچر کہہ دے گا اور پھر اسکے بعد اس بنیاد پر کوئی اور ترقی کر کے انھیں ”بھاشنوں کا سنگرہ“ بھی کہہ دے گا اسلئے کہ جب خود علامہ مودودی قرآنی سورتوں کو خطبہ و تقریر فرما رہے ہیں تو کسی دوسرے کو کیسے منع فرما سکیں گے کہ وہ قرآن کو مجموعہ تقاریر و خطبات نہ کہے اور پھر اس صورت میں قرآن مجید کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف تو بجائے نام ہی رہ جائیگی کیونکہ جب قرآنی سورتیں خطبہ ٹھہریں تو انھیں آپ ”خطبات اللہ“ تو کہنے سے رہے لا محالہ

آپؐ خطبات نبویؐ ہی کا نام دے سکیں گے جیسا کہ علامہ مودودی خود اپنے دیباچہ تفہیم میں یوں ارشاد فرما چکے ہیں :-

” حسب موقع و ضرورت ایک تقریر نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کی جاتی تھی اور آپؐ اسے خطبہ کی شکل میں لوگوں کو سنا دیتے تھے (دیباچہ)

ایسی صورت میں قرآن مجید کی ہر سورت کو تقریر و خطبہ اور چند خطبات تقاریر کا مجموعہ کہنا قرآن فہمی کی راہیں کشادہ نہ کر سکے گا نہ ہی اس سے قرآن فہمی میں کوئی مدد ملے گی ہاں اس کا یہ فائدہ ضرور ہو گا کہ ناظر تفہیم کا ذہن علامہ کی ”تحریک مودودیت“ اور موضوعات کے خطبات کے مضمرات کو باسانی سمجھنے کیلئے ضرور تیار ہو جائے گا

## تدبر قرآن کا نقطہ آغاز اور تفہیم قرآنی کی شاہ کلید

علامہ مودودی نے اپنے مقدمہ تفہیم میں اپنا سارا زور قلم اس موضوع پر صرف فرمانا چاہا ہے کہ قرآن مجید کا فہم و تدبر جو گونا گوں وجوہ و اسباب کے باعث خاطر خواہ طور پر نہیں ہو پا رہا ہے اسے وہ اپنی کوششوں سے آسان فرمانا چاہتے ہیں۔ چنانچہ موصوف مطالعہ قرآن کا نقطہ آغاز بیان فرماتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں :-

” اس سلسلہ میں سب سے پہلے ناظر کو قرآن کی اصل سے واقف ہونا چاہیے وہ خواہ اس پر ایمان لائے یا نہ لائے مگر اس کتاب کو سمجھنے کیلئے اسے نقطہ آغاز کے طور پر اسکی وہی اصل قبول کرنی ہوگی جو خود اس نے اور اسکے پیش کرنے والے (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) نے بیان کی

اس تمہید کے بعد علامہ موصوف نے نمبر وار چھ باتیں گنائی ہیں جو انکے نزدیک قرآن کی اصل حقیقت اور اسکا نقطہ آغاز ہیں نمبر پانچ پر کچھ تبصرہ کیا جا چکا ہے۔ پہلی تین باتیں کسی قدر اختصار کے ساتھ اب ذیل میں تبصرہ کیلئے نقل کی جا رہی ہیں (پوری عبارات اصل مقدمہ تفہیم میں ملاحظہ فرمائی جا سکتی ہے)

- (۱) خداوند عالم نے ————— انسان کو پیدا کیا ————— اور فی الجملہ ایک طرح کی خود اختیاری دیکر اسے زمین میں اپنا خلیفہ بنایا (مقدمہ تفہیم)
- (۲) اس منصب پر انسان کو مقرر کرتے وقت خداوند عالم نے اس کے کان کھوکھریاں اس کے ذہن نشین کر دی تھیں کہ تمہارا اور تمام جہاں کا مالک و معبود اور حاکم میں میں میری اس سلطنت میں نہ تم خود مختار ہو نہ کسی دوسرے کے بندے ہو اور نہ میرے سوا کوئی تمہاری اطاعت و بندگی اور پرستش کا مستحق ہے — دنیا کی زندگی ————— دراصل تمہارے لئے ایک امتحان کی بات ہے جس کے بعد تمہیں میرے پاس واپس آنا ہو گا اور میں تمہارے کام کی جانچ کر کے فیصلہ کروں گا کہ تم میں سے کون امتحان میں کامیاب رہا اور کون ناکامیاب، تمہارے لئے صحیح رویہ یہ ہے کہ تجھے اپنا داعی و معبود و حاکم تسلیم کر و جو ہدایت بھیجوں اس کے مطابق دنیا میں کام کر و اور دنیا کو دارالامتحان سمجھتے ہوئے اس شعور کے ساتھ زندگی بسر کرو کہ تمہارا اصل مقصد میرے آخری فیصلہ میں کامیاب ہونا ہے ————— اور اگر کسی دوسرے راہ پر چلو گے (جس پر چلتے چلتے بھی تم کو آزادی ہے) تو دنیا میں تھک و فساد

اور بے چینی کا مزہ چکھنا ہو گا اور دنیا سے گزر کر عالم آخرت میں جب  
 اُدگے تو ابدی رنج و مصیبت کے اس گڑھے میں پھینک دیئے  
 جاؤ گے جسکا نام دوزخ ہے (مقدمہ تفہیم ص ۱۱)  
 (۳) یہ فہمائش کر کے مالک کائنات نے نوع انسانی کو زمین  
 میں جگہ دی اور اس نوع کے اولین افراد آدم و حوا کو وہ ہدایت  
 بھی دیدی جس کے مطابق انھیں اور انکی اولاد کو زمین میں کام کرنا تھا  
 یہ اولین انسان جمالت اور تاریکی کی حالت میں نہیں پیدا ہوئے تھے  
 بلکہ خدا نے زمین پر انکی زندگی کا آغاز روشنی میں کیا تھا وہ حقیقت سے  
 واقف تھے انھیں انکا قانون حیات بتا دیا گیا تھا (مقدمہ تفہیم ص ۱۱)

## تخلیق آدم کی چشم دید شہادت

حضرات ناظرین مقدمہ کے اقتباس بالا کو بغور ملاحظہ فرمائیں اور اسکے ساتھ  
 علامہ کی وہ تمہید بھی نظر میں رکھیں جو مقدمہ کے ص ۱۴ سے اوپر نقل کی جا چکی ہے صاف  
 نظر آ جائیگا کہ علامہ نے اپنے دعاوی کے ثبوت میں قرآن مجید اور احادیث شریفہ سے  
 کوئی آیت و حدیث پیش فرامنے کی زحمت نہیں فرمائی جس سے موصوت کے یہ دعاوی  
 ثابت تو ہو جاتے حالانکہ موصوت اوپر اٹھا دیا چکے ہیں کہ قرآن مجید کی یہ اصل خدا و  
 رسول کی بیان فرمودہ ہے :-

۱۰۔ اس منصب پر انسان کو مقرر کرتے وقت خداوند عالم نے اپنی طرح  
 کان کھول کر یہ بات اسکے ذہن نشین کر دی تھی اور

۳۔ "یہ فہمائش کر کے مالک کائنات نے نوع انسانی کو زمین میں جگہ دی"۔

ایسی صورت میں جبکہ علامہ موصوف ثبوت و دلیل سے صرف نظر فرماتے ہوئے صرف دعوؤں ہی پر اکتفا فرما رہے ہیں کیا ہم یہ سمجھ لیں کہ "تخلیق آدم" اور خلیفہ سازی کے وقت علامہ موصوف بذات خود موجود تھے جسکی چشم دید شہادت مقدمہ تفہیم کے صفحات میں ادا فرمائی جا رہی ہے۔ اور اگر ہمیں ایسا سمجھنے کی اجازت نہیں ہے اور غالباً یہ اجازت دی بھی نہ جاسکے گی تو ہم اپنے تصویرِ علم و فہم اور قلت تدبر و تحقیق کا اعتراف کرتے ہوئے بالکل صاف لفظوں میں یہ اظہار حقیقت بکلی ضروری سمجھتے ہیں کہ علامہ کے دعویٰ اس انداز میں قرآن شریف کی کسی آیت یا کسی مستند حدیث سے ثابت نہ ہو سکیں گے۔

جہاں تک قرآن مجید کا تعلق ہے اس میں غرض تخلیق اور وجہ تخلیق پر روشنی ڈالنے والی آیات بہت مشہور ہیں ایک آیت سورہ بقرہ کی اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً اور دوسری آیت سورہ زاریات کی وَ مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِعِبَادِیْ وَ ت ہ یہ دوسری آیت تو علامہ کے مفہوم دعویٰ سے بڑی حد تک بے تعلق ہی ہے اور پہلی آیت کی تفسیر بکلی اگر علامہ کے منشا ہی پر کی جائے تو بکلی آیت سے میطلب اخذ کرنا کہ یہ خلافت آدم کا مسئلہ ہی اصل قرآن ہے حکم محض ہے جسے علامہ کی امت تو تسلیم کر سکتی ہے دوسروں کیلئے اس سے اتفاق دشوار ہے۔

باقی رہا احادیث کا معاملہ تو احادیث سے بھی علامہ کا دعویٰ و مدعا پایہ ثبوت کو نہ پہنچ سکے گا کیونکہ مشہور احادیث میں تو وہ حدیث ہے جس میں حضرت آدم کا اور حضرت موسیٰ علیہما السلام کا مکالمہ نقل کیا گیا ہے اس حدیث میں حضرت آدم علیہ السلام کے صرف سجدہ ملائکہ ہونے کا تو ذکر ہے جسے علامہ اپنی تفسیر میں متعارف مفہوم کے اعتبار

سے تسلیم فرمانے کیلئے بکلی تیار نہیں ہیں، خلافت ارضی کا تذکرہ نہیں ہے۔  
 بہر حال اگر علامہ کے ارشادات قرآن و حدیث سے ثابت ہو سکتے ہوں تو  
 فراہمی ثبوت علامہ ہی کے ذمہ ہے مگر یہ پہلو بھی ملحوظ رہے کہ ثبوت کے بعد بکلی محض اسی  
 حقیقت کا اصل قرآن ہونا محل کلام اور قابل غور رہے گا۔

### میری حاصل مطالعہ مزید تا یہ ملاحظہ ہو

حضرت مولانا محمد اسحق صاحب (شیخ الحدیث دارالعلوم کراچی) رسالہ بنیات  
 کراچی میں علامہ کی تفہیم القرآن پر تبصرہ فرماتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں :-  
 ”مودودی صاحب اصل قرآن اس چیز کو قرار دیتے ہیں کہ ”انسان زمین  
 اللہ تعالیٰ کا خلیفہ ہے“۔ اسلئے سوال پیدا ہوتا ہے کہ خلافت  
 کا مفہوم ان کے نزدیک کیا ہے؟ اسکی تشریح انھوں نے اپنے  
 مقدمہ میں پیش نہیں کی حالانکہ اس مقام پر اسکی ضرورت تھی، مگر اپنی  
 دوسری تحریروں میں انھوں نے اسکی توضیح کی ہے، ملاحظہ ہو دین کا  
 حقیقی مقصد بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں :-

”مختصر الفاظ میں تو صرف اتنا کہہ دینا ہی کافی ہے کہ وہ مقصد  
 انسان پر ہے انسان کی حکومت مگر خدائے واحد کی حکومت  
 قائم کرنا ہے اور اس مقصد کیلئے مرد و عورت کی باہمی لگا دینے اور  
 جان توڑ کوشش کرنے کا نام جہاد ہے۔ اور نماز، روزہ،  
 حج، زکوٰۃ سب سب اسی کام کی تیاری کیلئے ہیں (خطبات ۳۹ ص ۳)



”گویا دین اسلام کا اصل مقصد ایک ایسا سیاسی نظام قائم کرنا ہے جس کے  
دستور کی بنیاد اسی اصول پر ہو کہ مقتدر اعلیٰ صرف اللہ تعالیٰ  
ہیں اور وہی حاکم ہیں۔“

ظاہر ہے کہ کسی مسلمان کو اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ حقیقی اقتدار اعلیٰ  
اور حاکمیت مطلقہ صرف اللہ تعالیٰ شانہ کیلئے ثابت ہے۔ — اس میں  
بھی ہمیں کلام نہیں کہ نظام خلافت اور اسلامی دستور حکومت کی بنیاد  
اسی اصول پر قائم ہے، یہ بھی صحیح ہے کہ قرآن اور سنت نے ایک  
سیاسی نظام کی بھی تعلیم دی ہے جو دنیا کے دوسرے نظامات سے  
مختلف اور بدرجہا بہتر ہے۔ لیکن ان عقائد کو تسلیم کر لینے سے یہ  
لازم نہیں آتا کہ سورہی صاحب کا یہ خلافت حقیقت دعویٰ بھی تسلیم  
کر لیا جائے کہ دین اسلام کا پتھر اور اصل قرآن یہی نظام سیاسی  
اور قیام خلافت ہے۔ خطبات کی عبارت منقولہ سے روشن ہو جاتا ہے  
کہ انسان کو اللہ کا خلیفہ کہنے سے انہی کیا مراد ہے۔ وہ یہ دکھانا چاہتے  
ہیں کہ مضامین قرآن کا اصل محور و مرکز اس نظام سیاسی کی تعلیم ہے  
جو نزول قرآن کا اصل مقصد ہے گویا کتاب مبین در اصل ایک سیاست  
کی کتاب اور سیاسی دستور ہے اسکے جملہ مضامین اور تعلیمات کی  
بنیاد و اساس خلافت یعنی ایک سیاسی نظام کی تعلیم ہے۔ عقائد، عبادات  
اور اخلاق کی تعلیم درحقیقت اسی سیاسی تعلیم کی تمہید ہے خود مقصود بالذات  
نہیں ہے۔ (رسالہ بنیات ص ۱۲۱ بابت جولائی ۱۹۴۷ء)

اسکے بعد مولانا اسحق صاحب نے علامہ کے خطبات ص ۳۵۴، ۳۵۵ سے

کچھ اقتباسات اور نقل فرمائے ہیں، پھر ارشاد فرماتے ہیں:-

”وہ (مودودی صاحب) صاف صاف کہہ رہے ہیں کہ جب تک دین کا اقتدار زمین پر نہ قائم کیا جائے اس وقت تک دین کے حق ہونیکا اعتقاد لا حاصل اور بے معنی ہے گویا ایمان و اعتقاد کی قدر و قیمت بھی اسلام کے شعبہ سیاست یعنی نظام خلافت سے وابستہ ہے۔ اگر کوئی شخص توحید رسالت آخرت اور جملہ عقائد اسلام کا قائل ہو اور تختہ عقیدہ و ایمان رکھتا ہو مگر نظام خلافت کیلئے جدوجہد نہ کرے تو ان کے نزدیک اسکا ایمان لا حاصل، اسکے عقائد رائیگاں اور اسکا یقین بے قیمت ہے۔ (دوسطوں کے بعد فرماتے ہیں)

جس شخص کو قرآن و حدیث سے ذرا بھی مس (لگاؤ) ہو وہ بغیر کسی کدو کاوش کے سمجھ سکتا ہے کہ انکا یہ نظریہ تہریحات قرآن و حدیث اجماع امت اور عقل دینی کے بالکل خلاف اور سراسر زندقہ و ضلال ہے، حق یہ ہے کہ دین کے متعدد شعبے ہیں انہیں سے ایک شعبہ ”سیاست“ بھی ہے اسے ”کل دین“ قرار دینا بالکل باطل ہے عاصی مسلمان بھی جانتا ہے کہ اسلام کا سب سے اہم حصہ اسکا شعبہ عقائد ہے اسی پر پورے دین کی بنیاد قائم ہے اسکے بعد شعبہ عبادت کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے ایمان و عبادت کا مقصد سیاست نہیں بلکہ سیاست و خلافت کا اصل مقصد خود ایمان و عبادت ہے قرآن مجید کا

مرح ارشاد ہے اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوْا  
 الصَّلَاةَ وَآتَوْا الزَّكَاةَ وَآمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ  
 الْمُنْكَرِ وَبِذَلِكَ عَاقِبَةُ الْاُمُوْره (وہ لوگ ایسے ہیں کہ اگر ہم انہیں  
 زمین پر اقتدار عطا کر دیں تو یہ نماز قائم کرینگے زکوٰۃ دیں گے، معروف کا  
 حکم اور منکر سے منع کریں گے) ان آیتوں سے روشن ہے کہ اسلام کے  
 نظام سیاسی کا مقصد مسلمانوں کا اقتدار قائم کرنا نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کی  
 عبادت و طاعت کی حفاظت و اشاعت ہے۔ شعبہ عبادات اہل مقصد  
 ہے اور شعبہ سیاسیات اسکا محافظ و خادم اسکے بالکل برخلاف مودودی صاحب  
 اسلام کے شعبہ سیاست کو اہل اور نظام عقائد و عبادات کو اسکا خادم اور  
 ذریعہ قرار دیتے ہیں۔

لیکن اس جگہ ہمیں انکے اس غلط نظریے پر تفصیلی بحث مقصود  
 نہیں۔ دکھانا یہ ہے کہ انھوں نے قرآن مجید پر اپنے اسی زاویہ معکوس سے  
 نظر کی ہے اور وہ دوسروں کو بکلی اسی زاویہ منہوت سے نظر کرنے کی دعو  
 دیتے ہیں۔ واضح بات ہے کہ جب زاویہ فکری ہی صحیح نہ ہو تو یہ توقع کہ سطر  
 کبھا سکتی ہے کہ انکی نظر روح قرآن تک پہنچی ہوگی اور انھوں نے  
 قرآن مجید کی (آراء) ترجمانی میں ٹھوکر پ نہ کھائی ہوگی (پیشا جلالی)

واللہ اعلم

بیانات کے مندرجہ بالا اقتباس میں حضرت مولانا محمد اسحق صاحب امتیاز برکاتہم

علامہ کے زاویہ معکوس و منحرف کی بنا پر جو اندیشہ قائم فرمایا ہے وہ بالکل واقعہ اور  
مبنی بر حقیقت ہے۔

راقم السطور کو بھی علامہ کی تفہیم پر اسی پہلو سے کلام ہے کہ جب موصوف کا  
زاویہ فکر ہی معکوس و منحرف ہے تو صراطِ مستقیم تک رسائی کیسے ممکن و متوقع ہو سکتی  
انشاء اللہ تعالیٰ آئندہ صفحات میں اسکی مثالیں ملاحظہ میں جلد ہی آئیں گی۔

## مقدمہ کا خاتمہ

اس سرخی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ علامہ کی تفہیم القرآن پر تبصرہ ختم ہو رہا ہے  
تفہیم القرآن پر تبصرہ تو ابھی شروع بھی نہیں ہوا ہے۔ ابھی تو تفہیم کا ”دیباچہ“ و  
”مقدمہ“ سمجھنے کی کوشش کی جا رہی ہے، اس سے فرصت پانے کے بعد ہی  
انشاء اللہ اصل تفہیم القرآن کا مقدمہ (تبصرہ) ناظرین کی عدالت میں پیش  
کیا سکے گا۔ اپنے اس تمہیدی تبصرہ کو (جو تفہیم کے دیباچہ و مقدمہ ہی سے متعلق ہے)  
کسی قدر محدود و مختصر رکھنے کے خیال سے بعض اعتراضات کو نظر انداز کرتے ہوئے  
مقدمہ تفہیم کے ایک آخری اقتباس پر تبصرہ کر کے مقدمہ کا خاتمہ بلکہ فیصلہ ہی کو دنیا  
چاہتا ہوں۔

## قرآن مجید ثرمی مذہبی کتاب نہیں ہے

”قرآن فہمی“ کی راہ میں جتنی رکاوٹیں ہو سکتی تھیں علامہ نے مقدمہ تفہیم  
میں تقریباً سب ہی کی نشاندہی فرما کر اپنے ذہن میں ہر رکاوٹ و دیرکھی فرمادی ہے

اس سلسلہ میں مقدمہ تفہیم کا مندرجہ ذیل اقتباس خاص پراہمیت کا حامل ہے جس میں موصوف نے بڑے قیمتی قسم کے چند نکتے سپرد قلم فرمادیئے ہیں۔ ملاحظہ ہو مقدمہ تفہیم کا اقتباس موصوف ارشاد فرماتے ہیں

”فہم قرآن کی ساری تدبیروں کے باوجود آدمی ”قرآن کی روح“ سے پوری طرح آشنا نہیں ہونے پاتا جب تک عملاً وہ کام نہ کرے جس کے لئے قرآن آیا یہ محض نظریات و خیالات کی کتاب نہیں ہے کہ آپ آرام کر سہیں پر بیٹھ کر اسے پڑھیں اور اسکی ساری باتیں سمجھ جائیں۔ یہ دنیا کے عام تصور مذہب کے مطابق ایک نرمی مذہبی کتاب بھی نہیں ہے کہ مدرسہ و خانقاہ میں اسکے بارے میں روزِ محل کر لئے جائیں یہ ایک دعوت و تحریک کی کتاب ہے“ (مقدمہ تفہیم ص ۲۳)

اقتباس مندرجہ بالا میں علامہ کے چند فقرے اپنی معنی خیزی کے لحاظ سے قابل غور ہیں ایک فقرہ تو ”قرآن کی روح“ ہے جو علامہ کا خصوصی فقرہ ہے بلکہ سچ پوچھئے تو یہی فقرہ علامہ کی ساری تحریرات کی روح ہے۔ جو حضرات علامہ کی تحریرات پر نظر رکھتے ہوں گے انھیں اچھی طرح اندازہ ہوگا کہ علامہ کس طرح روح اور اسپرٹ جیسے الفاظ کے پردے میں اپنی بات فرمانے کے عادی ہیں اور دوسرا فقرہ ”نرمی مذہبی کتاب“ ہے علامہ کے اس انکشاف پر حقد رکھی داد دیجائے کم ہے۔ اس قسم کی تعبیرات کا پردہ علامہ بالقصد رکھتے ہیں غرض یہ ہوتی ہے کہ اگر کوئی شخص کسی دوسرے عالم و مفسر کی قرآن فہمی وغیرہ کی بات کرے تو علامہ بے تکلف بڑی آسانی کے ساتھ یہ فرما سکیں کہ مدرسہ و خانقاہ سے تعلق رکھنے والے علماء مفسرین

ممکن ہے قرآن مجید سمجھ لیں لیکن روح قرآن تک انکی رسائی تو میرے ہی فارمولہ کے ذریعہ ہو سکتی ہے۔

جی چاہتا ہے کہ اسی موقع پر علامہ سے یہ بھی دریافت کر لیا جائے کہ جناب نے یہ توارشاد فرمادیا کہ قرآن مجید کے رموز مدرسہ و خانقاہ میں حل نہیں ہوتے لیکن یہ نہ ارشاد ہوا کہ قرآن مجید کے یہ رموز داسرار آخر کہاں حل ہوتے ہیں؟ دارالاسلام ٹھکان کوٹ میں؟ یا سنٹرل جیل ملتان میں؟

## ایک علامہ دوسرے علامہ کے نقش قدم پر

مطلع قیادت و امارت پر علامہ مودودی کے ابھرنے سے کچھ ہی پہلے ایک دوسرے علامہ بھی مسلمانان ہند کی دینی قیادت کیلئے ”تذکرہ و ہیلچہ“ کے ساتھ سامنے آئے تھے جنھیں لوگ عام طور پر ”علامہ عنایت اللہ مشرقی“ کے نام سے جانتے اور یاد کرتے ہیں۔

آنجناب نے علامہ نے بھی علمائے دین کا استیصال و خاتمہ ہی کہ دینے کی ٹھانی تھی۔ مدرسہ و خانقاہ پر طعن و تشنیع پر وہ ان موصوف سے بہت آگے تھے۔ چنانچہ انھوں نے ”مولوی کا غلط مذہب“ نامی رسالہ لکھ کر کئی نمبروں میں شائع کیا تھا۔ مشرقی تحریک بھی اسی طرح ”سیاست و عملکدیت“ اور ”تنظیم و اجتماعیت“ وغیرہ کے خوشنما روپ میں جلوہ گر ہوئی تھی اور بڑی تیزی سے پھیلنے شروع ہو گئی تھی مگر اللہ تعالیٰ نے فضل فرمایا اور یہی علمائے برحق جن پر بقول علامہ روح قرآن منکشف ہی نہیں ہوئی ہے تو دید مشرقیت کیلئے کھڑے ہو گئے نتیجہ یہ ہوا کہ مشرقیت کی نوخیز کلی بن کھلے ہی

مرجھا گئی اور اپنی موت مر کر ہمیشہ کیلئے دفن ہو گئی۔

علامہ مودودی جو کچھ دنوں پہلے ہی سے علامہ نیاز فتحپوری کے فیض صحبت و تربیت کے سہارے دینی قیادت کی تیاری میں لگے ہوئے تھے استاد نے موصوف کو مسلمانان ہند کی دینی قیادت کے منصب پر فائز کر دیا اور علامہ نے کبھی گرد و پیش کے پورے حالات کا اچھی طرح جائزہ لیکن بجا طور پر یہ سمجھ لیا کہ انجمن اکیٹ میں صحیح مقام اور بازار میں ساموکاری اسی وقت مل سکتی ہے جب وہ اپنے آپ کو "ماڈرن انداز" کا لیڈر بنا کر پیش کریں۔

اس سلسلہ میں موصوف کیلئے یہ بھی ضروری تھا کہ وہ علمائے دین حق کو بھی اپنے طنز و تعریف کا نشانہ بنائیں چنانچہ موصوف نے یہ اہم دینی خدمت بڑی شان کے ساتھ انجام دی ہے۔ علامہ نے اپنی مشہور تصنیف "تجدید و احیائے دین" میں حضرات علمائے مجددین پر اور اپنی دوسری تصنیف "خلافت و ملوکیت میں خلیفہ راشد داماد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے صحابہ کرام پر جو تنقیدیں فرمائی ہیں ان کو دیکھنے کے بعد موصوف کا مدارس و خانقاہ پر یہ طنز تو بہت کم درجہ رکھتا ہے جو ابھی مقدمہ کے اقتباس بالا میں نقل کیا گیا ہے۔ "تجدید و احیائے دین" کے کچھ اقتباسات بھی ملاحظہ فرمائے جائیں۔

(الف) "تاریخ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اب تک کوئی مجدد کامل پیدا نہیں ہوا۔ قریب تھا کہ عمر ابن عبد العزیز اس منصب پر فائز ہو جاتے مگر وہ کامیاب نہ ہو سکے ان کے بعد جتنے مجدد پیدا ہوئے ان میں سے ہر ایک نے کسی خاص شعبہ یا چند شعبوں میں



کام کیا۔ مجدد کامل کا مقام ابھی تک خالی ہے (تجدید و احیاء دین) ص ۳  
 (ب) (امام غزالیؒ پر تبصرہ فرماتے ہوئے) ”مگر امام موصوف کے  
 کارنامے میں یہ سیاسی رنگ محض ضمنی حیثیت رکھتا تھا سیاسی انقلاب  
 کیلئے انھوں نے کوئی باقاعدہ تحریک نہیں اٹھائی نہ حکومت کے  
 نظام پر کوئی خفیف سے خفیف اثر ڈال سکے اسی لئے جاہلیت کی  
 حکمرانی میں مسلمانوں قوموں کی حالت خراب ہوتی چلی گئی“ (۴۶)

(ج) علامہ ابن تیمیہؒ پر تبصرہ فرماتے ہوئے) ”تاہم یہ واقعہ ہے  
 کہ وہ کوئی ایسی سیاسی تحریک نہ اٹھا سکے جس سے نظام حکومت  
 میں انقلاب برپا ہوتا اور اقتدار کی کنجیاں جاہلیت کے قبضہ سے  
 نکل کر اسلام کے ہاتھ میں آجائیں“ (۴۷)

(د) حضرت مجدد صاحبؒ اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ پر  
 تبصرہ فرماتے ہوئے) ”بہلی چیز جو مجھ کو حضرت مجدد الف ثانی کے  
 وقت سے شاہ صاحبؒ اور ان کے خلفاء کے تجدیدی کام کھٹکتی ہے  
 وہ یہ کہ انھوں نے تصوف کے بارے میں مسلمانوں کی بیماری کا  
 پورا اندازہ نہیں لگایا اور انکو پھر وہی غذا دیدی جس سے مکمل  
 پرہیز کرانے کی ضرورت تھی۔“ (۴۸)

الغرض علامہ موصوف نے ان مصلحین و مجددین اور اکابر و اسلاف  
 نیز ان کے مدارس و خانقاہ سے اپنا رشتہ و تعلق اس طرح توڑ لیا کہ اب وہ بدرجہ  
 خانقاہ پر فقرہ بازی کرتے اور بھیتیں کسے میں بھی شاید فخر ہی محسوس کرتے ہیں اور ہمارے

علماء اکابرین کو یہ انداز خاص تو آتا نہیں کہ فرعونی طرز کو اپناتے ہوئے وہ بھی ان سے یوں دریافت فرمائیں اَللّٰهُمَّ تُرَبِّکَ فِیتَا وَلِیْدًا وَکِبِشْتَ فِیْنَا مِنْ عَمَلِکَ مَسْبُتٌ ۝ کیا ہم نے اپنے درمیان رکھ کر تیری تربیت بچپن میں نہیں کی اور تو نے ہمارے درمیان اپنی عمر کے کئی سال نہیں گزارے (شعر)

اس موقع پر اسی سلسلہ میں یہ انکشاف حقیقت لطیف سے خالی نہ ہو گا کہ موصوف جس مدرسہ و خانقاہ پر طنز و تبرا فرما رہے ہیں پہلے کبھی وہ بھی اسی مدرسہ و خانقاہ کے فیض یافتہ حضرات سے استفادہ فرما چکے ہیں۔ دہلی کے زمانہ قیام میں حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب علیہ الرحمہ سے صحبت و مشورہ اور حضرت مولانا اشفاق الرحمن صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ سے انکامل و استفادہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے، اور مولانا کاندھلوی مدرسہ کبھی تھے اور خانقاہ ہی کبھی کہ حضرت حکیم الامتہ علیہ الرحمہ کے مجازین و خلفاء میں داخل تھے مگر ایسا لگتا ہے کہ علامہ موصوف اب اپنے احساس آنا امیر کم ابوالاعلیٰ کے کیفیت و سرور میں اپنا وہ ماضی فراموش فرما چکے ہیں

## کیا یہ سراسر احسان فراموشی اور محسن کشی نہیں ہے

اقتباس مندرجہ بالا میں علامہ نے جس طنز آمیز اور حقارت خیز انداز میں مدرسہ و خانقاہ کا ذکر فرمایا ہے اسکو پڑھ کر یقین نہیں آتا کہ یہ عبارت اس شخص کی تراوش فکر اور رشتہات قلم سے ہو سکتی ہے جو علیٰ منہاج النبویہ تحریک قامت کا داعی مطلق اور حکومت الہیہ کا امیر الکل ہونے کا مدعی ہے۔

یہ کیسی کھلی ہوئی احسان فراموشی اور کیسی زبردست محسن کشی ہے کہ علامہ

ان مدارس و خانقاہ پر پھبتی کس رہے ہیں ان کا مذاق اڑا رہے ہیں حالانکہ یہی مذہب و خانقاہ ہی دین کے وہ صحیح منبع و مرکز رہ چکے ہیں جنکی بدولت سرمایہ دین و ایمان اور ذخیرہ قرآن و سنت ہم مسلمانوں تک پہنچ سکا اور جن کے علمی و کتابی فیوض سے بقدر ظرف و صلاحیت خود علامہ نے بھی فائدہ اٹھایا ہی ہوگا! ہم نہیں سمجھ سکتے کہ علامہ کی موجودہ معلومات میں ان مدارس و خواتق کا توسط و ذریعہ شامل نہیں ہے بلکہ علامہ نے براہ راست مبدیہ فیاض سے اکتساب فیض و تلقی فرمائی ہے یا پھر یہ سب کچھ ”استاذہمی کی طرف سے القار ہوا ہے؟“

اور اگر علامہ کی موجودہ معلومات میں ان ”مدارس و خواتق“ کو بھی دخل ہے جیسا کہ اوپر مذکور ہو چکا ہے تو ازراہ کرم ہمیں بتایا جائے کہ علم کی تاریخ میں احسان فراموشی کی ایسی مثال کہیں کوئی اور بھی ملتی ہے؟ ہم اپنی معلومات کی حد تک تو یہی سمجھتے ہیں کہ علم اور اہل علم کی تاریخ میں ایسی مثال ہرگز نہ مل سکے گی۔

## ”تطویل“ تو کچھ ”باعث تطویل“ بھی تھا

(۱) راقم اسطور نے علامہ کی تفہیم سمجھنے کی کوشش کرتے ہوئے اس کی خطرناکیوں کی نشاندہی کرتے ہیں اشارات و اختصار کا انداز پسند نہیں کیا، ہمارا مقصد یہ تھا کہ وہ نہ ہر ناکیاں جو علامہ کی تفہیم کے بین السطور ہی دیکھی جاسکتی ہیں وہ پوری طرح آشکار ہو کر ناظرین تفرہ کے سامنے آجائیں اور علامہ موصوفت نے تفہیم القرآن میں اپنے ناظرین کی جو ”نظر بندی“ فرمائی ہے اسکا پردہ چاک کر دیا جائے اس لئے یہ آپریشن

زرا اگر کرنا پڑا اور بات کچھ طویل ہوتی چلی گئی۔

(۲) تطویل کی دوسری وجہ یہ ہوتی کہ راقم السطور کو حوالہ میں تفہیم کے لئے اقتباسات بھی پیش کرنے تھے جن میں جذبات و اختصار کا طرز بالکل ہی مناسب نہ تھا کہ پھر تو بہت سے حضرات نے تبصرہ آئے ہوئے اقتباسات میں ”قطع و برید“ کا ریماک دیکر پورے ہی تبصرہ کو نظر انداز اور ناقابل توجہ قرار دیتے کیلئے ایک بہانہ تلاش کر لینے میں کامیاب ہو جاتے اسلئے راقم السطور نے پوری صحافتی دیانت و امانت کو محفوظ رکھتے ہوئے تفہیم کی عبارتیں جہاں بھی نقل کی ہیں بالعموم پوری ہی نقل کی ہیں مگر افسوس کہ ”اجتماع“ کے نام پر افتراق کی کوشش کرتے والے حضرات اور قبل از وقت حاصل مطالعہ دریافت کر لینے والے ماہرین کے حلقوں سے حوالوں میں ”قطع و برید“ کی صدالگا کر مطلوبیت کی دہائی دی جا رہی ہے اس اندھیر اور زبردستی کا علاج تو شاید حکیم نسمان کے پاس بھی نہ ہوگا۔

(۳) تیسری وجہ یہ کہ راقم السطور نے اپنی کم علمی اور گنہگار کے باعث علامہ کے طرز عمل کے برخلاف اس بات کی بھی کوشش کی ہے کہ حتی الامکان اپنی تمام تر معروضات کو اکابر و سلف کی تائیدات سے بھی بھر پور رکھا ہے۔ ان باتوں کا لازمی نتیجہ یہی ہونا تھا کہ جو ہوا کہ ۳۵ صفحات کے دیباچہ و مقدمہ پر یہ تبصرہ خاصا طویل ہونا جا رہا ہے۔

ضروری وضاحت

راقم السطور کا زیر نظر تبصرہ جو بالاصل تو علامہ کی تفہیم القرآن سے متعلق ہے

مگر ضمناً و تبعاً یہ تبصرہ خود علامہ موصوف اور انکی تحریک مودودیت سے متعلق بھی ہے اور چونکہ تفہیم القرآن کی غرض تصنیف بھی مودودیت کی تبلیغ و اشاعت ہی ہے اسلئے راقم السطور کے اس تبصرہ کا موضوع بھی بڑی حد تک علامہ کی مختلف تحریرات اور انکی تحریک کے مضمرات ہی ہیں۔

ہو سکتا ہے بعض حضرات کو راقم السطور کی اس تحریر میں علامہ کیلئے اس قسم کے جذبہ احترام و عقیدت کی کچھ کمی محسوس ہوتی ہو جس کا لحاظ کسی دینی عالم اور قابل احترام شخصیت کیلئے ضروری سمجھا جاتا ہو تو بڑی صفائی کے ساتھ یہ وضاحت کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ علامہ موصوف سے راقم السطور کا تعلق کافی پُرانا ہے اور ان سے اس قسم کا ربط و تعلق بھی بہت قدیم ہے جبکی سرگزشت بھی دیکھی سے نکالی نہیں ہے آپ بھی ملاحظہ فرمائیں :-

## حوالہ غلط نکل گیا

اب اسے تقریباً چالیس سال پہلے کی بات ہے جب راقم السطور مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور میں زیر تعلیم تھا (یہ زمانہ ۱۹۳۸ء سے ۱۹۴۴ء تک رہا ہے) اس وقت جماعت کے مومنین اولین میں سے چند مشہور حضرات جماعت سے علیحدہ ہو چکے تھے اور علامہ کے خلاف مضامین کا ایک ہنگامہ سا برپا تھا۔ مولانا مناظر احسن گیلانی اور مولانا حبیب احمد صاحب کیرانوی اور خود مولانا عبدالماجد صاحب دریا آبادی کے مضامین ہدیٰ میں برابر نکل رہے تھے۔ اسی زمانہ میں احقر نے استاد محترم حضرت مولانا مفتی محمود حسن صاحب دامت برکاتہم کی نشاندہی و رہنمائی سے علامہ

مشہور کتاب "حقوق الزوجین" کی بحث "ایلا ر" پر ایک مراسلہ نما مختصر مضمون بھی لکھا (یہ راقم السطور کی مضمون نویسی کی ابتداء تھی جو علامہ کی تنقید و تعاقب کی شکل میں ہوئی تھی) یہ مراسلہ اسی دور میں "صدق" کے کسی شمارہ میں شائع ہوا تھا ۱۱ اندازہ ہے کہ ۱۹۴۲ء میں شائع ہوا ہوگا کیونکہ ترجمان القرآن کی وہ خاص اشاعت جس میں حقوق الزوجین کا مضمون مجموعی طور پر شائع ہوا ہے وہ جولائی و اگست ۱۹۴۱ء کا مشتر شمارہ ہے) علامہ نے ترجمان القرآن کی اس خاص اشاعت میں مسئلہ ایلا ر پر بحث کرتے ہوئے جو فقہی تحقیقات سپرد قلم فرمائی ہیں اس میں تو قلمی و صحافتی امانت و دیانت کو شاید بالائے طاق ہی رکھ دیا ہے۔

علامہ کی اس صحافتی چابکدستی کا پردہ چاک کرنے کیلئے اعتراف وہ مضمون لکھا تھا جس میں مختصراً صرف یہ بات دکھلائی گئی تھی کہ علامہ نے حصاص رازی کی احکام القرآن کے حوالہ سے جو فقہی تحقیقات سپرد قلم فرمائی ہیں اسے تحریف و تبدیل اور تخیل و تلبیس تو کہا جاسکتا ہے لیکن تحقیق تو کسی طرح بھی نہ کہا جاسکے گا۔

علامہ موصوف نے اس سلسلہ میں کہ ایلا ر میں حلف و قسم شرط ہے یا نہیں احکام القرآن جصاص رازی کے ص ۴۱ کے حوالہ سے جو بات اپنے مذکورہ بالا ترجمان میں نقل فرمائی ہے لطف کی بات یہ ہے کہ جصاص کی کتاب احکام القرآن میں دور دور تک اسکا پتہ نہیں ہے اب ہم نہیں کہہ سکتے کہ ص ۴۱ کا یہ حوالہ دفعہ ۴۲ کی طرف تو اشارہ نہیں ہے۔

ناظرین کی سہولت کیلئے ہم علامہ موصوف کی پوری عبارت کے ساتھ ساتھ بقدر ضرورت احکام القرآن کی اصل عبارت کا ترجمہ بھی بالمقابل نقل کئے دیتے ہیں

عبارت ترجمان القرآن للہودی :- "اس مسئلہ میں بعض فقہار نے حلف کی شرط لگائی ہے یعنی اگر مرد نے اپنی عورت کے پاس نہ جانے کی قسم کھائی ہے تب تو ایلا رہو گا اور یہ حکم جاری کیا جائے گا لیکن اگر قسم نہیں کھائی ہے تو خواہ وہ اس سے دس برس پہلے علیحدہ رہے اس پر ایلا کا اطلاق نہ ہو گا لیکن یہ بات قانون اسلامی کی اسپرٹ کیخلاف ہو قانون کا اصل اصول یہ ہے لا یكلف الله نفساً الا وسعها کسی شخص کو اسکی برداشت سے زیادہ تکلیف نہیں دی جاسکتی اس قاعدہ کلیہ کے ماتحت قرآن مجید میں عورت کی فطری قوت برداشت کا لحاظ کیا گیا ہے مقصد یہ کہ اگر سزا کے طور پر عورت کو صحبت محروم کیا جائے تو یہ سزا صرف اتنی مدت کیلئے ہونی چاہیے جو وہ برداشت کر سکتی ہو اس مدت سے زیادہ سزا دینے میں تکلیف مالاذیطاق ہے اور اسکا بھی اندیشہ ہے کہ کہیں عورت کسی اخلاقی فتنہ میں مبتلا نہ ہو جائے جس مرد و عورت کو محفوظ رکھنا اسلامی قانون کا اولین مقصد ہے پس آیت مذکورۃ الصدا کا اصل مدعا محض یہ ہے کہ عورت کو ترک صحبت کی تکلیف چار مہینے سے زیادہ مدت کے لئے نہ دی جائے۔ رہا قسم کھانا یا نہ کھانا تو یہ اس مسئلہ میں کوئی حقیقی اہمیت نہیں رکھتا قسم نہ کھانے سے عورت کی تکلیفیں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی اور قسم کھانے سے کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ صحابہ کرام میں جو لوگ ثقہ فی الدین کا شرف رکھتے تھے (مثلاً سیدنا علی و حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم) انکی رائے اس باب میں یہی تھی کہ ضرار کی نیت سے



عورت کو چھوڑ دینا ایلا رے خواہ قسم کھائی گئی ہو یا نہ کھائی گئی ہو۔

(۱) احکام القرآن للخصاص الحنفی ج ۱ ص ۴۲

(منقول از ترجمان القرآن بابت جولائی و اگست ۱۹۳۱ء)

(جلد ۱۸ - عدد ۴، ۵، ۶)

خلاصہ احکام القرآن للخصاص الحنفی : اور اس بارے میں اختلاف ہے کہ کوئی شخص کس وقت ایلا رکا مرتکب قرار پائے گا (۱) ایک مسلک تو وہ ہے جو حضرت علی اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بروایت حسن و عطا مروی ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے عدم قربت کی قسم اسوجہ سے کھاتا ہے کہ وہ ابھی دودھ پلا رہی ہے تو ایسی قسم کیوجہ سے (جو عذر معقول پر مبنی ہو) وہ شخص مؤبی نہ ہوگا بلکہ وہ صرف اسوقت ہی مؤبی ہوگا جبکہ اس نے عدم قربت کی یہ قسم عورت سے ناراض ہو کر اسے تکلیف دینے کی نیت سے کھائی ہو۔

(۲) دوسرا مسلک وہ ہے جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے دوسری روایت میں مروی ہے کہ عدم قربت کیلئے ہر قسم ایلا راقی جائیگی خواہ وہ رضار و خوشی کے ساتھ ہو یا غصہ و ناراضگی میں ہو۔ یہ قول ابراہیم (نحوی) ابن سیرین اور شعبی کا ہے

(۳) تیسرا مسلک وہ ہے جو حضرت سعید بن مسیب سے مروی ہے کہ ایلا صرف عدم قربت ہی کی قسم کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ

عدم کلام وغیرہ پر بھی اگر قسم کھالی تو یہ ایلا رہو جائے گا۔  
 (۴۱) چوتھا مسلک حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ عورت کو  
 صرف پھوڑ دینا ہی ایلا ہے قسم ہونے کی شرط نہیں ہے (احکام  
 القرآن ۳۵۵ و ۳۵۶)

(چند سطروں کے بعد فرماتے ہیں) اس بات میں کوئی اختلاف  
 نہیں ہے کہ ایلا میں یمین و قسم مضمحل ہے ایلا کا مطلب یہ ہے کہ  
 شوہر اپنی عورت سے صحبت ترک کرنے پر قسم کھالے کیونکہ اس بات  
 پر تو سب کا اتفاق ہے کہ ترک صحبت کی قسم کھانیوالا مولیٰ ہو جائیگا  
 (چند سطروں کے بعد) وہ روایت جو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ  
 سے مروی ہے کہ عورت کو صرف پھوڑے رکھنے ہی سے طلاق  
 ہو جاتی ہے (اسکے لئے حلف و قسم کی ضرورت نہیں ہے) تو یہ زوہر  
 قول شاذ ہے۔ اور کتاب اللہ کے خلاف ہے  
 (احکام القرآن ۳۵۶)

## کجا آں شور آشوری کجا ایں بے نمکی

ناظرین کرام ہر دو کاموں کو بغور ملاحظہ فرما کر فیصلہ فرمائیں کہ علامہ مودودی  
 نے اپنے ترجمان القرآن میں کس زور و شور سے ایلا میں ”حلف“ کی شرط کو  
 اسلامی قانون کی اسپرٹ کے خلاف قرار دیا ہے اور اپنے زعم میں ان صحابہ کرام کو  
 ”تفقه فی الدین“ کے شرف سے بھی محروم گردان دیا ہے جو ایلا میں ”حلف“ کو شرط

قرار دیتے ہیں اور علامہ نے اپنی دانست میں یہ تو بڑے کمال ہی کا مظاہرہ فرمایا ہے کہ اپنے پسندیدہ مسلک کے خلاف مسلک کی تردید کیلئے (جسے شاید وہ صرف بیچارے خفیہ ہی کا مسلک خیال کر رہے ہیں) ایک مشہور خفیہ المسلک محقق کی کتاب کا حوالہ بھی دیدیا ہے جس سے مقصد یہ تاثر دینا تھا کہ خفیہ کے خلاف تاہدات خود انھیں کی کتابوں میں موجود ہیں، واقعہ یہی ہے کہ ”تبیحی علیٰ پرچہ راغ“ رکھ کر اس طرح مظاہرہ تحقیق دوسرا کوئی آسانی سے ہرگز نہیں کر سکتا۔

”احکام القرآن“ کی ضروری عبادات کا مطلب خیر ترجمہ اور خلاصہ ادب پر نقل ہو چکا ملاحظہ فرمائیں کہ علامہ جصاص رازی نے ایلا میں ”حلف“ کے شرط ہونے یا نہ ہونے سے متعلق صحابہ کرام کے کیا کیا مسلک نقل کئے ہیں اور انکی تصریحات کے برخلاف علامہ اپنے ترجمان میں کیا ترجمانی فرما رہے ہیں؟ اور امام جصاص رازی کی تحقیق کے بالمقابل یہ بھی ملاحظہ فرمائیں کہ جصاص کے نزدیک وہ روایت جو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب ہے (کہ عورت کو صرف چھوڑے رکھنا ہی ایلا اور موجب طلاق ہے خواہ حلف ہو یا نہ ہو) تو یہ قول قول شاذ اور کتاب کے خلاف ہے لیکن علامہ کی ترجمانی کے مطابق یہی قول شاذ قانون اسلامی کی اسپرٹ کے عین مطابق ہے اور حضرات صحابہ کرام میں سے جو حضرات تفقہ فی الدین کا ثمر رکھتے تھے علامہ مودودی کے نزدیک وہ سب حضرت عبداللہ بن عمر کے ساتھ ہیں۔ حالانکہ امام جصاص کی تحقیق کے مطابق واقعہ یہ نہیں ہے جیسا کہ اوپر نقل ہوا کہ چار مسلکوں میں سے اوپر کے تین مسلکوں کے مطابق ایلا میں بالاتفاق ”حلف“ شرط ہے ہاں مسلک اول کے مطابق اس حلف میں قصد ضرر بکلی ملحوظ و مشروط ہے جو

دوسرے مسلک میں نہیں ہے صرف چوتھا مسلک جو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب ہے وہ ایسا ہے جس میں ایلا ریفر حلف بھی ہو جائے لیکن امام کے نزدیک یہ قول شاذ اور کتاب اللہ کے خلاف ہے۔

راقم السطور نے اپنے صدق والے مراسلہ میں علامہ کی اسی "چابکدستی" پر تبصرہ کیا تھا مگر صدق میں حوالہ کی اس کھلی ہوئی غلطی کی نشاندہی شائع ہو جانے پر بھی علامہ نے اس وقت تو بظاہر اسکا کوئی نوٹس لیا اور اسکی اصلاح و تصحیح سے متعلق کوئی اعلان نہ فرمایا۔ یہ بات قرین قیاس نہ کہی جاسکے گی کہ علامہ کو صدق میں شائع ہونے والے اس مراسلہ کی کوئی اطلاع نہ ہوئی ہوگی جبکہ اسوقت صدق ہی ایک اخبار تھا جس میں متعدد حضرات کے مضامین علامہ کے خلاف مسلسل شائع ہو رہے تھے ہاں یہ بات دوسری ہے کہ علامہ نے اسے اپنے شایان شان ہی نہ سمجھا ہو کہ وہ زبردست متکلم اسلام اور واحد امیر المسلمین ہو کر ایک ادنیٰ درجہ کے گناہ طالب علم کی بات پر کان دھریں جبکہ وہ اسوقت کبھی کسی بڑے سے بڑے عالم تک کو کبھی خاطر میں لانے کیلئے تیار نہ تھے۔

## ایک نظر ماضی پر بھی

یہ صرف مضمون نگاری نہیں بلکہ حقیقت ہے کہ علامہ نے اپنی انشا پرانی اور صحافت کے جادو سے بڑے بڑے حضرات اہل علم کو اپنی طرف متوجہ کیا بہت سے لوگ انکے گرد جمع ہو کر داخل حلقہ بھی ہوئے، اردو عربی زبانوں میں تصنیف لکھ کر مودودیت، کو نہ صرف ہندو پاک بلکہ بیرون ملک عربی ممالک میں پھیلنے اور

پھولنے پھلنے کا موقع دیا۔ ایسے سارے ہی حضرات جب تک علامہ کے چشمہ دار و  
 کے اشارہ پر کام کرتے رہے وہ سب زبردست صاحب علم و تحقیق اور مومن  
 و مجاہد رہے لیکن جہاں کسی کو علامہ کی کسی رائے و تحقیق سے اختلاف ہوا تو علامہ  
 نے فوراً ہی اس کا علم و فضل اس کی صلاحیت تحقیق اور اس کا جذبہ ایمان و مجاہدہ سب  
 ہی اس سے سلب فرمایا۔ اس سلسلہ میں کسی شخصیت کا نام لینے کی ضرورت نہیں  
 ہے یہ فہرست خاصی طویل ہے۔

## حوالہ بدل گیا

حوالہ کی غلطی پر صدق میں تنبیہ شایع ہونے کے کافی عرصہ کے بعد ایک بار  
 کچھ حضرات کے سامنے ”حقوق الزوجین“ کی اس بحث کا ذکر چل رہا تھا ضرورت  
 پڑی کہ اپنے مخاطب صاحبان کو ”احکام القرآن“ کے اسی مذکورہ بالا حوالہ کی  
 غلطی جو ترجمان القرآن میں موجود ہے دکھلا دوں انہیں سے ایک صاحب  
 فوراً وہ کتاب بھی لے آئے اب جو کتاب دیکھتا ہوں تو اپنی ”نظر بندی“ پر حیرت  
 کرتا ہوں کہ وہاں تو اپنی بات کی بنیاد ہی غائب ہے یعنی ”احکام القرآن جصاصی“  
 کی جگہ حوالہ میں ”احکام القرآن ابن العربی“ لکھا ہوا ہے۔

یا الہی یہ ماجرا کیا ہے؟ پہلے کیا تھا اور اب لکھا کیا ہے

حیرت سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر بار بار دیکھتا ہوں مگر اب تو ہر بار احکام القرآن ابن عربی  
 ہی کا حوالہ لکھا ہوا نظر آتا ہے اور احکام القرآن جصاصی شنفی کا دور دور تک تہہ نہیں  
 آفریں حال آیا کہ ذرا کتاب کا ایڈیشن تو دیکھا جائے یہ کوئی دوسرا ایڈیشن نہ ہو یہ خیال

صحیح نکلا ایڈیشن کی کیفیت دیکھنے پر پتہ چلا کہ یہ کوئی دوسرا ہی ایڈیشن ہے۔ جس ایڈیشن کی بنیاد پر صدق میں تنبیہ کی گئی تھی وہ اس سے پہلے کا ایڈیشن تھا۔ اب ہمیں پتہ چلا کہ علامہ کی یہ صحیفہ قلا بازی تھی جس سے ہم بے خبر تھے۔

اس دوسری اشاعت میں جو دیباچہ تھا اس میں یہ انکشاف بھی تھا کہ علامہ مودودی کو کسی صاحب نے خط کے ذریعہ حوالہ کی اس غلطی پر مطلع کیا تھا مگر یہ کچھ ذکر نہ تھا کہ ان مکتوب نگار صاحب کو حوالہ کی اس غلطی کا علم واحد اس براہ راست از خود ہوا تھا یا ان کا ذریعہ علم وہی مضمون صدق تھا؟

علامہ نے ان صاحب کے ذریعہ اطلاع پاکر بڑی فراخ دلی سے صرف حوالہ کی اصلاح قبول فرمائی کہ ایلا رے متعلق جس قول کو وہ قانون اسلامی کی اسپرٹ کے عین مطابق فرما چکے تھے بات تو اب بھی وہی رہی مگر حوالہ میں احکام القرآن للجصاص کی جگہ ابن العربی کا نام دیدیا گیا۔

خیر وہ بات آئی گئی ختم ہو گئی۔ اعتراف بھی قدرے مطمئن ہو گیا کہ چلو خیر علامہ نے کسی نہ کسی درجہ میں حوالہ کی غلطی کا وہی زبان ہی میں سہی اعتراف تو کر لیا اب جب تک حقوق الزوجین کے ساتھ یہ دیباچہ شائع ہوتا رہے گا پڑھنے والوں کو یہ ثبوت تو فراہم ہوتا رہے گا کہ موصوف اس سے پہلے داد تحقیق کس طرح دیکھے ہیں اور صحیفہ قلا بازی کے ذریعہ احکام القرآن للجصاص سے احکام القرآن ابن العربی تک پہنچ گئے ہیں

نہ رہے ہانس نہ سچے ہانسری

وہ جو کسی شاعر نے کہا ہے ”اور بھی کام ہیں دنیا میں محبت کے سوا“

تو اپنا معاملہ بھی کچھ اسی قسم کا ہے۔ مختلف مشاغل اور مصروفیات سے سابقہ رہتا ہے اتنی فرصت کسے کہ ہر تیسرے روز یہ خبر بھی لیتا رہے کہ علامہ نے کب اپنی کن سی عبارت کس کتاب میں صاف کر دی ہے اور کامیابی کے ساتھ پسپائی قبول کر لی ہے۔ ابیہ اس مشغولی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک بار پھر کچھ لوگوں کے سامنے علامہ کی اس صحافتی دیانت پر تبصرہ کر رہا تھا اور اپنی بات کو پایہ ثبوت تک پہنچانے کیلئے ضرورت محسوس ہوئی کہ ان حضرات کو دیباچہ کی وہ وضاحت دکھلا کر علامہ جیسے محقق سے بھی حوالہ کی غلطی صادر ہو جانے کا یقین تو دلایا جائے مگر واہ رے علامہ واہ! ہم قائل ہو گئے آپ کی فزکاری کے۔ اب جو کتاب منگا کر دیکھی جاتی ہے تو وہاں وہی مثل سامنے آتی ہے کہ ”نہ رہے بانس اور نہ بچے بانسری“ یعنی اب تو شروع کتاب میں وہ دیباچہ ہی نہیں ہے ہمیں کسی صاحب کے خط کے حوالہ سے پچھلے حوالہ کی غلطی کا خاموش اعتراف موجود تھا نتیجہ یہ ہوا کہ علامہ سچے اور ہم جھوٹے۔

اب تو صورت حال یہ ہو گئی ہے کہ علامہ نے ایلا کی بحث کو جس انداز میں میں پہلے تحریر فرمایا تھا اس ساری عبارت کا بالکل حلیہ ہی بدل دیا ہے۔ اب تو یہ پہچانا بھی مشکل ہو گیا ہے کہ یہ حقوق الزوہین کا وہی بحث ہے اور اسکے وہی مصنف ہیں یا کسی دوسرے نے اسی نام سے کوئی رسالہ تصنیف فرما دیا ہے۔ لیکن حوالہ میں ابن عربی کا ذکر خیر دیکھ کر گمان ہوتا ہے کہ رسالہ اور مصنف تو ایک ہی ہے لیکن عبارات کی صحافتی قلابازیوں نے اسکا حلیہ بالکل بد لکر رکھ دیا ہے۔

۹۴۱ء میں شروع ہونے والے مضمون ”حقوق الزوہین“ کی متعلقہ عبارت



کے ساتھ ساتھ اب ذرا سولہ سال بعد ۱۹۵۴ء میں شائع ہونے والے حقوق الزوجین (طبع چہارم کی عبارت کا جیلہ ملاحظہ فرمائیں)۔

ہر دو عبارات متعلقہ نقل کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ طبع چہارم کے مختصر دیباچہ کی کبھی چند سطریں ملاحظہ میں آجائیں۔ علامہ فرماتے ہیں کہ:۔  
 ”سترہ سال ہوئے یہ کتاب ایک مسلسل مضمون کی شکل میں شائع کی گئی تھی اور دس سال سے یہ کتابی شکل میں شائع ہو رہی ہے۔ اگرچہ اول روز ہی یہ تصریح کر دی گئی تھی کہ فقہ حنفی کے ازدواجی ضابطہ میں جو اصلاحات اسکے اندر تجویز کی گئی ہیں انہی حیثیت فتویٰ کی نہیں بلکہ تجاویز کی ہے جو علماء کے سامنے اس غرض سے پیش کی جا رہی ہیں اگر وہ انکو شرعی اور عقلی دلائل کے لحاظ سے درست پائیں تو ان کے مطابق فتویٰ میں تبدیلی کر دیں۔ لیکن اسکے باوجود آج تک نہ تو اسکی تجاویز پر سنجیدہ غور کیا گیا اور نہ کسی نے علمی تنقید کی تکلیف اٹھائی البتہ اسے میرے خلاف فتنہ برپا کرنے کا ذریعہ پہلے بھی بنایا گیا تھا اور اب بھی بنایا جا رہا ہے فانی اللہ المشتکی

اس تمہید کے بعد حقوق الزوجین طبع اول اور طبع چہارم کی عبارات کا تقابلی مطالعہ فرمایا جائے۔ ملاحظہ ہو:۔

عبارات حقوق الزوجین (طبع اول ۱۹۳۱ء)

(مبحث ایلاء)

”اس مسئلہ میں بعض فقہاء نے ہلف کی شرط لگائی ہے یعنی اگر مرد

اپنی عورت کے پاس نہ جانے کی قسم کھائی ہے تب تو ایلا رہوگا اور یہ حکم جاری کیا جائے گا لیکن اگر قسم نہیں کھائی ہے تو خواہ وہ دس برس بھی اس سے علاحدہ رہے اس پر ایلا کا اطلاق نہ ہوگا۔ لیکن یہ بات قانون اسلامی کی اسپرٹ کے خلاف ہے قانون کا اصل الاصول یہ ہے لا یمکلف اللہ نفساً الا و منعماً کسی شخص کو اسکی برداشت سے زیادہ تکلیف نہیں دی جاسکتی۔ اس قاعدہ کلیہ کے ماتحت قرآن مجید میں عورت کی فطری قوت برداشت کا لحاظ کیا گیا ہے۔ مقصد یہ کہ اگر سزا کے طور پر عورت کو صحبت سے محروم کیا جائے تو یہ سزا صرف اتنی مدت کے لئے ہونی چاہیے جسکو وہ برداشت کر سکتی ہو اس مدت سے زیادہ سزا دینے میں تکلیف مالا یطاق ہے اور اسکا بھی اندیشہ ہے کہ کہیں عورت کسی اخلاقی فتنہ میں مبتلا نہ ہو جائے جس سے عورت مرد کو محفوظ رکھنا اسلامی قانون کا اولین مقصد ہے پس آیت مذکورہ کا اصل مدعا محض یہ ہے کہ عورت کو ترک صحبت کی تکلیف چار مہینے سے زیادہ مدت کیلئے نہ دی جائے۔ رہا قسم کھانا یا نہ کھانا تو یہ اس مسئلہ میں کوئی حقیقی اہمیت نہیں رکھتا۔ قسم نہ کھانے سے عورت کی تکلیف میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی اور قسم کھالینے سے کوئی اضافہ نہیں ہوتا صحابہ کرام میں سے جو لوگ تفقہ فی الدین کا شرف رکھتے تھے (مثلاً ایدہ علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت عبداللہ بن عمر) ان کی رائے اس بارے میں یہی تھی کہ ضرار کی نیت سے عورت کو چھوڑ دینا

ایلا رہے خواہ قسم کھائی گئی ہو یا نہ کھائی گئی ہو" (احکام القرآن  
للجصاص تحقیق ج ۲ ص ۴۲)

(ترجمان القرآن بابت جولائی و اگست)

جلد ۸، عدد ۴، ۵، ۶

عبارت حقوق الزوجین (طبع چہارم ۱۹۵۷ء)  
(مبجٹ ایلا ۶)

"اس مسئلہ میں بعض فقہار نے حلف کی شرط لگائی ہے یعنی اگر مرد نے  
اپنی عورت کے پاس نہ جانے کی قسم کھائی ہے تب تو ایلا رہوگا اور یہ حکم  
جاری کیا جائے گا لیکن اگر قسم نہیں کھائی ہے تو خواہ وہ بیوی سے ناراض  
ہو کر دس برس بھی اس سے علیحدہ رہے اس پر ایلا رکھا اطلاق نہ ہوگا لیکن  
مجھے اس رائے سے اتفاق نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں میرے دلائل  
حسب ذیل ہیں" (حقوق الزوجین طبع چہارم ص ۲۹)

۱۔ بعد علامہ نے طبع اول کی وہ ساری عبارتیں (جس میں قانون اسلامی کی اسپرٹ  
اور قانون کا اصل الاصول وغیرہ بیان فرماتے ہوئے تفقہ فی الدین کا شرف رکھنے والے  
صحابہ کرام کے اقوال کی تائید کے ساتھ اپنا پرندیدہ مسلک بیان فرمایا تھا) حذف  
فرمادی ہیں اور ص ۲۹ سے ص ۳۱ تک اپنی صلاحیت اجتہاد کا مظاہر فرماتے  
ہوئے متعدد قیاسات اور عقلی استدلالات پیش فرمائے ہیں جو اگرچہ اپنے اپنے  
ذاتی استدلالات پر گزرتے ہیں لیکن موصوف نے انہیں "میرے دلائل" نہ مارا کہ  
اپنا بتایا ہے، خوف طوالت سے ہم حذف کرتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں، پھر ص ۳۱ پر

فرماتے ہیں :-

”ان دجہ سے میرے نزدیک فتویٰ فقہائے مالکیہ کے مسلک پر ہونا چاہیے جو فرماتے ہیں کہ اگر شوہر بیوی کو تکلیف دینے کی نیت سے مباشرت ترک کر دے تو اس پر بھی ایلا رہی کا حکم لگایا جائے گا اگرچہ اس نے قسم نہ کھائی ہو کیونکہ ایلا پر پابندی عائد کرنے سے شارع کا مقصود ضرر کو روکنا ہے اور یہ علت اس ترک مباشرت میں بھی پائی جاتی ہے جو حلف کے بغیر بقصد ضرر کیا جائے“ (حوالہ حاشیہ پر یہ ہے) (احکام القرآن ابن عربی جلد ۱ ص ۱۷۷ اور ہدایۃ المجتہد ابن اسد ج ۱ ص ۷۵)

## قابل غور باتیں

”حقوق الزوجین“ طبع اول اور طبع چہارم کی عبارات میں مندرجہ ذیل باتیں قابل غور ہیں :-

(الف) ہر دو عبارات میں ”ایلا“ کیلئے ”حلف“ کا شرط ہونا صرف بعض فقہار کا مسلک بتایا گیا ہے جس کا مطلب دوسرے نکتوں میں یہ نکلتا ہے کہ جہود فقہار کرام ایلا کیلئے ”حلف“ کو شرط نہیں مانتے

(ب) طبع اول میں اسی مسلک کو ان صحابہ کرام ہمسک بھی قرار دیا دیا گیا ہے جو علامہ کے زعم میں تفقہ فی الدین کے ثروت سے مشرف تھے مگر طبع چہارم میں خدا جانتے کس وجہ سے استدلال کا یہ پہلو یکسر اڑا دیا گیا ہے۔

اونہی دانست یادانستہ افکارودہ اند

(ج) طبع اول میں تو ائمہ اربعہ میں سے کسی امام کا مسلک و نامزد طور پر ذکر ہی نہیں کیا گیا تھا لیکن طبع چہارم کے اول بحث میں بعض فقہار کے عنوان سے ایک مسلک ذکر فرمایا گیا ہے (جو طبع اول میں بھی مذکور ہے) اور صرف طبع چہارم کے تقریباً آخری بحث میں صرف امام مالک علیہ الرحمہ کے نام سے ایک دوسرا مسلک بھی ذکر فرمایا گیا ہے جو علامہ کا پسندیدہ مسلک ہے۔ اس موقع پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اول بحث میں بعض فقہار سے علامہ کی مراد کیا ہے اور اس سے کون حضرات مراد ہیں بنظر الفاظ عبارت کا تاثر تو یہی ہے کہ جمہور فقہار کا مسلک اس کے مخالف ہے لیکن طبع چہارم کے آخری بحث میں صرف حضرت امام مالک علیہ الرحمہ کا ذکر یہ پتہ دیتا ہے کہ دوسرے ائمہ ثلاث ان کے ساتھ نہیں ہیں اگر یہ تاثر صحیح اور مطابق واقعہ ہے تو پھر مسلک جمہور تو وہ مسلک قرار پائے گا جسے علامہ اول بحث میں "بعض فقہار" کا مسلک قرار دے چکے ہیں۔

ایسی صورت میں مسلک جمہور کے لئے "بعض فقہار" کی تعبیر علامہ کی فنکارانہ صفاقت پر ایک روشن دلیل ہی کہی جاسکتی ہے۔

یہ تنقیحات تو جملہ معترضہ کے طور پر زیر بحث آگئیں ورنہ اس مسئلہ پر تفصیلی بحث کا موقع تو آیت ایلار کی تفسیر میں آئے گا انشاء اللہ تعالیٰ اس وقت ہم اس مسئلہ کو مالہ و ما علیہ کے ساتھ پوری تفصیل سے ذکر کریں گے۔

## لوٹ تیجھے کو زرا ابلق ایام ابھی

تفہیم القرآن کے دیباچہ و مقدمہ پر جائزہ و تبصرہ بفضلہ تعالیٰ کافی تفصیلی انداز میں پیش خدمت کیا جا چکا ہے اس طرح گویا ہم تفہیم القرآن سمجھنے کی کوشش میں ایک مرحلہ طے کر چکے ہیں اور قاعدہ سے تو اب اصل تفسیر تفہیم القرآن کے جائزہ و تبصرہ کا مرحلہ شروع ہو جانا چاہیے مگر ہم نے اپنی ذہنی ترتیب کار کے مطابق دیباچہ و مقدمہ سے متعلق علامہ مودودی کے بعض ارشادات پر اپنا تبصرہ ملتوی کر دیا تھا کیونکہ موصوف کے وہ ارشادات اتنی آزاد ترجمانی اور تفسیری خواہش کی پالیسی سے متعلق تھے اور ہمارے خیال میں ان پر بحث و گفتگو کا صحیح موقع و محل اسی وقت تھا جب ہم دیباچہ و مقدمہ کے اور دوسرے مباحث سے فارغ ہو کر موصوف کی ترجمانی و تفسیر کو موضوع تبصرہ بنائیں۔

چنانچہ ہم اب جبکہ موصوف کی ترجمانی و تفسیر کا بالاستیعاب جائزہ لینا چاہتے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بطور نمونہ چند مثالیں موصوف کی ترجمانی و خواہشی تفسیر سے متعلق بھی پیش کر دیں۔

اس مقصد کیلئے ہم آپ کو ذرا دیر کیلئے پھر دوبارہ علامہ کے ”دیباچہ تفہیم“ کی طرف واپس لے چلتے ہیں اور دیباچہ تفہیم کے چھوڑے ہوئے دو اقتباسات اپنے تبصرہ کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے ہمارے تبصرہ کا یہ حصہ تفہیم کے دیباچہ و مقدمہ اور اصل تفسیر سے متعلق بحث و تبصرہ کی ایک درمیانی کڑی ہے۔

علامہ موصوف دیباچہ تفہیم میں اپنی آزاد ترجمانی کی تشریح فرماتے ہوئے

اپنی صفائی اس معصومانہ انداز میں پیش فرماتے ہیں :-

## اقتباس اول

”اس طرح کے آزاد ترجمے کے لئے یہ تو بہر حال ناگزیر محنت کہ  
نفظی پابندیوں سے نکل کر ادائے مطلب کی جہارت کی جائے  
لیکن معاملہ کلام الہی کا محقق اسلئے میں نے ڈرتے ہی ڈرتے یہ  
آزادی برتی ہے جس حد تک احتیاط میرے امکان میں تھی اس کو  
ملحوظ رکھتے ہوئے اس امر کا پورا اہتمام کیا ہے کہ قرآن کی اپنی عبارت  
جتنی آزادی زبان کی گنجائش دیتی ہے اس سے تجاوز نہ ہونے پائے“  
(دیباچہ تفہیم ص ۱۱)

ناظرین کرام! اقتباس بالا کو بغور ملاحظہ فرمائیں مجھے پوری امید ہے کہ غالباً میری  
طرح آپ بھی اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ موصوف نے اس پارہ عبارت میں اپنی آزاد ترجمانی  
اور تفسیر نگاری کی پالیسی متعین فرمائی چاہی ہے۔

راقم السطور کے نزدیک علامہ کا مدعائے نگارش اور عبارت بالا کا مرکزی  
خیال یہی ہے اور اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ کا قلب مبارک خدا تعالیٰ کے خوف و خشیت  
اور احتیاط و تقویٰ سے ایسا لبریز ہے کہ بالکل غیر ارادی طور پر ہی خوف و خشیت کے  
کچھ اثرات نہاں خانہ دل سے پھلک کر زبانِ قلم کے ذریعہ صفحاتِ تفہیم پر کھلی بکھر بکھر  
گئے ہیں۔

اقتباس بالا کے خط کشیدہ فقروں کے بین بین اگر پڑھنے کی کوشش



توصیف پتہ چلتا ہے کہ کوئی جذبہ مستور علامہ کو انہی اس آزاد ترجمانی سے کس کس طرح روک رہا تھا مگر موصوف ایسے ناگزیر حالات میں تھے کہ انتہائی مجبوری کے ساتھ انہیں لفظی ترجمہ کی پابندیاں توڑ کر اسے مطلب کی جسارت کرنی پڑی اور کلام الہی ہونے کی بنا پر معاملہ کی نزاکت کا پورا پورا احساس رکھ کر بہت ہی ڈرتے ڈرتے انہوں نے یہ آزادی برتی ہے اور اسمیں "ممکن حد تک احتیاط کو ملحوظ رکھتے ہوئے اسکا پورا اہتمام فرمایا ہے کہ قرآن کی اپنی عبارت جتنی آزادی زبان کی گنجائش دیتی ہو اس سے آگے نہ بڑھنے پائے۔

اللہ اللہ! کیا ٹھکانا ہے اس ورع و تقویٰ کا؟ اس خوف ورجا امید و بیم کا؟ کیا حسین و دکنش مرقع ہے علامہ کا یہ شر پارہ عبارت کہ موصوف نے ایک طرف تو اظہار خوف و خشیت اور اشتہار ہذر و احتیاط میں تکرار الفاظ اور تنوع اسالیب کا سہارا لیتے ہوئے اپنے خوف و خشیت کی وہ تصویر کھینچ کر رکھ دی ہے جس سے اچھی تصویر آسانی سے کھینچی جلی نہ جاسکتی تھی اور دوسری طرف ایک بہت ہی سادہ و موصوم اور انتہائی مبہم ہونے کے ساتھ ساتھ بید معنی نیز ساریہ فقر و بخلی جوڑ دیا کہ "قرآن کی اپنی عبارت جتنی آزادی زبان کی گنجائش دیتی ہو اس سے آگے نہ بڑھنے پائے،"

## اب یہ بات کسے معلوم کہ

قرآن کی اپنی عبارت علامہ کے نزدیک کتنی آزادی زبان کی گنجائش رکھتی ہے؟ اور وہ کس موقع پر اپنی اس پیشگی اعلان فرمودہ گنجائش سے کیا فائدہ حاصل فرمالینا چاہیں گے؟ اور ایسی صورت میں کہ علامہ نے بقلم خود اپنے



تفہیم القرآن جلد اول میں ص ۶۴ پر سورہ بقرہ کو ع ۴۷ آیت ۲۴ کی آزاد ترجمانی اور تفسیری حاشیہ ملاحظہ ہو

حضرات ناظرین کی سہولت کے پیش نظر ہم اس آیت کے مختلف تراجم بھی تقابلی مطالعہ کیلئے پیش کر رہے ہیں کہ مختلف تراجم بیک نظر سامنے آجائیں اور علامہ کی آزاد ترجمانی کے پردے میں چھپی ہوئی آزادی اور آزادی بے نقاب ہو جائے اور معلوم ہو جائے کہ اس آیت متعلقہ کا ترجمہ ہمارے دوسرے اکابر و مفسرین نے کیا فرمایا ہے اور علامہ نے اسکی آزاد ترجمانی فرماتے ہوئے کیا عبارت فرمائی ہے اور قرآن مجید میں آئے ہوئے لفظ نے انھیں کس حد تک واقعی آزادی زبان کا فائدہ دیا ہے اور کس حد تک وہ زبردستی بڑھ گئے ہیں۔

### آیت ۳۴ سورہ بقرہ کو ع ۴۷ بابت سجدہ ملائکہ

آیت شریف: **وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ فَسَجَدُوا إِلَّا إِبْلِيسَ أَبَىٰ وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكَافِرِينَ**  
آیت مذکورہ بالا کے متعدد تراجم :-

(۱) ترجمہ حضرت شاہ عبدالقادر صاحب علیہ الرحمہ :-

۱۔ "جب ہم نے کہا فرشتوں کو سجدہ کرو آدم کو تو سجدہ میں گر پڑے

مگر ابلیس نے قبول نہ رکھا اور تکبر کیا اور وہ تھا منکروں کا"

(۲) ترجمہ حضرت شاہ رفیع الدین صاحب علیہ الرحمہ :-

۲۔ "جب کہا ہم نے واسطے فرشتوں کے سجدہ کرو واسطے آدم کے

پس سجدہ کیا مگر شیطان نے نہ مانا اور تکبر کیا اور کھٹکا کافروں سے  
(۳) ترجمہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب علیہ الرحمہ :-

۳۔ "اور جب ہم نے حکم دیا فرشتوں کو سجدہ کرو آدم کو تو سب  
سجدے میں گر پڑے مگر شیطان اس نے نہ مانا اور تکبر کیا اور وہ کھٹکا  
کافروں میں کا"

(۴) ترجمہ مولانا عبدالحق صاحب حقانی علیہ الرحمہ

۴۔ "اور جبکہ ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو انھوں نے  
سجدہ کیا مگر ابلیس نے اس نے انکار اور تکبر کیا اور وہ کافروں میں  
سے ٹھکا"

(۵) ترجمہ حضرت حکیم الامتہ مولانا اثرات صاحب تھانوی علیہ الرحمہ

"اور جس وقت ہم نے حکم دیا فرشتوں کو (اور جنوں کو بھی) کہ سجدہ  
میں گرجاؤ آدم کے سامنے سو سب سجدہ میں گر پڑے بجز ابلیس کے  
اس نے کہنا نہ مانا اور غرور میں آگیا اور ہو گیا کافروں میں سے"

(۶) ترجمہ مولانا عاشق الہی صاحب میرٹھی علیہ الرحمہ

۶۔ "اور جب ہم نے کہا فرشتوں سے سجدہ کرو آدم کو تو سب نے  
سجدہ کیا بجز شیطان کے اس نے انکار کیا اور تکبر کیا اور کافر بن گیا"

(۷) ترجمہ مولانا حافظ فتح محمد خان صاحب جالندہری علیہ الرحمہ

"اور جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کے آگے سجدہ کرو تو وہ سب  
سجدے میں گر پڑے مگر شیطان نے انکار کیا اور غرور میں آکر کافر بن گیا"

(۸) علامہ مودودی کی ترجمانی :-

”پھر جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کے آگے جھک جاؤ  
تو سب جھک گئے مگر ابلیس نے انکار کیا وہ اپنی بڑائی کے گھنڈ  
میں پڑ گیا اور نافرمانوں میں شامل ہو گیا“

(تفہیم القرآن ج ۱ ص ۶۴ چودھواں ایڈیشن)

ناظرین کرام نوٹ فرمالیں !

کس طرح علامہ نے جملہ مترجمین سے الگ ہو کر اپنی آزاد ترجمانی کی نئی راہ  
نکالی ہے اور سجدہ کا متعارف ترجمہ جسے مستند و معتمد مفسرین نے بالعموم اختیار کیا ہے (چھوڑ کر  
صرف جھک جانے ہی کو سجدہ قرار دیدیا ہے۔ حالانکہ حضرت شاہ عبدالقادر صاحب و شاہ  
رفیع الدین صاحب سے لیکر اب تک جملہ مستند و معتبر، متداول و متعارف تراجم میں ہر مترجم  
نے حکم سجدہ سے یہی متعارف سجدہ مراد لیا ہے، اور قاعدہ سے یہی مراد لینا بھی چاہیے  
کیونکہ قرآن مجید دین و شریعت کی کتاب ہے اس میں اصل و حقیقت یہی ہے کہ یہاں  
لفظ سجدہ سے اسکے شرعی و اصطلاحی معنی ہی مراد لئے جائیں۔ اس موقع پر سجدہ کا  
نہی مفہوم مراد لینا بالکل خلاف حقیقت ہوگا اور حقیقت سے عدول اسی وقت صحیح  
ہو سکتا تھا جب یہ معنی روایات حدیث سے ثابت بھی ہوتے اس لئے آیت بالا میں  
سجدہ سے وہی ”متعارف سجدہ“ مراد ہوگا۔

احادیث سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ قرآن مجید کے مخاطب اول حضرت  
رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت میں آئے ہوئے سجدہ کو اسکے متعارف  
شرعی معنی ہی پر محمول فرمایا ہے۔ مفسر کبیر علامہ ابن کثیر علیہ الرحمہ نے اپنی تفسیر میں چند روایات

نقل فرمائی ہیں ملاحظہ ہوں :

(۱) حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرماتے ہیں کہ روز قیامت جملہ مومنین طلب شفاعت کیلئے حضرت آدم علیہ السلام کی پیرستہ میں حاضر ہونگے اور کہیں گے ”آپ تمام انسانوں کے باپ ہیں آپ کو اللہ تعالیٰ نے اپنے دست قدرت سے پیدا فرمایا اور آپ کے سامنے اپنے فرشتوں کو سربسجود کیا اور آپکو ہر چیز کے نام سکھائے لہذا ہمارے آپ شفاعت فرمادیں اور ہمیں یہاں سے نجات دلائیں آپ فرمائیں گے کہ میں اس لائق نہیں ہوں“ (پوری حدیث کافی طویل ہے حسب موقع اسی قدر پر اکتفا کیجاتی ہے) (بخاری شریف کتاب التفسیر و تفسیر ابن کثیر ص ۱۳۲)

(۲) اسی تفسیر ابن کثیر میں ص ۱۳۶ پر وہ روایت ہے جس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے درخواست فرمائی ہے کہ ”اے میرے پروردگار مجھے ان آدم کو دکھلائیے جنہوں نے ہم سب کو اور خود اپنے آپ کو جنت سے نکلوا دیا پھر جب وہ ان کے ساتھ اکٹھے ہوئے تو حضرت موسیٰ نے فرمایا کہ آپ ہی وہ آدم ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے دست قدرت سے پیدا فرمایا اور ان میں اپنی روح پھونکی اور انکو اپنے فرشتوں سے سجدہ کرایا“ (تفسیر ابن کثیر ص ۱۳۶ جمع الفوائد ص ۱۳۶)

(۳) تیسری روایت تفسیر فتح العزیز (تفسیر عزیزی) میں ہے ”ابن ابی الدنیا مکائد الشیطان میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ شیطان نے ایک روز حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو رسالت سے سرفراز فرمایا ہے اور ہم کلام ہوا ہے میں گتہ گار تو بہ کرنا چاہتا ہوں آپ

میری سفارش فرمادیں اور میرے لئے دعا فرمائیں۔ آپ نے فرمایا اچھا میں دعا کر دوں گا۔ اسکے بعد آپ نے اپنی مناجات کے وقت دعا فرمائی، حق تعالیٰ کی طرف سے جواب میں وحی آئی کہ میں نے آپکی سفارش قبول کی اسکی توبہ مان لی اب اس سے کہئے کہ آدم کی قبر کی جانب سجدہ کرے۔ آپ نے اسکو بتایا تو بولا کہ جب میں تے زندہ کو سجدہ نہ کیا تو اب مردہ کو کیا کروں گا۔ (تفسیر عزیزی ج ۱ ص ۱۴۱)

(۴۱) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب ابن آدم (انسان) آیت سجدہ پڑھتا ہے اور سجدہ تلاوت کرتا ہے تو شیطان کنارہ کھڑا ہو کر روئے لگتا ہے اور کہتا ہے کہ ہائے ہلاکت ابن آدم کو سجدہ کا حکم دیا گیا تو اُسے سجدہ کر لیا اب اسکے لئے توبہ بنت ہے اور مجھے سجدہ کو کہا گیا تو میں نے نافرمانی کی لہذا میرے لئے دوزخ ہے (مسلم شریف مسند امام احمد بحوالہ مظہری ج ۵ ص ۵۵ بغوی بر ایل کثیر ج ۱ ص ۱۴۱)۔

الغرض روایات حدیث اور حضرات مفسرین کے مشہور اور معتد اقوال کی روشنی میں یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ آیت زیر بحث میں حکم سجدہ سے یہی متعارف سجدہ ہی مراد ہے سجدہ کے شرعی اور اصطلاحی معنی چھوڑ کر لغوی معنی مراد لینا روایت و درایت دونوں ہی کے خلاف ہے۔

اور علامہ نے تو اپنے تفسیری حاشیے میں اور ترقی فرماتے ہوئے سجدہ کو اطاعت و انقیاد وغیرہ کے مفہوم میں مشتمل ثابت کرنے کی کوشش کی ہے جو صرف انکی اپنی "اتج" اور تفسیر بالرائے ہی کہی جائیگی۔

انشار اللہ تعالیٰ ہم اپنی اس کتاب کی جلد دوم میں علامہ کی تفہیم پر



مزید روشنی ڈالیں گے

## انگلی پکڑتے پکڑتے پہنچے پکڑنا

ہم سمجھتے ہیں کہ علامہ کی شان میں اس محاورہ کا استعمال شاید بعض ان حضرات کو پسند نہ آئے جو علامہ کی ذہنی غلامی ہی کو اپنا سرمایہ افتخار تصور فرماتے ہوں لیکن ہم مغذو میں اور ہمیں اپنے قصور انشاء و تحریر کا اعتراف بھی ہے کہ علامہ کی اس صحافتی چابکدستی کیلئے کوئی دوسرا موزوں ترین محاورہ ہم تلاش نہ کر سکے اور مجبوراً ہمیں موصوفہ کیلئے یہ محاورہ استعمال کرنا پڑا۔

اس محاورہ کے استعمال کی ضرورت یوں پڑی کہ علامہ نے آیت بالا کی آزاد ترجمانی فرماتے ہوئے مفہوم آیت میں جو تبدیلی لانا چاہی تھی وہ تو موصوفہ کی طرف آزاد ترجمانی سے پوری نہ ہو سکی تھی اسلئے موصوفہ کو مزید ضرورت ہوئی کہ وہ اپنے مدعاے دلی کی تکمیل کیلئے اس موقع پر تفسیری و تشریحی حاشیہ بھی تحریر فرمادیں چنانچہ موصوفہ نے اسی آیت ۴۲ سے متعلق ایک حاشیہ بھی تحریر فرمایا ہے جس میں تحریر فرماتے ہیں:

(حاشیہ نمبر ۴۵) "اسکا مطلب یہ ہے کہ زمین اور اس سے تعلق

رکھنے والے طبقہ کائنات میں جس قدر فرشتے مامور ہیں ان سب کو

انسان کیلئے مطیع و مسخر ہو جانے کا حکم دیا گیا چونکہ اس علاقہ میں اللہ کے

حکم سے انسان کو خلیفہ بنایا جا رہا تھا اسلئے فرمان جاری ہوا کہ صحیح یا

غلط جس کام میں بھی انسان اپنے ان اختیارات کو جو ہم اسے عطا

کر رہے ہیں استعمال کرنا چاہئے اور ہم اپنی مشیت کے تحت اسے

ایسا کر لینے کا موقع دیدیں تو مختارِ افراس ہے کہ تم میں سے جس جس کے دائرہ عمل سے وہ کام متعلق ہو وہ اپنے دائرہ کی حد تک اسکا ساتھ دے وہ پوری کرنا چاہے یا نماز پڑھنے کا ارادہ کرے، نیکی کرنا چاہے یا بدی کے ارتکاب کیلئے جائے دونوں صورتوں میں جب تک ہم اسے اسکی پسند کے مطابق عمل کرنے کا اذن دے رہے ہیں تمہیں اسکے لئے سازگاری کرنی ہوگی (چند سطروں کے بعد فرماتے ہیں)

فرشتوں کو آدم کیلئے سر بسجود ہو جانے کا جو حکم دیا گیا اسکی نوعیت کچھ اسی قسم کی تھی، ممکن ہے صرف مسخر ہو جانے ہی کو سجدہ سے تعبیر کیا گیا ہو مگر یہ بھی ممکن ہے کہ اس انقیاد کی علامت کے طور پر کسی ہر فعل کا بھی حکم دیا گیا ہو اور یہی زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔  
(حاشیہ ۵۷ آیت ۲۵ و ۲۶ جلد اول)

## آیت بالا کے مفہوم میں تحریف اور سجودِ آدم سے ہٹا انکار

تفہیم القرآن کا یہ حاشیہ پوری تفصیل کے ساتھ آپ نے ملاحظہ فرمایا اب ہم چاہتے ہیں کہ علامہ کے اس حاشیہ کے پوشیدہ مندرجات کو بھی اپنی طرح واضح و آشکار کر دیں کہ ہمارے ناظرین بھی ہماری طرح علامہ کی اس صحافتی چابکدستی سے باخبر اور اس فنکارانہ تحریف معنوی سے خبردار بھی ہو جائیں

اس حاشیہ کے مندرجات و مضمرات کو موٹے موٹے چند غلط فہمیاں ہیں

سمجھا جاسکتا ہے۔

(الف) فرشتوں کو سرے سے سجدہ آدم کا حکم ہی نہیں کیا گیا تھا۔  
 (ب) سجدے سے مراد انقیاد و تسخیر ہے یا بطور علامت انقیاد کسی ظاہری فعل کا حکم بھی دیا گیا ہوگا۔

(ج) وہ ظاہری فعل کبھی سجدہ تو بہر حال نہیں تھا۔  
 (د) حکم سجدہ کے مخاطب و مامور تمام فرشتے نہ تھے بلکہ صرف طبقہ زمین کے فرشتے مامور تھے۔

(ه) مسجودیت یعنی تسخیر و انقیاد کا یہ اعزاز کبھی مخصوص طور پر حضرت آدم کیلئے نہ تھا بلکہ یہ سازگاری عام انسانوں کے لئے تھی۔

(و) خدا تعالیٰ نے عام انسانوں کو بدی کے ارتکاب کا اذن کبھی دے رکھا ہے۔  
 (ز) انسان جو برائی یا بدی کرتا ہے فرشتوں کیلئے اس سازگاری یا تعاون کرنا خدا تعالیٰ نے انکے ذمہ فرض فرما دیا ہے۔

ہر ایک عنوان سے متعلق اب ترتیب وار تفصیل بھی ملاحظہ ہو:-

(الف) علامہ فرماتے ہیں کہ فرشتوں کو سرے سے سجدہ آدم کا حکم ہی نہیں کیا گیا تھا بلکہ ان سے تو صرف جھکنے کو کہا گیا تھا چنانچہ وہ سب جھک بھی گئے تھے (مگر واہ رسے ابلیس کم نجت ذرا سا جھکنے کے لئے بھی تیار نہ ہوا) یا انھیں حضرت آدم کیلئے مطیع و مسخر ہو جانے اور انکے لئے سازگاری کرنے کا حکم دیا گیا ہوگا اور یہ کبھی ممکن ہے کہ اس انقیاد کی علامت کے طور پر کسی ظاہری فعل کا بھی حکم دیدیا ہو جسکی کوئی صحیح صورت و کیفیت علامہ متعین بھی نہیں فرما سکے ہیں ہو سکتا ہے فرشتوں سے یہ کہا گیا ہو کہ وہ سب حضرت آدم کو سلوٹ (SALUTE) دیں جیسا کہ آجکل ہوتا ہے۔

ہم اوپر حدیث شریف کی چند روایات نقل کر آئے ہیں جن سے یہ بات بالکل واضح طور پر متعین ہو جاتی ہے کہ فرشتوں کو حضرت آدم علیہ السلام کے آگے حقیقی سجدہ ہی کا حکم دیا گیا تھا اور عام مفسرین نے یہی تفسیر اختیار فرمائی ہے جیسا کہ اردو تراجم سے سات مختلف ترجمے بھی ہم نقل کر آئے ہیں اب عربی تفسیروں میں سے کبھی چند حضرات مفسرین کی تفسیرات اور انکی رائیں ملاحظہ ہوں :-

- ۱۔ علامہ جلال الدین مخشتری معتزلی اپنی تفسیر کشاف میں فرماتے ہیں :-  
 "سجدہ اللہ تعالیٰ کیلئے تو بطور عبادت ہوتا ہے اور غیر اللہ کیلئے اکرام کے طور پر ہوتا ہے جیسا کہ فرشتوں نے حضرت آدمؑ کو سجدہ کیا تھا (تفسیر کشاف ج ۲ ص ۱۶۷)"
- ۲۔ علامہ ابن جریر طبری شیعہ اپنی تفسیر طبری میں فرماتے ہیں :-  
 "امام قتادہ فرماتے ہیں کہ اسجد والادھم (آدم کو سجدہ کرو) اس حکم میں طاعت اور فرماں برداری حقیقتاً اللہ تعالیٰ ہی کیلئے ہے ویسے سجدہ حضرت آدمؑ ہی کو ہوا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کے اکرام کا اظہار فرمانے ہی کے لئے کیا کہ اپنے فرشتوں سے حضرت آدم کو سجدہ کرایا"  
 (تفسیر طبری ج ۱ ص ۱۷۱)

- ۳۔ علامہ قمی نیشاپوری اپنی تفسیر غرائب القرآن میں فرماتے ہیں :-  
 "صحیح ترین قول یہی ہے کہ یہ سجدہ زمین پر پیشانی رکھنے ہی کی شکل میں تھا لیکن بطور عبادت نہ تھا بلکہ حضرت آدم کے اکرام ہی کیلئے تھا"  
 (تفسیر غرائب القرآن برہائشہ تفسیر طبری ج ۲ ص ۲۳۴)

- ۴۔ علامہ فخر الدین رازی نے اپنی تفسیر کبیر میں اسی سلسلہ میں تین اقوال

نقل فرمائے ہیں :-

(۱) سجدہ کے لغوی معنی یعنی انحناء (بھک جانا) لیکن اس معنی کی

تضعیف و تردید فرمادی ہے

(۲) سجدہ کے معنی شرعی مراد لیتے ہوئے حضرت آدم کو مسجد نہ مانا جائے

بلکہ انکی حیثیت جہت سجدہ اور قبلہ کی مانی جائے اس معنی کی کھلی تضعیف

و تردید کر دی ہے۔ (ازراہ اختصار ہم ان دلائل سے تعرض نہیں کرتے

و نہ انھوں نے مدلل اور معقول طور پر ان دونوں قبولوں کی پر زور تردید

فرمائی ہے)۔

(۳) سجدہ کے معنی شرعی مراد لیتے ہوئے حضرت آدم علیہ السلام ہی کو مسجد

بھی مانا ہے مگر اسی تفصیل کے ساتھ کہ طاعت و فرمانبرداری تو حکم اللہ ہی کی

ہو رہی ہے ہاں اسکے حکم سے سجدہ حضرت آدم کو ہوا ہے اور یہ سجدہ

حضرت آدم کی تکویم کے لئے تھا۔ چنانچہ پچھلی امتوں میں سلام و تحیۃ کا

یہ طریقہ جائز تھا (تفسیر کبیر ص ۲۸۱)

۵۔ حافظ عطاء الدین ابن کثیر علیہ الرحمہ اپنی تفسیر میں اس آیت کی

تفسیر یوں شروع فرماتے ہیں ”حضرت آدم پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے

یہ بہت بڑا انعام و اکرام ہے جسے اللہ تعالیٰ انکی اولاد پر بٹلا رہے ہیں

چنانچہ اللہ تعالیٰ اس آیت میں یہی خبر دے رہے ہیں کہ انھوں نے

قرشتوں کو سجدہ آدم کا حکم دیا تھا جس پر بہت سی احادیث بھی

دلالت کرتی ہیں (یہ احادیث ہم ادھر نقل کر چکے ہیں) (ابن کثیر ص ۱۲۵ و ۱۳۱)

اسکے بعد آگے چل کر ص ۳۲ پر علامہ ابن کثیر نے بھی حضرت  
 قتادہ کی وہی تفسیری روایت نقل فرمائی ہے جو ہم طبری کے حوالہ سے  
 اوپر نقل کر آئے ہیں، پھر تفسیر کبیر کے حوالہ سے سجدہ کی تفسیر میں وہی تین  
 اقوال انھوں نے بھی نقل فرمائے ہیں اور ان اقوال سے گانہ سے متعلق  
 اپنا فیصلہ بھی اس طرح ارشاد فرما دیا ہے:-

والا ظہرات القول الاول اولی والسجدة لادم  
 اکراماً واعظاماً واحتراماً وسلاماً وھمی طاعة اللہ  
 عزوجل لانہما لامثال امرہ تعالیٰ وقد قواہ الرازی  
 فی تفسیرہ وضعف ما عداہ من القولین الاخرین  
 ترجمہ: مضبوط بات یہی ہے کہ پہلا قول ہی بہتر ہے یعنی سجدہ آدم  
 انکے اکرام و تعظیم اور احترام و سلام کے طور پر تھا اور حقیقتاً یہ اللہ تعالیٰ  
 ہی کی طاعت تھی کیونکہ اسی کے حکم کی تعمیل کے لئے تھی۔ اور امام رازی  
 نے اپنی تفسیر میں اسی کو قوی قرار دیا ہے اور بقیہ دو قولوں کی تضعیف  
 فرمادی ہے (ابن کثیر)

الغرض متعدد روایات حدیث اور روایات مفسرین کے بالمقابل  
 علامہ کی یہ آواز ترجمانی کہ سجدہ سے مراد صرف جھکنا ہے بلکہ اسکا بھی یقین نہیں ہے کہ  
 جھکنا ہی مراد ہو، سر اسر غیر معقول اور بالکل خلاف منقول ہے جو کسی طرح قابل قبول  
 نہیں ہو سکتا۔

(ب) آیہ شریفہ کے تفسیری حاشیہ میں علامہ نے شوق اجتہاد میں یا اپنی انفرادیت

کی نمائش میں سجدہ کے مشہور و متعارف معنی کو نظر انداز تو کر ہی کر گئے اور ترجمانی کے وقت جھکنے کا ترجمہ لکھ گئے لیکن انہی مدعاے دلی کی تکمیل اس لفظ سے ہو نہ سکتی تھی اسلئے حاشیہ میں ایک قدم اور آگے بڑھایا اور یوں ارشاد فرمایا کہ "از زمین اور اس سے تعلق رکھنے والے طبقہ کائنات میں بمقدور فرشتے مامور ہیں ان سب کو انسان کیلئے مطیع و مسخر ہو جانے کا حکم دیا" (پھر اس مطیع و مسخر کی مزید وضاحت فرمانے کے بعد فرماتے ہیں)

۲۔ "فرشتوں کو آدم کیلئے سرسجود ہو جانے کا جو حکم دیا گیا اسکی نوعیت کچھ اس قسم کی تھی (یعنی) ممکن ہے صرف مسخر ہو جانے ہی کو سجدہ سے تعبیر کیا گیا ہو"

## آخر یہ سیاب وشی کیسی ؟

علامہ کی یہ سیاب وشی اور بقراری کس قدر مضحکہ خیز ہے کہ بار بار بات کا پہلو بدلتے جا رہے ہیں کسی ایک بات پر قرار نہیں ہے ایسا لگتا ہے کہ کسی مفسر کا سہارا لینا اور تفسیر بالمنقول کرنا موصوف کو اپنی شان و مقام سے فروتر نظر آتا ہے اسلئے کتب تفسیر کے ذریعہ وہ آیت شریفہ کا مطلب متعین کرنا بھی نہیں چاہتے اور تفسیر نویسی کوئی ہنسی کھیل نہیں ہے کہ کوئی پر وقسیر مار کہ علامہ تفسیر لکھ ڈالے اور اگر کوئی ایسی جسارت کرے گا تو یہی مشر ہو گا جو ہم آپ اس وقت علامہ کا دیکھ رہے ہیں کہ ذرا سی دیر میں بات کے دو پہلو بدل چکے ہیں لیجئے اب یہ سیرا پہلو بھی ملاحظہ فرمائیے

۳۔ "یہ بھی ممکن ہے کہ اس انقیاد کی علامت کے طور پر کسی ظاہری فعل



## کا بھی حکم دیا گیا ہو

واہ واہ۔ ع۔ لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں۔ علامہ! صرف اس ایک سجدہ کو تسلیم کر لینے میں آپ کو اتنی گرانی محسوس ہو رہی ہے کہ آپ کسی طرح سجدہ کو اسکے اصلی سجدہ کے معنی میں لینے کیلئے تیار نہیں ہیں اور قلا بازی پر قلا بازی کھائے جا رہے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ دین و شریعت تو خدا کے مقرر کردہ احکام کا نام ہے جس خدا نے یہ فرمایا الکبریا و ردائی والعظمتہ ازاری من نار عنی قاصمتہ (کبریائی میری رد (چادر) اور عظمت میرا لباس ہے اس معاملہ میں جو مجھ سے مقابل ہو گا میں اسے چور چور کر دوں گا)

اسی خدا نے اسجد و اِلاد م کا حکم دیکر تمام فرشتوں کو آدم کے روبرو سربسجود کرا دیا تو اب ہم آپ کون ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو دین کا مسئلہ یاد دلائیں کہ یا حضرت! غیر اللہ کو سجدہ جائز ہی کہاں ہے

کوئی دلولہ ہو نہ عوصلہ یہی مسئلہ یہی فیصلہ  
جو وہ حکم دے تو حلال ہے جو وہ روک دے تو حرام ہے

## ذرا یہ سادگی بھی ملاحظہ ہو

کہ علامہ یہ تو فرما رہے ہیں کہ ممکن ہے اس انقیاد کی علامت کے طور پر کسی ظاہری فعل کا بھی حکم دیا گیا ہو مگر اس ظاہری فعل کی تعیین فرمانے سے صاف پہلو تہی بھی فرما رہے ہیں کون جانے علامہ کا خیال شاید یہی ہو کہ فرشتوں سے کہا گیا ہو گا کہ جلد آؤ حضرت آدم کو سلوٹ (SALUTE) دو جیسا کہ آجکل

ہوتا ہے۔ علامہ اگر سجدہ کا پرانا رواج نہ مانتے تو اسے تو مان ہی لیں۔  
 (د) ”حکم سجدہ کے مامور و مخاطب تمام فرشتے نہ تھے بلکہ صرف طبقہ زمین کے  
 فرشتے ہی مامور تھے“

حاشیہ بالا کے ابتدائی فقرے دوبارہ بغور ملاحظہ فرمائیں کہ علامہ صرف  
 انھیں فرشتوں کے مامور ہونے کی صراحت فرما رہے ہیں جو زمین اور اس سے تعلق  
 رکھنے والے طبقہ کائنات میں متعین و مقرر تھے۔

علامہ کی اس چشم پوشی پر ہم اپنی آنکھیں کیسے بند کر لیں کیونکہ محقق مفسرین  
 کرام کی تفیسات اور خود آیت تشریف کے الفاظ علامہ کے خیال کی پر زور تکرید کرتے ہیں  
 علامہ نے اتنا بھی خیال نہ فرمایا کہ یہ قصہ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر مذکور ہوا ہے  
 اور اصول تفسیر کا مشہور قاعدہ ہے ”القرآن یفسر بعضہ بعضاً“ قرآن مجید کا ایک حصہ  
 قرآن کے دوسرے حصہ کی تفسیر بھی کرتا ہے (۱) اسلئے اگرچہ سورہ بقرہ میں صرف فَسَجِدُوا  
 لیکن سورہ حجر میں فَسَجِدُوا الْمَلٰٓئِكَةَ کُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ کے الفاظ آئے ہیں ان  
 الفاظ کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ کہہ نیا کہ ملائکہ سے صرف وہ فرشتے مراد ہیں طبقہ زمین  
 سے متعلق ہیں الفاظ قرآن مجید سے صریح چشم پوشی ہے کہ الْمَلٰٓئِكَةُ جمع کا صیغہ  
 ہے الف لام استغراق احاطہ کے لئے آتا ہے۔ کُلُّهُمْ اور اَجْمَعُوْنَ  
 دو دو الفاظ تاکید بھی موجود ہیں آگے الا ابلیس کا استثناء بھی آرہا ہے ایسا  
 استثناء بھی عموم حکم کا فائدہ دیتا ہے۔ ایسے واضح دلائل سے چشم پوشی ایسی نہیں  
 کہ اس سے چشم پوشی کر لی جائے

اس بات کا کیا جواب ہو گا ؟ اگر بقول علامہ یہ بات مان بھی لی جائے کہ

تمام فرشتے مخاطب نہ تھے تو کون جانے شیطان ابلیس کو بھی شاید کچھ اسی قسم کی غلط فہمی نہ ہو گئی ہو اور حکم سجدہ کا مخاطب وہ خود اپنے آپ کو سمجھا ہی نہ ہو کیونکہ جیسا کہ مشہور ہے وہ آسمانی فرشتوں کے ساتھ بود و باش رکھتا ہی تھا جو علامہ کے نزدیک امر سجدہ کے مخاطب ہی نہ تھے۔

بہر حال علامہ نے حکم سجدہ کو ملائکہ ارضی کے ساتھ مخصوص کر کے اگر ایک طرف حضرت آدم علیہ السلام کے اکرام میں کٹوتی فرمانے کی کوشش کی ہے تو دوسری جانب منکر سجدہ کے لئے ایک نئی وجہ انکار بھی تلاش کر دی ہے خدا جانے علامہ کی اس مفت سفت کی وکالت کا علم اس موکل کو کبھی ہو سکا ہو گا کہ نہیں؟

### اقوال مفسرین بھی اسکی تائید کرتے ہیں

جیسا کہ اشارۃً یہ بات اوپر مذکور ہو چکی کہ آیت تشریفہ کے ظاہری الفاظ سے پوری طرح یہ بات متعین سی ہو جاتی ہے کہ تخلیق آدم کے وقت تمام ہی فرشتوں سے یہ ذکر ہوا تھا کہ روئے زمین پر خلیفہ مقرر ہونے والا ہے پھر منظرہ تعلیمی میں حضرت آدم علیہ السلام کی نمایاں کامیابی پر بطور اکرام "سلامی" میں جو سجدہ کرایا تھا اسکے امور و مخاطب بھی تمام ہی فرشتے تھے اسلئے عام طور پر مفسرین نے قصہ کے اس پہلو پر زیادہ روشنی ڈالنے کی ضرورت بھی نہیں سمجھی ہے اور اس بات کو بالکل غیر ضروری مبالغہ سمجھ کر نظر انداز ہی کر گئے ہیں۔

تفسیر کی جو کتابیں آسانی سے دستیاب ہو سکی ہیں ان میں سے چند ہی حضرات نے اس پہلو سے تعرض فرمایا ہے جنکی رائیں ہم یہاں نقل کرتے ہیں:-

۱۔ امام فخرالدین رازی نے اپنی تفسیر کبیر میں اگرچہ دونوں ہی قول نقل فرمائے  
یعنی تمام ہی فرشتے مامور و مخاطب تھے، دوسرے یہ کہ صرف روئے زمین کے  
فرشتے مخاطب تھے لیکن اسی کے ساتھ ساتھ وہ لکھتے ہیں اکثر صحابہ و تابعین  
یہی فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ حکم بغیر کسی تخصیص کے تمام جماعت ملائکہ کو دیا تھا  
کیونکہ الملئکۃ کے لفظ سے عام مفہوم ہی سمجھ میں آتا ہے لہذا تخصیص کی بات کرنا  
بالکل غلط اصل ہے (تفسیر کبیر ص ۲۵۱)

۲۔ علامہ بغوی اپنی تفسیر معالم التنزیل میں فرماتے ہیں اس بارہ میں اختلاف  
ہے کہ حکم سجدہ کا خطاب کن فرشتوں کو تھا بعض حضرات نے کہا ہے کہ طبقہ زمین  
ہی کے فرشتوں کو یہ خطاب تھا لیکن صحیح ترین بات یہی ہے کہ یہ خطاب تمام فرشتوں  
کے لئے عام تھا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد یوں ہے فسجدوا للملئکۃ کلہم  
اجمعون۔

۳۔ علامہ قمی نے اپنی تفسیر میں پہلے تو تخصیص کی بات نقل کی پھر علامہ رازی  
کی طرح (تفسیر بغوی بر حاشیہ ابن کثیر ط ۱۳۶) اکثر صحابہ و تابعین کے حوالہ سے عام  
فرشتوں کا مخاطب ظاہر قرار دیا ہے (تفسیر قمی بر حاشیہ طبری ص ۲۰۸)

۴۔ حافظ عماد الدین ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں تفسیر کبیر کے حوالہ سے وہی دونوں  
قول ذکر فرمائے ہیں مگر اس موقع پر امام رازی کی طرح محض نقل پر اکتفا نہیں کیا  
بلکہ اپنی رائے اور اپنا فیصلہ بھی دیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ الفاظ قرآنی کے ظاہر سے  
عموم حکم ہی سمجھ میں آتا ہے یعنی حکم سجدہ تمام ہی فرشتوں کو دیا گیا تھا چنانچہ اسی فقرہ  
سے متعلق دوسری آیت میں الفاظ قرآنی اس طرح آئے ہیں فَسَجَدُوا لِلْمَلَائِكَةِ كُلِّمًا مِّنْهُمْ

اَجْمَعُونَ اِلَّا ابْلِسَ ط (سجدہ کیا تمام ہی ملائکہ نے سب کے سب نے ایک ساتھ اجتماعی طور پر) اس طرز تبعیر میں عموم کا حکم ثابت کرنے کے لئے چار چار قرآن و دلائل میں جن سے قول عموم کو تقویت ملتی ہے تفصیل کیلئے اہل کتب کی طرف مراجعت فرمائی جاسکتی ہے (ملاحظہ ہو تفسیر ابن کثیر ص ۱۴۱)

۵۔ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی اپنی فارسی تفسیر عزیزی میں فرماتے ہیں :- "الملائکۃ یعنی فرشتگان را از علو میں و سفلیں زیر کہ خلافت آدم و مزیت او بر ہمہ آہنا ثابت شدہ بود پس تخصیص ملائکہ بسفلیں و جبہ ندارد و مخالفت روایات است" (تفسیر عزیزی ص ۱۴۱ سورہ بقرہ) (ترجمہ: ملائکہ یعنی آسمان زمین تمام ہی فرشتوں کو حکم دیا گیا کیونکہ آدم کی خلافت اور فضیلت ان سب ہی پر ثابت ہو چکی تھی لہذا صرف طبقہ زمین کے فرشتوں کو خطاب کیلئے مخصوص کرنے کی کوئی وجہ بھی نہیں ہے اور یہ بات روایات کے بھی خلاف ہے، اسکے بعد حضرت شاہ صاحب نے بعض روایات نقل بھی فرمائی ہیں جنہیں آسمانی فرشتوں کے سجدہ کا ذکر موجود ہے شایقین تفسیر عزیزی میں ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔

۶۔ مولانا مفتی محمد شفیع صاحب علیہ الرحمہ نے "بیان القرآن" کی تلخیص و تسہیل کے ساتھ کچھ اضافات فرماتے ہوئے ایک تفسیر معارف القرآن تحریر فرمائی ہے اسمیں فرماتے ہیں (ملاحظہ ہو معارف القرآن ص ۱۸۸) - "اس سے ثابت ہوا کہ سجدہ آدم کا ذکر اسوقت کی تمام ذوی العقول مخلوقات کیلئے عام تھا جنہیں فرشتے اور جنات سب داخل ہیں

شاید کسی کو خیال ہو کہ علامہ مودودی کو ایسی کیا پریشانی لاحق ہو گئی تھی

کہ وہ روایت و درایت کے بالکل ہی خلاف ایسی بات کھ گئے۔ موصوف اگر حکم سجدہ کا مخاطب تمام ملائکہ ہی کو مان لیتے جیسا کہ خود الفاظ قرآنی ہی سے ظاہر بھی ہو رہا ہے یہ بات انکی آزاد ترجمانی سے متعلق پالیسی کے خلاف بھی تو نہ تھی اسکا جواب مختصراً یہی دیا جاسکتا ہے۔ - ع - سخن شناس نہ دبر اخطا اینجاست۔

ہمارے محترم ناظرین ذرا اس پہلو پر بھی تو نظر رکھیں کہ ”تفہیم القرآن“ کی تصنیف میں علامہ کا مرکزی خیال اپنی ”مزعومہ حکومت الہیہ“ کے لئے ”ذہن سازی“ ہے اسی لئے تو فرشتوں پر کبھی دورے ڈالنے کی کوشش فرمائی جا رہی ہے اور ”سجدہ آدم“ جیسی مشہور و معروف و مسلمہ و متفقہ حقیقت پر یہ وہ ڈالا جا رہا ہے۔ سجدہ کا مطلب یہ ارشاد فرمایا جا رہا ہے کہ سجدہ سے سجدہ مراد ہی نہیں ہے بلکہ ”انسان“ کے لئے فرشتوں کو صرف ”سازگاری“ کرنے کا حکم دیا گیا تھا جو وہ اب تک کئے جا رہے ہیں مگر افسوس علامہ نے فرشتوں کو ملانے اور توڑنے کی اتنی کوشش کر ڈالی پھر بھی فرشتوں نے حکومت الہیہ میں موصوف کے لئے کوئی سازگاری نہ کی ہے

کیا ملا عرض مدعا کر کے بات بھی کھوئی التجا کر کے ظاہر ہے کہ اگر علامہ کی مزعومہ حکومت الہیہ قائم ہو ہی جاتی اور فرشتوں کو آں موصوف اور انکی کمیٹی کیلئے سازگاری کی نوبت آجاتی تو شاید آسمانی فرشتے علامہ کے ساتھ اپنا تال میل قائم بھی تو نہ رکھ سکتے آپ ذرا خود ہی غور فرمائیں کیا آپ کو یقین ہے کہ علامہ نے ”فاطمہ جناح“ کے مسئلہ میں جو دھچپی لی تھی آسمانی فرشتے بھی ان کی سرگرمیاں یونہی دم بخود دیکھتے رہے؟

## مسجودیت یعنی تسخیر و انقیاد کا یہ اعزاز بھی

### مخصوص طور پر حضرت آدمؑ کے لئے نہ تھا

علامہ کے مندرجہ بالا حاشیہ تفہیم سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ موصوف کے نزدیک اس تسخیر و انقیاد اور سازگاری کا یہ حکم اللہ تعالیٰ کے پہلے پیغمبر اور پہلے شاگرد نیز جملہ ملائکہ کے پہلے استاد حضرت آدمؑ کے مظاہرہ علمی کے انعام کے طور پر محض ان کی ذات کیلئے خاص نہ تھا بلکہ یہ اعزاز سجدہ (بے سازگاری ہی کہا جائے) حضرت آدمؑ کے ضمن میں پائے جانے والے ضمنی انسان کے لئے تھا موصوف کے نزدیک شاید حضرت آدمؑ کا تعلق اس قصہ سے اتنا ہی ہے کہ وہ اس ضمنی انسان کے باپ تھے۔ ع۔ ہم اے بات الٹی، یا راٹا۔

## اگر آپ کا حسن ظن علامہ کی اختلاف ایسے گمان کی اجازت نہ دیتا ہو تو

براہ کرم اسی مذکورہ بالا حاشیہ تفہیم کے مندرجہ ذیل دو فقرے دوبارہ بغور و غور ملاحظہ فرمائیں۔

«الف» فرمان جاری ہوا کہ صحیح یا غلط جس کام میں بھی انسان اپنے ان اختیارات کو جو ہم اسے عطا کر رہے ہیں استعمال کرنا چاہیے تو — تمہارا فرض ہے تمہیں اس کے لئے سازگاری کرنی ہوگی، (ب) وہ پوری کرنا چاہیے یا نماز پڑھنے کا ارادہ کرے — دونوں



صورتوں میں جب ہم اسے اسکی پسند کے مطابق عمل کرنے کا اذن دے رہے ہیں تمہیں اسکے لئے سازگاری کرنی ہوگی۔

## خدا را انصاف سے بتائیے کہ

حضرت آدم علیہ السلام کی شان علم کے "بین المخلوقات" مظاہرہ پر فرشتوں کو انکے لئے جو "سرسجود" ہونے کا حکم دیا گیا تھا اس حکم کی تعبیر کے لئے علامہ کئی دورازکار خامہ فرسائی نامہ سیاہ کرنے کے علاوہ اور بھی کچھ کہی جاسکتی ہے؛ کوئی بھی صاحب عقل و ایمان اس موٹنگانی کو موزوں و معقول کہہ سکتا ہے؛

علامہ نے اپنی "عادت قدیمہ" اور عقیدہ "مستورہ" کے تحت عصمت انبیاء کے مسئلہ کو اپنا دفت و نشانہ بنانے کی کوشش فرمائی ہے۔

## غور تو فرمائیے کہ

کیا وہ چوری کرنے والا اور بدی کا ارتکاب کرنے والا جسکے لئے فرشتوں کو سازگاری کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے، کسی طرح بھی اسکا مصداق حضرت آدم علیہ السلام کی ذات باریکات بن سکتی ہے؛ (جو خدا تعالیٰ کے سب سے پہلے پیغمبر اور ابوالبشر ہونے کے ساتھ ساتھ ابوالانبیاء بھی ہیں) اگر انکی ذات اسکا مصداق نہیں بن سکتی اور یقیناً نہیں بن سکتی۔ تو پھر مظاہرہ علمی کے انعام و اکرام کے موقع پر فرشتوں سے انھیں سجدہ کرانے کے بجائے ایسی "سازگاری" کا حکم دینا کیا معنی رکھتا ہے؛

## علامہ کی یہ تو بڑی زیادتی ہوگی کہ

وہ اپنے ”اعمال و افعال“ میں فرشتوں کی ”سازگاری“ کا فائدہ اٹھانے کیلئے حضرت آدم کی مسجودیت ہی سے انکار کر بیٹھیں اور سجدہ کی ایسی انوکھی تشریح فرمادیں کہ حضرت آدم (جو اصل مسجودہ ہیں) اس کرامتہ عظیمہ اور فضیلت خاصہ سے بالکل ہی محروم ہو کر رہ جائیں۔

کوئی غیر ابنائے جنس از قسم جن وغیرہ اگر جنسی و نوعی تعصب میں حضرت آدم علیہ السلام کو اس طرح نظر انداز کرنے کی کوشش کرتا تو کہہ سکتا تھا مگر آدم کے کسی بیٹے کی اس سے بڑھ کر تاخلفی کیا ہوگی کہ وہ اپنے ”بادا“ کو ملنے والے اعزاز و اکرام سے اسکو محروم کر کے اس اعزاز کو اپنے حق میں قاص کرنے کی کوشش کرے۔

## ایک ارشاد میں دو گمراہیاں

حاشیہ تفہیم کے منقولہ اقتباس میں علامہ کا یہ ارشاد (جب تک ہم اسے اسکی پسند کے مطابق عمل کرنے کا اذن دے رہے ہیں تمہیں اسکے لئے سازگاری کرنی ہوگی) اپنے اندر دو گمراہیاں لئے ہوئے ہے، ایک طرف تو علامہ شاید بغیر سوچے سمجھے ہی اپنے صحیح یا غلط ”نیکی“ و ”بدی“ ہر کام کو خدا تعالیٰ کے اذن و اجازت پر مبنی قرار دے رہے ہیں جو ایسی زبردست فکری گمراہی ہے کہ کوئی صحیح العقیدہ و سلیم العقل اسے اپنے حلق کے نیچے نہ اتار سکے گا کیونکہ ظاہر ہے کہ خدا تعالیٰ جب خود ہی کسی غلط کام یا بدی کا اذن دے رہے ہیں تو پھر اللہ تعالیٰ اس پر گرفت و مواخذہ ہی کیوں فرمائیں گے۔

پائے استدلالیاں چوبیس بود پائے چوبیس سخت بے تمکین بود  
 دوسری طرف علامہ نے اپنے صحیح یا غلط ہر کام میں فرشتوں کو بھی اپنی  
 سازش کا شکار اور بقول خود سازگار بنا کر عصمت ملائکہ کو بھی دغدار بنانے کی اذیتنا  
 کوشش فرمائی ہے فالی اللہ المشتکی عما یصفون۔

## کجاں شورہ شوری کجا ایں بے نمکی

کہاں تو علامہ نے اپنے دیباچہ میں سابق مترجمین و مفسرین کی تمام تر  
 مساعی پر یوں خط نسخ و بطلان کھینچا تھا کہ پڑھنے والا بری طرح مرعوب ہو کر پوری  
 طرح علامہ کا معتقد ہو جائے کہ واقعی اس دور پر فتن و براپاضلال میں علامہ سے  
 بڑھ کر کوئی فہامہ قرآن شاید ہی پیدا ہوا ہو اور کہاں علامہ کا تفسیر نگاری میں اب  
 یہ حال ہے کہ وہ آیت بالا کا کوئی یقینی اور متعین مفہوم اپنے ناظرین کو بتانے سے  
 قاصر و عاجز بھی نظر آ رہے ہیں۔ حاشیہ بالا کے خط کشیدہ آخری فقرہ پر غور فرمایا جائے  
 تو یہ بات بھی صاف نظر آ جاتی ہے کہ علامہ کو اس آیت کے کسی متعین مفہوم کا یقین  
 بھی نہیں محض ظن و تخمین سے اٹکل پچواندھیرے میں تیرا رہے ہیں واہ کیسے زبردست

مفسر ہیں کہ محض ”طبع زاد“ احتمالات کے بل بوتے پر تفسیر رقم فرما رہے ہیں ۵

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

”حکم سجدہ“ کا مفہوم و مطلب متعین کرنے میں علامہ کے یہ تردد آمیز وارتیاب خیز فقرے  
 (۱) ”اسکی نوعیت کچھ اس قسم کی تھی“ (۲) ”ممکن ہے صرف مسخر ہو جانے ہی کو سجدہ  
 سے تعبیر کیا گیا ہو“ (۳) ”مگر یہ بھی ممکن ہے کہ اس انقیاد کی ”علامت“ کے طور پر

کسی ظاہری فعل کا بھی حکم دیا گیا ہو) پڑھکر انکا ناظر انکی تفسیر دانی کی تعریف و تحسین کرے گا یا پھر مجبوراً موصوف کی "سرایہ تفسیر" سے ہتی دامن پر نوہ و ماتم کرے گا؟ اسکا فیصلہ ہم اپنے ناظرین کے جذبہ عدل و انصاف پر ہی چھوڑتے ہیں۔

## علامہ کی پیش بندی اور عبارت کی معذرت شاید اسی لئے رہی ہوگی

بات بہت دور پہونچ گئی گذشتہ صفحات میں دیباچہ تفہیم ص ۱۱ کا ایک اقتباس ہم پیش کر آئے ہیں جس میں علامہ نے بڑی ہی معصومیت کے ساتھ "آزادہ جانی" کے نام پر ترجمہ قرآن مجید کے دوران مکمل آزادی بلکہ گراہی تک کیلئے راہ ہموار کرنے کی کوشش فرمائی ہے۔ بہتر ہوگا کہ اقتباس مذکورہ بالا پر آپ دوبارہ پھر نظر ڈالیں یہ آیت زیر بحث دراصل اسی اقتباس کے تجزیہ و تحلیل کے سلسلہ میں یہاں پیش کی گئی ہے آیت مذکورہ بالا (وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ فَسَجَدُوا إِلَّا

إِبْلِيسَ ط) کا جو ترجمہ علامہ نے فرمایا ہے وہ بھی آپ نے ملاحظہ فرمالیا اور دوسرے حضرات مترجمین و مفسرین کے ساتھ مختلف تراجم بھی آپ کے ملاحظہ میں آگئے اب فیصلہ صرف آپ ہی کو فرمانا ہے کہ اس اقتباس میں علامہ نے اپنے خوف و خشیت اور حذر و احتیاط کی تصدیق کشتی میں جس مبالغہ کا اظہار فرماتے ہوئے یہ چند جملے تحریر فرمائے تھے

(کہ بہت ڈرتے ڈرتے یہ آزادی برتی ہے جس حد تک احتیاط میرے

امکان میں تھی اس امر کا پورا اہتمام کیا ہے قرآن کی اپنی عبارت ختمی

آزادی زبان کی گنجائش دیتی ہے اس سے تجاوز نہ ہونے پائے)

عملی طور پر وہ خوف و خشیت اثنائے ترجمانی کس برسی طرح مفقود ہے۔ علامہ نے انسانوں کی بدکرداری میں فرشتوں کی "سازگاری" اور خود ذات باری تعالیٰ کے "اذن" و اجازت کو بھی اسکا سہارا اور مبنی قرار دیکر ساری بدکرداریوں کی ذمہ داری جس حسین انداز میں خدا تعالیٰ کی طرف منتقل کرنی چاہی ہے اسکو دیکھکر یہ یقین کرنا بھی مشکل ہے کہ ایسے شخص کے دل و دماغ پر خدا کے خوف و خشیت کی کوئی پرچھائیں بھی پڑی ہوگی مگر لطف یہ ہے کہ موصوف نے اپنے خوف و خشیت کی "بقلم خود" جو تصویر کشی فرمائی ہے وہ ایسے فنکارانہ انداز میں فرمائی ہے کہ اب کسی کو یہ مجال بھی تو نہیں ہے کہ انکے خوف و خشیت پر شک وارتیاب کی نظر بھی ڈال سکے اور ہمت کر کے ان سے یہ دریافت کرنے کی جرات بھی کر لے کہ جناب والا آیت مذکورہ میں سجدہ کا مشہور و متعارف ترجمہ و مفہوم چھوڑ کر فرشتوں کی سازگاری کی یہ آزاد ترجمانی اختیار کرنے سے پہلے جناب پر خوف و خشیت کے کتنے دورے پڑے تھے اور کتنے ڈرتے ڈرتے جناب نے یہ آزادی برقی ہے؟

ہمارے اس سوال کا جواب اگر "نفی" میں ہوا اور یقیناً نفی ہی میں ہوگا تو براہ کرم ہمیں بتایا جائے کہ اس قسم کے مصنوعی خوف و خشیت کی "منالشیخص" کو جناب کے تعبیر کردہ "دارالاسلام" میں بھی کیا ریاکاری ہی کہا جاتا ہے یا وہاں اس کا کوئی اور نام ہے؟ صرف اپنی واقفیت اور آگاہی کیلئے جواب درکار ہے۔ گذشتہ صفحات میں راقم السطور نے تفہیم کے دیباچے سے متعلق دو مزید اقتباسات پر تبصرہ کا ذکر کیا تھا جن میں سے ایک اقتباس پر یہ تبصرہ اب تک چلتا رہا۔

اقتباس مذکورہ سابق تو علامہ کی آزاد ترجمانی کی وضاحت و معذرت

سے متعلق تھا اب دیباچہ کا وہ باقیماندہ دوسرا اقتباس بھی ملاحظہ ہو جسے علامہ نے ہر سورہ قرآن سے متعلق اپنے تحریر فرمودہ دیباچوں اور آیات قرآنیہ سے متعلق تشریحی حاشیوں کے سلسلہ میں اپنے منصوبہ کی وضاحت کے طور پر سپرد قلم فرمایا ہے۔ ملاحظہ ہو فرماتے ہیں :-

## اقتباس دوم

(الف) ”میں نے ہر سورہ کے آغاز میں ایک دیباچہ لکھ دیا ہے جس میں اپنی حد تک پوری تحقیق کر کے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ وہ سورہ کس زمانہ میں نازل ہوئی، اسوقت کیا حالات تھے، اسلام کی تحریک کس مرحلہ میں تھی، کیا اسکی ضروریات تھیں اور کیا مسائل اسوقت درپیش تھے، نیز جہاں کہیں کسی خاص آیت یا مجموعہ آیات کی کوئی الگ شان نزول ہے وہاں اسے میں نے حاشیہ میں بیان کر دیا ہے“

(ب) ”حواشی“ میں میری انتہائی کوشش یہ رہی ہے کہ کوئی ایسی بحث نہ چھیڑی جائے جو ناظر کی توجہ قرآن سے ہٹا کر کسی دوسری چیز کی طرف پھیر دے۔ جتنے بھی حواشی میں نے لکھے ہیں وہی قسم کے مقامات پر لکھے ہیں ایک وہ جہاں محسوس ہوا کہ ایک عام ناظر اس جگہ تشریح چاہے گا یا اسکے ذہن میں کوئی سوال پیدا ہو گا یا وہ کسی شبہ میں مبتلا ہو جائے گا۔ دوسرے وہ جہاں مجھے اندیشہ

ہوا کہ ناظر اس جگہ سے سرسری طور پر گزر جائے گا اور قرآن کے ارشاد  
 کی اصل روح اس پر واضح نہ ہوگی" (دیباچہ تفہیم ص ۱۱)  
 اقتباس بالا میں علامہ نے اپنی تفسیر نویسی سے متعلق پالیسی کی وضاحت  
 کرتے ہوئے خصوصی طور پر دو باتیں ارشاد فرمائی ہیں:-

۱۔ (اشق الف) میں علامہ نے ارشادات قرآنی کو پوری طرح سمجھنے کیلئے ہر سورہ کے آغاز  
 میں ایک ایسے دیباچہ کی ضرورت ظاہر فرمائی ہے جس میں موصوف اس سورہ کے  
 شروع میں اسکی شان نزول پر تحقیق دیں گے۔

۲۔ (اشق ب) علامہ نے اپنے "تفسیری حواشی" سے متعلق کچھ وضاحت و صفائی  
 پیش فرمائی ہے

راقم السطور کو آئندہ سطور میں اقتباس ہذا کے انہی دو پہلوؤں پر اپنی معروضات  
 پیش کرنی ہیں اور یہ دکھلانا ہے کہ علامہ کا اصل فن اور کمال صحافت (جسکا شجرہ نسب  
 شاید مغالطہ و فریب سے ہی جاملتا ہے) یہی ہے کہ موصوف نے اپنے اسی دیباچہ  
 مقدمہ میں (جو نظر بظاہر بالکل بے غبار اور بے ضرر لگتے ہیں) اپنی تحریک کو  
 ناظرین کے دل و دماغ میں بٹھانے کیلئے کس خوبی سے زمین ہموار فرمائی ہے اور  
 کیسے حسین و لطیف اور پر حکمت اور فنکارانہ انداز میں تفہیم القرآن کی زہرناکیوں اور  
 خطرناکیوں کو قبول کر لینے کیلئے ناظرین کی ذہن سازی کا حق ادا فرمایا ہے۔

ہر سورہ کے آغاز میں علامہ نے سورتوں کی شان نزول پر جو داد تحقیق  
 دی ہے ان پر تفصیلی کلام تو اسی وقت مناسب ہوگا جب ہم تفہیم القرآن کی ان  
 حدود میں داخل ہو کر تبصرہ کریں گے۔



اسی طرح تفہیم کے "تفسیری ماثیوں" پر تبصرہ بھی بر محل ہی مناسب ہوگا لیکن ناظرین تبصرہ کے انتظار کو کسی قدر کم کرنے کیلئے ان دو پہلوؤں سے متعلق دو ایک مثالیں اس موقع پر بھی پیش کی جا رہی ہیں۔

## شان نزول سے متعلق

علامہ کے متعلق زیر نظر تبصرہ میں یہ بات عرض کی جا چکی ہے کہ موصوف اپنی اس تفسیر نویسی میں اپنے آپ کو کسی روایت حدیث یا قول مفسر کے حوالہ کا پابند نہیں تصور فرماتے جسکی وجہ غالباً یہی ہے کہ آں موصوف کو جتنا کچھ اعتماد اپنی عقل و رائے پر ہے اتنا اعتماد انھیں روایات و اقوال پر نہیں ہے جیسا کہ تنقیحات کے حوالہ سے موصوف کا ایک ارشاد بھی صفحات گذشتہ میں نقل کیا جا چکا ہے جس میں موصوف نے کتب تفسیر و حدیث کے پرانے ذخیروں کو نا کافی بلکہ بیکار قرار دیا ہے اور ایک دوسرے مقام پر قرآن فہمی کی صلاحیت "علمائے کرام" سے سلب فرماتے ہوئے صرف کالج کے "پروفیسر" ہی میں تسلیم فرمائی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ موصوف ہر معاملہ میں نقل روایات کو یکسر متروک فرماتے ہوئے اپنی عقلی اور طبعی ادو حیہات سے زیادہ کام نکالنا چاہتے ہیں چنانچہ ہر سورہ سے متعلق دیباچہ میں اسکی شان نزول سے متعلق جو کلام فرمایا ہے اس میں بھی روایات "کا ذکر بہت ہی کم ہے اور اگر کسی مقام پر مظاہرہ علم و مطالعہ کے تحت روایات ذکر بھی فرمائی ہیں تو آخر میں اپنی عقلی تیج کے ذریعہ ان روایات کو کالعدم فرمایا ہے مثال کیلئے تفہیم القرآن جلد ۶ ص ۴۶ پر معوذتین (الفلق، الناس)

کا دیا یہ ملاحظہ ہو "زمانہ نزول" پر کلام فرماتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں :-  
 (الف) "حضرت من بصری، عکرمہ، عطار اور جابر بن زید کہتے ہیں کہ  
 یہ سورتیں مکی ہیں۔ حضرت عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی ایک  
 روایت یہی ہے مگر ان سے دوسری روایت یہ ہے کہ یہ مدنی ہیں  
 اور یہی قول حضرت عبداللہ بن زبیر اور قتادہ کا بھی ہے۔ اس  
 دوسرے قول کو جو روایات تقویت پہنچاتی ہیں ان میں سے ایک  
 مسلم، ترمذی نسائی اور مستند امام احمد بن حنبل میں حضرت عقبہ بن  
 عامر کی یہ حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک روز  
 مجھ سے فرمایا اَلَمْ تَرَ اٰیَاتِ الْاٰیَلَةِ لَمْ يَرْمَلْهُنَّ  
 اَعُوذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ، اَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ (تمہیں کچھ پتہ ہے  
 کہ آج کی رات مجھ پر کیسی آیات نازل ہوئیں یہ بے مثل آیات ہیں  
 اَعُوذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ اَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ) یہ حدیث اس بنا پر  
 ان سورتوں کے مدنی ہونے کی دلیل ہے کہ حضرت عقبہ بن عامر مہجرت  
 کے بعد "مدینہ طیبہ" میں ایمان لائے تھے جیسا کہ ابو داؤد اور نسائی نے  
 خود ان کے بیان سے نقل کیا ہے۔ دوسری روایات جو اس (مدنی  
 ہونے کے قول کی موجب بنی ہیں وہ ابن سعد محی السنۃ بغوی، امام  
 نسفی، امام بیہقی، حافظ ابن حجر، حافظ ابوالدین عینی، عبد بن حمید  
 وغیرہم کی نقل کردہ یہ روایات ہیں کہ جب مدینہ میں یہود نے رسول اللہ  
 صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کیا تھا اور اس کے اثر سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم

بیمار ہو گئے تھے اسوقت یہ سورتیں نازل ہوئی تھیں ابن سعد نے  
 واقعی کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ یہ شہ کا واقعہ ہے اسی بتار  
 پر سفیان بن عیینہ نے بھی ان سورتوں کو مدنی کہا ہے  
 (تفہیم القرآن جلد ششم ص ۵۴۶)

## نقل کے بعد عقل

معوذتین کے شان نزول سے متعلق مندرجہ بالا روایات نقل فرمانے کے  
 بعد علامہ نے "عقل شریف" کا بھی استعمال فرمایا ہے چنانچہ متصلاً اگلے ہی پیر میں  
 ارشاد فرماتے ہیں۔

(ج) "لیکن جیسا کہ ہم سورہ اخلاص کے دیباچہ میں بیان کر چکے  
 ہیں کسی سورہ یا آیت کے متعلق جب یہ کہا جاتا ہے کہ وہ فلاں موقع  
 پر نازل ہوئی تھی تو اسکا مطلب لازماً یہی نہیں ہوتا کہ وہ پہلی مرتبہ  
 اسی موقع پر نازل ہوئی تھی بلکہ بعض اوقات ایسا ہوا ہے کہ ایک  
 سورت یا آیت پہلے نازل ہو چکی تھی اور پھر کوئی واقعہ یا صورت حال  
 پیش آنے پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسی کی طرف دوبارہ بلکہ بار بار  
 حضور کو توبہ دلائی جاتی تھی ہمارے نزدیک ایسا ہی معاملہ معوذتین  
 کا بھی ہے انکا مضمون صاف بتا رہا ہے کہ یہ ابتداء مکہ میں اسوقت  
 نازل ہوئی ہوئی تھی جب وہاں حضور کی مخالفت خوب زور پکڑ چکی تھی  
 بعد میں جب مدینہ طیبہ میں منافقین یہود اور مشرکین کی مخالفت کے

کے طوفان اٹھے تو حضور کو پھر ان ہی دونوں سورتوں کے پڑھنے کی تلقین کی گئی جیسا کہ حضرت عقبہ بن عامر کی مندرجہ بالا روایت میں ذکر آیا ہے۔ اسکے بعد جب آپ پر جادو کیا گیا اور آپ کی علالت مزاج نے شدت اختیار کی تو اللہ کے حکم سے جبریل علیہ السلام نے آکر پھر یہی سورتیں پڑھنے کی آپ کو ہدایت کی۔ (حوالہ بالا)

(ج) ”اسلئے ہمارے نزدیک ان مفسرین کا بیان ہی زیادہ معتبر ہے جو ان دونوں سورتوں کو مکئی قرار دیتے ہیں۔ جادو کے معاملہ کے ساتھ انکو مخصوص سمجھنے میں تو یہ امر بھی مانع ہے کہ اس کے ساتھ صرف سورہ فلق کی صرف ایک آیت وَ مِنْ شَرِّ النَّفَّاثَاتِ فِي الْعُقَدِ ہی تعلق رکھتی ہے سورہ فلق کی باقی آیات اور پوری سورہ الناس کا اس معاملہ سے براہ راست کوئی تعلق نہیں ہے“

(تفہیم القرآن جلد ششم ص ۵۳۴)

## صحافتی چابکدستی اور شوق معقول پسندی

معوذتین کے دیباچہ سے یہ طول طویل اقتباس جسے ہم نے تبصرہ میں سہولت کے خیال سے (الف، تا، جیم) تینوں حصوں میں ادھر نقل کیا ہے، سطور ذیل میں بطور تجزیہ ان پر اپنا تبصرہ پیش کیا جا رہا ہے:-

(شوق الف) ملاحظہ ہو علامہ نے کس ہوشیاری اور چابکدستی سے مظاہرہ علم و نمائش مطالعہ فرماتے ہوئے حضرات ابن عباس، حسن بھری

عمرہ، جابر بن زید، عطار رضی اللہ عنہم اور حضرات عبداللہ بن زبیر و قتادہ رضی اللہ عنہم وغیرہم کے اسمائے گرامی بھی ذکر فرمادیے اور متعدد کتب حدیث کی روایات کا بھی حوالہ دیتے ہوئے ناظرین کو ”دو تاثرات“ دینے کی کوشش فرمائی۔

پہلا تاثر تو یہ ہے کہ ”معوذتین“ کو کی کہنے والے حضرات تعداد میں زیادہ ہیں یعنی حضرت من بصری، عمرہ، عطار اور جابر بن زید اور ایک روایت کے مطابق حضرت ابن عباس کا بھی یہی قول ہے۔ اس طرح اس روایت کو پانچ مفسرین کی تائید حاصل ہے۔ اور اس روایت کے برخلاف ”معوذتین کو“ ”مدنی“ کہنے والے حضرات صرف ڈھائی ہیں یعنی ایک دوسری روایت کے مطابق حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ان کے علاوہ حضرت عبداللہ بن زبیر اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہما۔

دوسرا تاثر یہ کہ ”معوذتین“ کے شان نزول کا مسئلہ بغیر کسی فیصلہ کے اب تک یوں ہی پڑا ہوا کھانا ذکرہ بالا ہر دو اقوال میں سے کسی قول کو اختیار و ترجیح کی نوبت ہی نہ آسکی تھی جبکہ وجہ سے علامہ کو یہ اہم خدمت فیصلہ انجام دینا پڑی جو اقتباس بالا کے شق جیم میں اوپر نقل ہوئی۔ علامہ کا یہ فیصلہ کس حد تک معقول ہے اس پر اپنا تبصرہ تو ہم آئندہ پیش کریں گے سر دست مندرجہ بالا ہر دو تاثرات کی حقیقت ملاحظہ فرمائی جائے۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا علامہ کی نقل کے مطابق ”معوذتین“ کو ”مکی“ قرار دینے والے حضرات تعداد میں زیادہ دکھائے گئے ہیں اور مدنی کہنے والے صرف ڈھائی ہی ہو پاتے ہیں لیکن جب ہم کتب تفسیر کے ان ذخیروں کو دیکھتے ہیں جنہیں دیکھنے سے علامہ نے شاید اسی روز کے لئے بریک لگانا چاہا تھا تو ہمیں کتب تفسیر میں مندرجہ ذیل تصریحات ملتی ہیں :-

(۱) علامہ محمد بن یعقوب فیروز آبادی تنویر المقیاس من تفسیر ابن عباس میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے جو کچھ روایت فرماتے ہیں ہم مختصر نقل کرتے ہیں (الف) الفلق وہی کلمہ مکیہ و قیل مدینہ سورہ فلق کے بار میں دونوں ہی قول کہ مکہ ہے اور یہ بھی کہا گیا کہ ”مدنی“ ہے۔

(ب) وَ مِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ (کی تفسیر میں) لبید بن الاعصم الیہودی اذ حسد النبی صلی اللہ علیہ وسلم فسحره (یعنی حاسد سے مراد لبید بن اعصم یہودی ہے جب اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر حسد کیا اور آپ پر جادو کیا)

(ج) الناس وہی کلمہ مدینہ سورہ ناس کے بارے میں صرف ایک قول کہ مدنی ہے۔

(د) (سورہ ناس کے ختم پر یہ عبارت ہے) نزلت ہاتھ السورۃ فی شان لبید بن الاعصم الذ سحر النبی یہ دونوں سورتیں لبید بن اعصم کے واقعہ میں نازل ہوئیں جس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کر دیا تھا — فقر النبی صلی اللہ علیہ وسلم علی سحره ففرج اللہ عنہ فکانا نشط من عقاب (تنویر المقیاس<sup>۳۹۸</sup>)

مطبوعہ مصر مع باب النقول) تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس کے جادو پر پڑھیں اللہ تعالیٰ نے جادو زائل فرما دیا اور آپ یوں ہو گئے جیسے کوئی بندھن رہا ہو اس سے کھول دیئے گئے ہوں

(۲) علامہ قسیمی نیشاپوری اپنی تفسیر غرائب القرآن میں مختلف اقوال نقل

فرمانے کے بعد آخر میں بحث کا خاتمہ اس طرح فرماتے ہیں :-

وقال جمهور المفسرين ان لبید بن الاعصم اليهودی  
سحر النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی احدی عشرة عقدة

فی وتر و دسبہ فی بیروزی اروان قمرض النبی

صلی اللہ علیہ وسلم واشتد ذالک علیہ ثلاث لیل

نزلت معوذتان (تفسیر غرائب القرآن ۱۹۲ بر حاشیہ طبری جلد آخر)

جمهور مفسرین نے فرمایا کہ لبید بن عاصم یہودی نے حضرت نبی صلی اللہ

علیہ وسلم پر جادو کر دیا تھا ایک تانت میں گیارہ گرہیں ڈال کر ذی اروان

نامی کنوئیں میں چھپا دیا تھا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم بیمار ہو گئے اور وہ

مرض تین دن رات تک بہت سخت ہو گیا تو معوذتین نازل ہوئیں

(۳) علامہ رازی کی تفسیر کبیر میں بھی تقریباً یہی مندرجہ بالا عبارت موجود ہے

علامہ موصوف بھی جمهور مفسرین کا قول یہی نقل فرما رہے ہیں جو اوپر نقل ہوا (ملاحظہ ہو

تفسیر کبیر جلد آخر ۵۳۹)

(۴) علامہ ابوالسعود کی تفسیر ابی السعود میں بھی یہی شان نزول اختیار کیا

گیا ہے اور واقعہ سحر کو قدرے تفصیل سے بیان کیا گیا ہے (ملاحظہ ہو تفسیر ابی السعود

بر حاشیہ تفسیر کبیر ۵۴۴ جلد آخر)

(۵) علامہ سیوطی نے اپنی مشہور کتاب لباب المنقول فی اسباب

النزول میں بھی شان نزول کے سلسلہ میں پہلے تو یہی روایت مذکورہ بالا قدرے

اختلاف و قدرے تفصیل کے ساتھ بیہقی کی "دلائل النبوة" سے نقل فرمائی ہے پھر میں



ابونعیم کی تخریج کردہ دوسری روایت بھی نقل کی ہے مگر اسکا تعلق بکلی یہودی سے ہے  
اسکے سرور و آیات سے معوذتین کا مدنی ہونا ہی ثابت ہوتا ہے (ملاحظہ باب المنقول  
ص ۳۶ بر حاشیہ تفسیر ابن عباس)

(۶) علامہ جلال الدین محلی اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں "سورة الفلق مکیہ  
او مدنیہ" سورة فلق مکی ہے یا مدنی ہے۔ پھر شان نزول میں اپنی مشہور  
روایت نقل فرماتے ہیں :-

نزلت هذه السورة والتي بعدها لما سحر لبيد اليهودي  
النبي صلى الله عليه وسلم في وتربه احدى عشرة عقدة  
فاعلمه الله بذلك وبمحملة فاحضر بين يديه صلى الله  
عليه وسلم وامر بالتعوذ بالتعوذ بالسورتين الخ (جلالین  
شریف ۵) یہ سورۃ اور اسکے بعد کی سورۃ اسوقت نازل ہوئی  
جب لبيد یہودی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کر دیا تھا ایک تانت  
میں جس میں گیارہ گرہیں تھیں تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو مطلع فرما دیا اور  
اسکی جگہ بھی بتا دی چنانچہ وہ تانت آپ کے سامنے پیش کی گئی اور  
آپ کو ان دونوں سورتوں سے تعوذ کا حکم فرمایا گیا۔

(۷) علامہ سلیمان حمل تفسیر جلالین کے محشی فرماتے ہیں :-  
یہ سورۃ مکی ہے حضرات حسن، عطا اور عکرمہ کے قول کے مطابق۔  
اور یہ سورۃ مدنی ہے حضرت عبداللہ بن عباس حضرت قتادہ اور  
ایک جماعت کے قول کے مطابق جسکی تائید شان نزول سے بھی

ہوتی ہے (جمل ص ۷۷ جلد ۴)

(۸) علامہ ابن قیم علیہ الرحمہ بھی "تفسیر المعوذتین" میں اپنی تفسیر حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اسی روایت سے شروع فرما رہے ہیں جسے علامہ نے بھی اپنے دیباچہ میں نقل فرمایا ہے (جیسا کہ اقتباس بالا میں مسطور ہو چکا) اور جسکی بنیاد پر معوذتین کا مدنی ہونا بھی تسلیم فرمایا ہے (ملاحظہ ہو تفسیر المعوذتین لابن قیم ص ۲ مطبوعہ مصر)۔

(۹) شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی اپنی تفسیر عزیزی میں فرماتے ہیں  
(الف) سورة الفلق یہ سورہ مدنی ہے۔  
(ب) سورة الناس یہ سورہ مدنی ہے۔

(ج) ان دونوں سورتوں کے نازل ہونے کا سبب یہ ہے کہ لبید بن عامر یہودی نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کیا تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کے جادو کے سبب سے بیمار ہو گئے تھے (پوری روایت نقل فرمانے کے بعد) اور جبریل علیہ السلام یہ دونوں سورتیں لیکر نازل ہوئے (تفسیر عزیزی اردو ص ۲۳ مطبوعہ انتفا)

(۱۰) مفسر حقانی اپنی تفسیر حقانی میں فرماتے ہیں :—  
حسن بصری، عکرمہ، عطاء و جابر کہتے ہیں کہ یہ سورۃ بھی مکہ میں نازل ہوئی اور حضرت ابن عباس وغیرہ جمہور یہ کہتے ہیں کہ مدینہ میں نازل ہوئی اور قول ہی قوی تر ہے (تفسیر حقانی ص ۲۷۷ پارہ ۴ عم)

(۱۱) حضرت حکیم الامتہ کھاناوی علیہ الرحمہ نے اپنی تفسیر بیان القرآن میں

یہی مشہور شان نزول اختیار فرمایا ہے کہ:-

لبید نے جادو کیا تھا، سورہ فلق اور تاس ایک ساتھ نازل ہوئیں  
 حسب دلائل بہت سی سبب نزول یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم  
 پر لبید یہودی اور اسکی بیٹیوں نے سحر کر دیا تھا (مختصرًا) خلاصہ  
 تفسیر بیان القرآن بر حاشیہ حمال شریف اشرفی۔ (ادارہ اشاعت  
 دینیات نظام الدین دہلی)۔

(۱۲) علامہ شبیر احمد عثمانی علیہ الرحمہ اپنے تفسیری حاشیہ میں تنبیہ کے زیر عنوان  
 فرماتے ہیں:-

کئی صحابہ (مثلاً عائشہ صدیقہ، ابن عباس، زید بن ارقم رضی اللہ عنہم  
 سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر بعض یہود نے سحر کیا  
 اسکے علاج کے واسطے اللہ تعالیٰ نے یہ دو سورتیں نازل فرمائیں  
 اور انکی تاثیر سے وہ اثر باذن اللہ نازل ہو گیا۔

واضح رہے کہ یہ واقعہ صحیحین میں موجود ہے جس پر آئینک

کسی محدث نے جرح نہیں کی (حاشیہ عثمانی بر ترجمہ شیخ الہند)

(۱۳) معجز نما حمال شریف (شائع کردہ نور محمد تاجر کتب جامع مسجد  
 دہلی مطبوعہ ۱۹۲۸ء) کے حاشیہ پر مختلف کتب تفسیر کے حوالہ سے  
 یہ شان نزول درج سے مختصرًا نقل کی جاتی ہے، ملاحظہ ہو:-

شان نزول مسند ابن حمید وغیرہ میں جو روایتیں ہیں انکا  
 حاصل یہ ہے کہ لبید بن الاعصم ایک شخص یہودی نے ۔۔۔ الی

آخر الروایۃ (۱) حوالہ میں تفسیر ابن کثیر و غازی اور فتح البیان کے نام  
(تحریر میں)

## مندرجہ بالا تصدیقات کی روشنی میں

علامہ کی شان تحقیق اچھی طرح بے نقاب ہو گئی کہ شق "الف دبا" میں جو کچھ  
ارشاد فرمایا ہے اسکا کتنا حصہ منقول ہے۔ کتب تفسیر کے جو حوالے منقول ہوئے ان سے  
یہ بات اچھی طرح واضح ہو گئی کہ :-

(الف) "معوذتین" کے بارے میں قول مشہور اور قول جہور اور قول مستند و معتبر یہی ہے  
کہ یہ سورتیں مدنی ہیں۔

(ب) شان نزول میں کچھ اختلاف کے باوجود یہ بات تو تقریباً مسلم و متفق ہی سی رہی کہ  
آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کیا گیا تھا جس کے دفع و علاج کے لئے یہ سورتیں نازل  
ہوئیں۔ (سحر کرنے والے کی ذات میں قدرے اختلاف ہے)

(ج) علامہ کے سوا مندرجہ حضرات مفسرین میں سے کسی نے بھی "معوذتین" کے  
سلسلہ میں تکرار نزول اور تعداد نزول کی بات نہیں فرمائی پھر علامہ تو ترقی فرما کر  
معوذتین کا نزول تین بار قرار دے رہے ہیں ایک بار مکہ شریف میں اور دو بار مدینہ شریف  
میں جس میں سے پہلی بار (جبکا ذکر حضرت عقبہ بن عامر کی روایت سے تسلیم کیا ہے) کا نزول  
واقعہ سحر سے پہلے قرار دے رہے ہیں اور دوسری بار کا نزول واقعہ سحر ہی سے متعلق  
گردان رہے ہیں۔ اس طرح معوذتین کے کل نزول تین بار ہو جاتے ہیں جبکی کوئی دلیل  
نقلی علامہ کے پاس نہیں ہے نہ انھوں نے ہی اپنے دعویٰ پر کوئی دلیل دی

نہ مندرجہ بالا کتب تفسیر سے انکے قول کو ادنیٰ سا سہارا مل سکا۔

## عقل کی لنگڑی دلیل

ہاں علامہ نے اس موقع پر اپنے ”انوکھے دعویٰ“ کو بزعم خود معقول بنانے کی خاطر اپنی عقل کا بھلی استعمال فرما ڈالا ہے (ملاحظہ ہو اقتباس بالا کی شق ج) فرماتے ہیں جادو کے معاملہ کے ساتھ انکو مخصوص سمجھنے میں تو یہ امر بھلی مانع ہے کہ اس کے ساتھ صرف سورہ فلق کی صرف ایک آیت ہی تعلق رکھتی ہے۔ سورہ فلق کی باقی آیات اور پوری سورہ الناس کا اس معاملہ سے براہ راست کوئی تعلق نہیں ہے (تفہیم القرآن جلد ۶ ص ۵۴)

## شاید علامہ یہ فرمانا چاہتے ہوں گے کہ

”معوذتین“ کی شان نزول سے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مسحوریت اور ”سحرزدگی کی جو روایات صحیحین و غیر صحیحین میں موجود ہیں وہ سب بالکل غیر معقول اور ناقابل قبول ہیں ان سورتوں کو جادو کے معاملہ کے ساتھ وابستہ قرار دینے میں یہ دشواری ہے کہ دونوں سورتوں کی مجموعی آیات گیارہ ہیں جن میں جادو کا تعلق صرف ایک ہی آیت وَ مِنْ شَرِّ النَّفَّاثَاتِ فِي الْعُقَدِ سے ہے بقیہ دس آیات کا جادو کے ساتھ براہ راست کوئی تعلق نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ اس منطق کا نتیجہ یہی ہو سکتا ہے جو علامہ نے ”شق جیم“ کے ابتدائی حصہ ہی میں فرما دیا ہے کہ ہمارے نزدیک ان مفسرین کا بیان ہی زیادہ معتبر ہے جو ان دونوں سورتوں کو مکی قرار دیتے

ہیں یعنی صحیحین کی روایات سے کچھ ثابت ہو جو مفسرین کچھ فرماتے ہوں علامہ اسے تسلیم کرنے کیلئے صرف اسوجہ سے تیار نہیں ہیں کہ وہ انکی عقل شریف کے مطابق نہیں ہے۔ انکی عقل تو یہ کہتی ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کو "رذسحر" کے لئے نازل ہی فرمانا تو صرف ایک آیت وَ مِنْ شَرِّ النَّفَّاثَاتِ فِي الْعُقَدِ نازل فرما دیتے اگرم سے گیارہ آیات پر مشتمل دو سورتیں ایک ساتھ نازل کرنے کا کیا تک کیونکہ دوسری آیات کو توجادو کے معاملہ کے ساتھ براہ راست کوئی تعلق نہیں ہے۔

## بات اور مضحکہ خیز ہو سکتی ہے

اگر کوئی صاحب یہ خیال فرماتے ہوں کہ وہ علامہ کو قائل کرنے کے لئے یہ معقول دلیل دے سکتے ہیں کہ واقعہ سحر میں چونکہ گیارہ گرہیں لگائی گئی تھیں اسلئے گیارہ آیات کا نزول ہوا۔ لیکن ہمارا خیال ہے علامہ اتنی آسانی سے قابو میں آسکیں گے ہو سکتا ہے وہ یہ بھی فرمادیں کہ معاملہ سے غیر متعلق آیات نازل فرمانے کے مقابلہ میں تو یہ صورت زیادہ معقول ہوتی کہ صرف ایک آیت ہی نازل ہوئی ہوتی اور بذریعہ وحی جہاں اور تفصیلات سے آگاہ فرمایا گیا تھا یہ ہدایت بھی مل جاتی کہ تانت پر گیارہ گرہیں لگی ہیں لہذا اس کو گیارہ بار پڑھا جائے۔ اس طرح بات علامہ کی عقل شریف کے بالکل مطابق ہو جاتی۔

## اگر ذرا بھی غور سے کام لیا جائے

تو علامہ کی ساری تحقیقات پڑھکر ایک سوال یہ ہوتا ہے کہ موصوف

کے نزدیک جب معوذتین کا مکی ہونا ہی زیادہ معتبر تھا اور مجموعہ آیات کا جادو کے معاملہ سے براہ راست کوئی تعلق بھی نہ تھا تو علامہ کے نزدیک سیدھا سیدھا راستہ یہ تھا کہ کدہ معوذتین کے بارے میں ان مفسرین کا قول ابتداءً ہی قبول فرما لیتے جو انہیں مکی قرار دیتے ہیں، بات کو بے وجہ منقول اس طرح طول دینا اور نزول کو بغیر کسی دلیل کے تین بار مکرر ماننا کیا معنی رکھتا ہے؟ علامہ کا مدعا تو مکہ کے پہلے ہی نزول سے حاصل ہو سکتا تھا۔

آخر علامہ نے تفہیم القرآن تو صرف عام مسلمانوں کی قرآن فہمی کے لئے لکھی ہے اور یہ غرض صرف اتنی بات سے پوری ہو سکتی تھی کہ ”ان سورتوں کے بارے میں اختلاف ہے کچھ لوگ مکی کہتے ہیں کچھ مدنی کہتے ہیں روایات تو زیادہ تر اس بات کے ثبوت میں ہیں کہ یہ سورتیں مدنی ہیں لیکن ہمارے نزدیک ان مفسرین کا بیان زیادہ معتبر ہے جو ان دونوں سورتوں کو مکی قرار دیتے ہیں جادو کے معاملہ کے ساتھ ان کو مخصوص سمجھنے میں یہ امر بجلی مانع ہے کہ اس کے ساتھ صرف سورہ فلق کی صرف ایک آیت ہی تعلق رکھتی ہے“ اس مختصر راستہ کو چھوڑ کر روایات حدیث اور اقوال مفسرین کے نقل میں بے ضرورت خامہ فرسائی منظرِ علم نہیں تو اور کیا ہے؟

## معجزات و خوارق سے چشم پوشی

گذشتہ صفحات میں کہیں ہم یہ بات اشارۃً کہہ چکے ہیں کہ ہمارے مدیر ترجمان اور ترجمان قرآن علامہ مودودی معجزات و خوارق کے معاملہ میں بڑی حد تک تنگ و مضبوط واقع ہوئے ہیں۔ اپنے تفسیری حواشی میں جہاں کہیں انہیں کسی معجزہ سے واسطہ



پڑ گیا ہے وہاں موصوف نے جو انداز تحریر اور طرز تعبیر اختیار فرمایا ہے وہ انکی صحافتی چابکدستی کا خاص نمونہ ہے موصوف "بیان خوارق" سے ایسے خوبصورت انداز میں پہلو تہی فرماتے فرماتے ہیں کہ انھیں کوئی بڑے سے بڑا مفتی کبھی "منکر خوارق و منکر معجزات" آسانی سے نہ کہہ سکے لیکن وابستگان جماعت (بشمول ہمدردان و متفقین و ارکان) انکی تحریر کے بین السطور کو پڑھ کر موصوف کا مدعا اے دلی سمجھ لیں اور معجزات و خوارق سے متعلق عقیدت مندی کا جو فرسودہ انداز سلف سے متواتر طور پر چلا آ رہا ہے اس سے دستبردار ہو کر خیالات کی اصلاح و تصحیح فرمالیں۔

تفہیم القرآن کے تفصیلی تبصرہ کے وقت انشاء اللہ تعالیٰ حسب موقع ایسے زریع و ضلال کی بکلی نشان دہی کی جاتی رہے گی اسوقت تو معوذتین کے اسی دیباچہ پر زیر بحث سے علامہ کا ایک ارشاد پیش خدمت کیا جا رہا ہے:-

معوذتین کی شان نزول سے متعلق "واقعہ سحر" کی تفصیلات مختلف روایات سے مرتب فرما کر ایک مربوط واقعہ کی شکل میں درج کرتے ہوئے علامہ ارشاد فرماتے ہیں:

"جبریل علیہ السلام نے آکر بتایا کہ آپ "معوذتین" پڑھیں (جو علامہ کے نزدیک اسوقت نازل نہیں ہوئی تھیں پہلے ہی نازل ہو چکی تھیں حضرت جبریل صرف اسوقت بطور علاج اسکا استعمال بتلانے آئے تھے حالانکہ ہم اوپر جمہور مفسرین کا قول یہ لکھ چکے ہیں کہ جمہور کے نزدیک یہ سورتیں اس وقت پہلی ہی بار نازل ہوئی تھیں)

چنانچہ آپ ایک ایک آیت پڑھتے جاتے اور اسے ساتھ ایک گره کھولی جاتی اور پتلے میں سے ایک سوئی نکالی جاتی رہی (تفہیم القرآن

۵۵۵ سطر ۱۹، ۲۰ جلد ۴ مطبوعہ ۱۳۵۷ھ

ناظرین کرام نے گزشتہ صفحات میں اس واقعہ سحر سے متعلق تقریباً ایک درجن تفاسیر و تراجم کے حوالے ملاحظہ فرمائے ہیں ان تمام حوالوں کے مطابق جملہ روایات میں ”انحلت عقدة“ کا لفظ وارد ہوا ہے جس کا مفہوم صرف یہی ہونا چاہیے (معجزہ ہونے کا یہی تقاضا بھی ہے) کہ وہ گرہیں ایک ایک کر کے ہر آیت پر باذن اللہ خود بخود کھلتی گئیں۔ وہ گرہیں کھولی نہیں گئیں، جیسا کہ علامہ نے تحریر فرمایا ہے۔

علامہ کی مسلمہ صحافت کے پیش نظریہ وہم بھی نہیں ہو سکتا کہ موصوف گرہ کھلنے اور ”گرہ کھولنے“ کے مفہوم میں جو فرق ہے اسکی گرہ کشائی نہ فرما سکے ہونگے۔

## بہت ممکن ہے کہ

علامہ نے اپنی وسعت مطالعہ کی جو نمائش اور غزارت علم کا جو مظاہرہ جگہ جگہ فرمایا ہے اس سے متاثر ہو کر کسی ذہنی غلامی کرنے والے کے دل میں گرہ ٹٹک پیدا ہو کہ ہو سکتا ہے علامہ کے پیش نظر کوئی ایسی روایت بھی ہو جس میں گرہ کھولنے ہی کی تعبیر اختیار کی گئی ہو تو ایسے حضرات کے ذہنی اطمینان کیلئے عرض ہے کہ جی ہاں! یہ امکان مسلم واقعی ممکن ہے کہ کسی روایت میں گرہ کھولنے کی تعبیر بھی موصوف کو مل گئی ہو بلکہ راقم السطور کو پوری صحافتی دیانت کے ساتھ اسکا اظہار بھی کرنے میں تامل نہیں ہے کہ یقیناً علامہ کو بعض روایات ایسی ملی ہونگی جن کے پیش نظر انھیں اپنی ”غلط فہم“ پیش کرنے کیلئے سہارا مل گیا ہوگا۔

سوال روایات کا نہیں ہے بلکہ سوال تو تحقیق اور معقول بات کا ہے۔ کہاں تو

علامہ معوذتین سے متعلق شان نزول کی روایات کو معقول اور قابل قبول بنانے کے لئے تین تین بار اسکا نزول فرض کئے لے رہے ہیں جو قطعاً بے دلیل اور بے تک بات ہے اور کہاں عقل سے یوں دست کش ہوئے جا رہے ہیں کہ بال کی گرہیں کھولنے کا ناممکن کام انسانی ناخنوں سے انجام دلانے دے رہے ہیں۔

اور وہ بھی ایسی صورت میں کہ عام کتب تفسیر و حدیث میں یہ صراحت کیجا رہی ہے کہ وہ گرہیں حکم خداوندی خود بخود کھلنی گئیں۔

### معتقدین علامہ کی خدمت میں

علامہ نے اس موقع پر کیا صحافتی فنکاری دکھلائی ہے ہمیں اس سے زیادہ بحث نہیں کرنی ہے مختصر یہ اشارات کر دیے گئے لیکن اپنے ناظرین کے مزید اطمینان کیلئے ہم وہ بات بھی صاف کئے دیتے ہیں جسے اب تک ہم اشاروں اشاروں میں کہتے آ رہے تھے تفسیر کبیر میں علامہ رازی نے ”واقعہ سحر“ کے نقل میں جو تعبیر اختیار فرمائی ہے علامہ نے مکمل مسامحت کے ساتھ اسے قبول فرمایا ہے۔ تفسیر کبیر میں الفاظ یہ ہیں:-

”قال جبریل للنبي حل عقدة واقراء آية ففعل و

كان كلما قرأ آية انحلت عقدة (تفسیر کبیر جلد ۸ ص ۵۳۹)

حضرت جبریل نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا گرہ کھول لے اور آیت

پڑھیے تو آپ نے ایسا ہی کیا اور یہی ہوا کہ جب آپ ایک آیت

پڑھتے ایک گرہ کھل جاتی۔

اگر علامہ کو اس عبارت یا ایسی ہی کسی دوسری عبارت سے غلط فہمی ہوئی ہو تو سچ فہم

فرمائیں۔ قطع نظر اس سے کہ دوسرے عام مفسرین کی تفسیرات اسکے خلاف ہیں خود علامہ کی اپنی یہ عبارت بھی تناقض ہو جائے گی اگر اسے عام مفسرین کی تعبیر کے مطابق نہ سمجھا جائے گا۔ کیونکہ اس عبارت میں حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے حضرت جبریل کا یہ ارشاد نقل کیا گیا ہے کہ ”حل عقدۃ و اقراۃ“ یعنی ایک گرہ کھول لئے اور ایک آیت پڑھئے جو بظاہر ترتیب واقعہ کے خلاف ہے اصل ترتیب تو یہی ہے کہ پہلے آیت پڑھی گئی جسکے نتیجہ میں گرہ خود بخود کھلتی گئی اور یہ عمل بالکل رد و تقاضا اصل کیفیت سحر کا۔ سحر کی ترتیب بھی یہی ہوتی ہے کہ کچھ منتر وغیرہ پڑھ کر گرہ لگاتے ہوئے اس پر دم کیا جاتا ہے لہذا رد سحر میں بھی وہی ترتیب رکھی گئی کہ آیت پڑھتے جائیے گرہ کھلتی جائیگی۔

اسلئے تفسیر کبیر کی عبارت جو اپنے ظاہری مفہوم پر رکھی ہی نہیں جاسکتی علامہ کیلئے کسی طرح مفید مطلب نہ ہو سکے گی۔

## دوسری دشواری

جو علامہ نے اپنے لئے خود پیدا فرمادی وہ یہ کہ تفسیر کبیر کی مذکورہ بالا عبارت میں گرہ کھولنے کی ہدایت حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے منقول ہے جسکا تقاضا یہی ہو سکتا ہے کہ اگر گرہ کھولی بھی گئی تو خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کھولی ہوگی۔ اس صورت میں جب ہم آپؐ ہاتھوں سیکڑوں معجزات کا ظہور تسلیم کرتے ہیں تو ایک یہ معجزہ بھی تسلیم کر لیں گے کہ آپؐ نے بال کی گرہیں بھی اپنے ناخن مبارک سے کھول لیں جو کسی دوسرے انسان سے ممکن نہیں ہے لیکن علامہ تو شاید معجزہ کے

تصور بھی گھبراتے ہیں۔ موصوف ان بالوں کی عقدہ کشائی بھی معجزہ نبوی کے طور پر  
 ماننے کیلئے تیار نہیں ہیں اسی لئے یوں ارشاد فرماتے ہیں:-  
 ”آپ ایک ایک آیت پڑھتے جاتے تھے اور اسکے ساتھ ایک گرہ  
 کھولی جاتی“

اس عبارت کا یہ مطلب کہ خود آپ اپنے دست مبارک سے گرہ کھولتے تھے ہم جیوں  
 کی سمجھ سے بالاتر بات ہے علامہ کی امت مسلمہ جو مطلب چاہے سمجھ لے۔

### ناظرین کرام ششہ مضمون ہاتھ سے نہ جانے دیں

گذشتہ صفحات میں ہم نے ”دیباچہ تفہیم“ کا دوسرا قیاس پیش کیا تھا  
 اسکے دو حصے تھے پہلا حصہ علامہ کے ان دیباچوں کی پالیسی سے متعلق تھا جو انھوں  
 نے ہر سورہ کے آغاز میں شان نزول وغیرہ کے بارے میں تحریر فرمایا ہے۔ اس  
 حصہ الف سے متعلق راقم السطور کی معروضات ملاحظہ میں آچکیں

اقباس گذشتہ کا دوسرا حصہ علامہ کے ان حواشی کی وضاحت پر  
 مشتمل تھا جو موصوف نے مختلف آیات پر سپرد قلم فرمائے ہیں اب حصہ سے متعلق اپنی  
 معروضات پیش کی جا رہی ہیں۔ اقباس بالا میں علامہ نے تحریر فرمایا کہ

”اپنے حواشی میں میری انتہائی کوشش یہ رہی ہے کہ کوئی ایسی

بحث نہ چھیڑی جائے جو ناظرین کی توجہ قرآن سے ہٹا کر کسی دوسری

چیز کی طرف پھیر دے۔

(ملاحظہ ہوا قیاس بالا)

## اب ہم چاہتے ہیں کہ

ذرا تفہیم القرآن کے دو ایک حواشی پر نظر ڈال کر دیکھیں تو کہ علامہ کی یہ وصفا  
وصفا فی مبنی بر حقیقت بھی ہے کہ ہمیں یہ علامہ نے از راہ دانائی ناظرین تفہیم کو اپنی  
تفسیر کا شکار بنانے کیلئے اسی قسم کی وضاحتوں ہی کو دانہ و دام بنانے کی کوشش  
کی ہے۔

صفحات گذشتہ میں قرآن مجید کی سورتوں کے آغاز میں لکھے گئے دیباچوں  
پر تبصرہ کے لئے بالکل ہی انیر قرآن مجید کی معوذتین کا دیباچہ بطور مثال پیش کیا گیا تھا  
اب حواشی تفہیم کی مثال میں بالکل ہی شروع قرآن مجید یعنی سورہ بقرہ کی پہلی آیت  
کے حواشی ملاحظہ ہوں

## پہلی مثال

سورہ بقرہ کی بالکل ہی پہلی آیت **الْحَمْدُ** پر علامہ کا حاشیہ ملاحظہ ہو

فرماتے ہیں:-

۱۔ "یہ حروف مقطعات قرآن مجید کی بعض سورتوں کے آغاز میں پائے

جاتے ہیں۔ جس زمانہ میں قرآن مجید نازل ہوا ہے اس دور کے

اسالیب بیان میں اس طرح کے مقطعات کا استعمال عام طور پر معروف

تھا خطیب اور شعراء دونوں اس اسلوب سے کام لیتے تھے چنانچہ

اب کبھی کلام جاہلیت کے جو نمونے محفوظ ہیں ان میں اسکی مثالیں ہمیں

ملتی ہیں اس استعمال عام کی وجہ سے یہ مقطعات کوئی پھیتاں نہ تھے جس کو بولنے والے کے سوا کوئی سمجھتا نہ ہو بلکہ سامعین بالعموم جانتے تھے کہ ان سے کیا مراد ہے؟ اور یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرامؓ سے بھی ایسی کوئی روایت منقول نہیں ہے کہ انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کے معنی پوچھے ہوں۔ بعد میں یہ اسلوب متروک ہوتا چلا گیا اور اس بنا پر مفسرین کے لئے ان کے معانی متعین کرنا مشکل ہو گیا لیکن یہ ظاہر ہے کہ نہ تو ان حروف کا مفہوم سمجھنے پر قرآن سے ہدایت حاصل کرنے کا انحصار ہے اور نہ یہی بات ہے کہ اگر کوئی شخص ان کے معانی نہ جانے گا تو اس کے راہ راست پانے میں کوئی نقص رہ جائیگا لہذا ایک عام ناظر کے لئے کچھ ضروری نہیں کہ وہ ان کی تحقیق میں سرگرداں ہو۔ (تفہیم القرآن جلد اول ص ۴۹)

### اس حاشیہ کا تجزیہ بھی ملاحظہ ہو

چونکہ راقم السطور کے تبصرہ کا عنوان ہی ہے ”تفہیم القرآن سمجھنے کی کوشش“ اس لئے تبصرہ میں اسکی پوری کوشش کی جا رہی ہے کہ ہمارے ناظرین بھی تفہیم القرآن کو اسی بصیرت کے ساتھ سمجھ لیں اسی مقصد کے پیش نظر برابر یہ کوشش رہتی ہے کہ اپنی کوئی بات گنجلک اور غیر واضح نہ رہنے پائے چنانچہ اسی غرض سے علامہ کے حاشیہ بالا کا ضروری تجزیہ پیش کرنے کے بعد ہی اس پر کوئی تبصرہ ہو سکے گا۔ لیجئے پہلے تجزیہ ملاحظہ ہو۔



علامہ کا مندرجہ بالا حاشیہ چھوٹے چھوٹے متعدد جملوں پر مشتمل ہے جن میں سے ہر جملہ بجائے خود ایک مستقل دعویٰ ہے۔ تفصیل ملاحظہ ہو:-  
پہلا جملہ اس دعویٰ کو متضمن ہے:-

(۱) یہ حروف مقطعات (جو) قرآن مجید کی بعض سورتوں کے آغاز میں پائے جاتے ہیں زمانہ نزولِ قرآن مجید میں جو اسالیب بیان رائج تھے ان میں اس قسم کے مقطعات کا استعمال (شاذ و نادر نہیں) عام طور پر معروف تھا۔

دوسرا جملہ یہ دعویٰ کر رہا ہے اگرچہ یہ دعویٰ بذاتِ خود مستقل دعویٰ نہیں ہے بلکہ پہلے جملہ کا تکملہ و تتمہ ہی ہے:-

(۲) اس دور کے خطیب و شعراء دونوں ہی اس اسلوب سے کام لیتے تھے۔ تیسرا جملہ مدعی ہے کہ:-

(۳) اس وقت بھی کلام جاہلیت کے جو نمونے محفوظ ہیں انہیں قرآنی مقطعات جیسی مثالیں ہمیں (علامہ مودودی کو) ملتی ہیں۔

چوتھا جملہ جو من وجہ دعاوی ثلثہ کا نتیجہ بھی ہے لیکن بصورتِ دعویٰ یوں مذکور ہوا ہے:-

(۴) اس استعمالِ عام کی وجہ سے یہ مقطعات "کوئی پھیتاں" نہ تھے جبکہ بولنے والے کے سوا کوئی سمجھتا نہ ہو بلکہ سامعین بالعموم جانتے تھے کہ ان سے کیا مراد ہے؟

پانچواں جملہ، پانچواں دعویٰ اپنے تہ و دامن یوں چھپائے ہوئے ہے۔

(۵) یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بھی ایسی کوئی روایت منقول نہیں ہے کہ انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ان (مقطعات) کے معنی پوچھے ہوں۔

چھٹا جملہ ایک چھٹے دعویٰ پر مشتمل ہے لیکن اس جملہ نے "ترقی صحیح" کی پٹری چھوڑ کر "ترقی معکوس" کی لائن اختیار کر لی ہے۔ اس قدر تیز دوڑنے کے بعد یکدم رجعت قہقریٰ فرماتے ہیں، پھٹا دعویٰ یوں فرمایا جاتا ہے:-

(۶) بعد میں (مقطعات) کا یہ اسلوب متروک ہوتا چلا گیا۔

"رجعت قہقریٰ" کے عالم میں اگلا اسٹیشن بھی آگیا۔ اور ساتویں جملہ میں ساتواں دعویٰ یوں فرمایا گیا:-

(۷) اس بنا پر مفسرین کے لئے ان (مقطعات) کے معانی متعین کرنا مشکل ہو گیا۔

اعتراف شکست کے بعد بھی فوراً سکوت مناسب نہ سمجھا گیا اور اپنے تحقیق پسند طفلک دل کو بہلانے کیلئے دو تین جملے مزید سپرد قلم فرما دیے گئے ہیں ان جملوں میں "دعوے" کے تیسرے نہیں ہیں تو ہم بھی انہیں "دعووں" کی فہرست میں شامل نہیں کرتے لیکن تجزیہ کے طور پر انکا اعادہ بھی ضروری ہے۔ اس لئے نمبر وار نقل کئے دیتے ہیں۔

(۸) لیکن ظاہر ہے کہ نہ تو ان حروف (مقطعات) کا مفہوم سمجھنے پر قرآن سے

ہدایت حاصل کرنے کا انحصار ہے اور

(۹) نہ یہ بات ہے کہ اگر کوئی شخص ان (مقطعات) کے معانی نہ جانے گا تو اس کے

"راہ راست" پانے میں کوئی نقص رہ جائے گا لہذا

(۱۰) ایک عام ناظر کیلئے (خود علامہ کے لئے نہیں) کچھ ضروری نہیں کہ وہ ان

(مقطعات) کی تحقیق میں سرگرداں ہوں۔

## کس قدر خوش فہمی اور کیسی غلط فہمی

علامہ نے اپنے دیباچہ مقدمہ میں جہاں اتنا سب کچھ لکھا تھا اگر وہ یہ بھی وضاحت و صراحت فرما دیتے کہ انھوں نے یہ تفہیم صرف ان حضرات کے لئے تحریر فرمائی ہے جو ہر ایک کی ”ذہنی غلامی“ سے آزاد ہو کر صرف موصوف ہی کی ذہنی غلامی کو ”سند آزادی“ تصور کرتے ہوں تو راقم السطور جیسے بہت سے لوگ تفہیم القرآن سمجھنے کی منطق کو شش نہ کرتے لیکن ایسی صورت میں جبکہ علامہ کی طرف سے بڑی بلند آہنگی سے اس قسم کے دعاوی و اعلانات ہوں گے یا موصوف کی یہ تفسیر و تفہیم قرآن فہمی کے سلسلہ میں ایک بہت ہی مفید اضافہ ہے جس نے جملہ تفاسیر سابقہ پر خط نسخ و بطلان کھینچ دیا ہے تو ضروری ہوا کہ ان دعاوی کو میزان حقیقت میں تو لا بھی جائے اسی سلسلہ میں یہ محسوس ہوا کہ علامہ کو یا تو اپنے متعلق بیحد خوش فہمی ہے یا پھر وہ دوسروں کے متعلق سخت غلط فہمی کا شکار ہیں

## ذرا غور تو فرمایا جائے علامہ کی اس سادگی پر

دعوے تو ایک دو نہیں سات سات دعویٰ لیکن دلیل کسی ایک دعویٰ پر بھی قائم کرنے کی ضرورت محسوس نہ فرمائی گئی حالانکہ علامہ کا کوئی دعویٰ بھی ان کی امت کے باہر بغیر دلیل قابل سماعت نہیں ہے۔

(۱) علامہ کا یہ ارشاد کہ جس دور میں قرآن مجید نازل ہوا تھا اس وقت مقطعات کے اسلوب میں کلام کرتا عرب میں عام طور پر معروف تھا محتاج دلیل ہے جسے

قابل قبول انداز میں موصوف قیامت تک نہیں پیش کر سکتے۔ راقم السطور کو تھوڑا بہت جو کچھ بھی علامہ کی فنکاری کو سمجھنے کا موقع مل سکا ہے اسکی بنیاد پر انشاء اللہ تعالیٰ یہ بات بے بنیاد نہ کہی جاسکے گی کہ علامہ نے سورہ بقرہ کی پہلی ہی آیت کے پہلے ہی حاشیہ میں بڑی سخت علمی ٹھوک کھائی ہے۔ موصوف کا یہ حاشیہ اپنے ناظرین کے لئے مضحکہ خیزی کا تو موجب ہو سکتا ہے باقی اس سے کسی صاحب علم ناظر کو کوئی سرمایہ علم و تحقیق ہاتھ آئے بالکل ناممکن ہے۔

(۲) موصوف کا یہ ارشاد بھی بالکل ہوائی ہے کہ اسوقت خطیب و شعراء دونوں اس اسلوب سے کام لیتے تھے چنانچہ اب بھی کلام جاہلیت کے جو نمونے محفوظ ہیں ان میں اسکی (ایک دو مثال نہیں بلکہ بہت سی) مثالیں ملتی ہیں۔

ناظرین تفہیم میں سے وہ حضرات جو علامہ کے حلقہ بگوش ہیں وہ تو موصوف کے یہ فقرے پڑھکر ضرور علامہ کی شان علم پر عیش عیش کر اٹھیں گے ممکن ہے کچھ حضرات کو غش پہ غش بھی آنے لگیں لیکن راقم السطور تو اس خالی خالی دعویٰ سے ہرگز متاثر و مرعوب نہ ہو سکے گا بلکہ فی الجملہ ادب ہی سے سہی اس دعوے کی کی مثالوں میں سے دو چار مثالیں اپنی معلومات کے لئے ضرور طلب کرنا چاہے گا بہتر ہوگا کہ تفہیم کے اگلے ایڈیشن میں اسکی چند مثالیں ضرور پیش فرمادی جائیں۔

**ٹپکے گا وہی ظرف سے جو ظرف میں ہوگا**

علامہ کے اقتباس مندرجہ بالا میں مقطعات سے متعلق موصوف کا یہ انداز صفائی کہ یہ مقطعات کوئی جیتاں نہ تھے جس کو بولنے والے (یعنی خدا تعالیٰ) کے

سوا کوئی سمجھتا نہ ہو موصوف کے اس جذبہ ادب اور احساسِ خوف و خشیت کو ہیافتہ بالکل غیر شعوری طور پر صفوہ تفسیر پر بے نقاب کئے دے رہا ہے جسکی بڑی خوبصورت تصویر گذشتہ صفحات میں پیش ہو چکی ہے۔

ناظرین اگر غور فرمائیں گے تو شاید یہ بات آسانی سے سمجھ میں آجائے گی کہ موصوف نے مقطعاتِ قرآنیہ پر ہیبت کی پھبتی غیر ارادی طور پر محض بے خیالی میں نہیں کہی ہے بلکہ واقعہ یہی ہے کہ جس قسم کی آزادی و بیباکی اور جرأت و جبارت کے جذبات کی پرورش اپنے دل و دماغ میں موصوف خود فرماتے رہتے ہیں اور اور جس کے بیچ اپنی امت کے دل و دماغ میں اپنی تحریروں کے ذریعہ برابر بولتے رہتے ہیں۔ عادت و معمول کے مطابق وہی جبارت آمیز تعبیر شاید بیانتہ طور پر ہی دل و دماغ سے باہر نکلے زبانِ قلم پر آہی گئی اور ہم سمجھتے ہیں کہ کلابل ران علیٰ قلوبہم ما کانوا یکسبون کے مصداق موصوف کو اپنی ایسی تعبیرات میں کوئی قباحیت بھی نظر نہ آئیگی اور وہ اسے اہل مدرسہ اور اہل خانقاہ کی بیجا عقیدتمندی قرار دیتے ہوئے اسکا کوئی نوٹس لینا بھی خلافتِ شان سمجھیں گے۔

## تقابلِ مطالعہ

”مقطعاتِ قرآنیہ“ سے متعلق علامہ مودودی کی تحقیق انیق حاشیہ منقولہ میں پیش کی جا چکی ہے جسکے بے دلیل سات دعووں پر تبصرہ چل رہا ہے اسی تبصرہ میں آپ کے لطف کو دوبالا کرنے کیلئے اور اپنی بات کو مزید قابلِ توجہ بنانے کے خیال سے مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم اسی سلسلہ میں دوسرے مفسرینِ کرام کی

تفسیری تصریحات بھی یکجا ذکر کر دیں کہ تقابل باہم کی روشنی میں علامہ کی مندرجہ بالا بینظیر  
دلائل جواب تحقیق "اپنے صحیح حد و خال میں آپ کے سامنے آجائے۔"

## اقوال مفسرین

نقل کرنے سے پہلے مختصر طور پر یہ وضاحت ضروری ہے کہ تقریباً تمام ہی  
مفسرین کی تصریحات و تحریرات کا خلاصہ اس طور پر کیا جاسکتا ہے کہ قرآنی مقطعات  
کے سلسلہ میں ابتداءً دو مسلک سامنے آتے ہیں ایک مسلک کے مطابق "مقطعات قرآنی"  
"تشابہات" کے تحت آتے ہیں جن کے یقینی معنی اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہیں ان کے  
معنی کی تفتیش اور کرید جائزہ ہی نہیں ہے۔ دوسرے مسلک کے مطابق یہ "تشابہات"  
میں تو داخل نہیں ہیں اسلئے ان کے معنی میں رائے زنی کیجا سکتی ہے لیکن ایسا بھی  
نہیں ہے کہ کوئی ایک ہی مفہوم و مراد متعین ہو چنانچہ مختلف لوگوں سے انکی مختلف  
تاویلات و توجیہات منقول ہیں جو اتنی ہیں کہ ہم اس تبرہ کو انکے نقل سے طول دینا  
پسند نہیں کرتے اس پس منظر میں اب حضرات مفسرین کے اقوال ملاحظہ ہوں:-

۱۔ تفسیر معالم التنزیل میں امام بغوی (متوفی ۳۸۱ھ) فرماتے ہیں  
"(الف) امام شعبی اور ایک جماعت مفسرین کا قول ہے کہ "التم" اور دوسرے  
مقطعات قرآنی سورتوں کے شروع میں آئے ہیں یہ از قبیل تشابہات ہیں جنکا علم  
اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے اور یہ ایک قرآنی رائے ہے (چیتاں نہیں) ہم  
ان الفاظ ہی پر ایمان لاتے ہیں اور اسکے مراد می معنی کو اللہ تعالیٰ ہی کے سپرد کرتے  
ہیں (اگر کوئی عقلمند یہ سوال کرے کہ پھر ان کے ذکر سے کیا فائدہ تو اسکا جواب یہ ہے کہ)

ان کے ذکر سے غرض یہ ہے کہ مسلم حقیقی سے ان پر یونہی ایمان لانے کا مطالبہ کیا جائے گا وہ ان پر بے چوں و چرا ایمان لے آئے گا چنانچہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ہر کتاب میں کوئی خصوصی راز ہوتا ہے اسی طور پر اللہ تعالیٰ کے اسرار قرآنی میں مقطعات ہیں جو سورتوں کی ابتدا میں پائے جاتے ہیں۔ اور حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ فرماتے ہیں کہ ہر کتاب میں کوئی مخصوص بات ہوتی ہے چنانچہ اس قرآن مجید کا خصوصی حصہ ہی مقطعات ہیں۔ داؤد بن ابی ہند کہتے ہیں کہ میں حضرت امام شعبیؒ سے ان افتتاحی کلمات کے متعلق سوال کرتا تو آپ فرماتے کہ اے داؤد ہر کتاب کا ایک راز ہوتا ہے اور قرآنی راز یہی فقرہ ہے جو سورتوں کے شروع میں آئے ہیں لہذا انھیں چھوڑوان کے سوا جو چاہئے پوچھو۔

(ب) اور ایک جماعت نے کہا کہ ان کے معانی معلوم ہیں پھر اس جماعت کے اختلافات بہت سے اقوال میں پھیل گئے (جنکی تفصیل سے سردست صرف نظر کیا جاتا ہے)۔

۲۔ تفسیریں کبیر میں علامہ فخر الدین رازی (متوفی ۷۴۰ھ) فرماتے ہیں:-  
 ”اللہ تعالیٰ کے قول ”الحم“ اور اس جیسے دوسرے کلمات کے بارے میں (جو قرآنی سورتوں کے آغاز میں پائے جاتے ہیں) لوگوں کے دو قول ہیں۔  
 (الف) یہ ایک پوشیدہ علم اور درپردہ راز ہے جسے اللہ تعالیٰ نے صرف اپنے لئے مخصوص فرما رکھا ہے یہی قول ہے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اور ایسا ہی حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے بھی فرمایا ہے (تفصیلی روایت



نقل ہو چکی)۔ (تفسیر کبیر ص ۱۵)۔

چند سطروں کے بعد اسی تفسیر کبیر میں ہے کہ امام شعبی سے ان کلمات کے بارے میں سوال کیا گیا تو فرمایا کہ یہ اللہ تعالیٰ کا راز ہے اسے نہ پوچھو اور ابو ظبیاں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ علماء اسکی حقیقت دریافت کرنے سے عاجز ہو چکے ہیں۔ اور حضرت عیین بن الفضل نے (تو صافات صافات) فرمادیا کہ یہ مقطعات تشابہات میں سے ہیں (تفسیر کبیر ص ۱۵۱)۔

متکلمین فلاسفہ اسکا انکار کرتے ہیں اور اپنے مدعا پر عقلی و نقلی دلائل پیش کرتے ہیں اور آگے چل کر امام رازی نے ان لوگوں کے اقوال ذکر فرمائے ہیں جو مقطعات کو کو قابل فہم کہتے ہیں۔ یہ جملہ اقوال امام رازی کی نقل کے مطابق ہیں جو تفسیر کبیر میں دیکھے جاسکتے ہیں (ص ۱۵۲ و ۱۵۳)۔

۳۔ تفسیر ابن کثیر میں حافظ عماد الدین ابوالفدا ابن کثیر دمشقی (متوفی ۷۴۲ھ) فرماتے ہیں :-

قرآنی سورتوں میں شروع میں جو مقطعات ہیں ان کے بارے میں مفسرین کو اختلاف ہے کچھ حضراتؒ ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ یہ مقطعات اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہیں لہذا انھوں نے اللہ ہی کے سپرد کر دیا اور خود ان لوگوں نے کوئی تفسیر ہی نہیں کی چنانچہ تفسیر قرطبی میں امام قرطبی نے (خلفائے اربعہ) حضرت ابوبکر صدیق، عمر فاروق، عثمان غنی و علی رضی اللہ عنہم سے یہی قول نقل کیا ہے اور عامر شعبی سفیان ثوری، ربیع بن خثیم نے یہی کہا ہے اور ابو حاتم ابن حبان نے اسی قول کو اختیار کیا ہے (امام قرطبی کا یہ قول ابن کثیر نے نقل کیا ہے اسلئے یہ ایک قول

دو قول ہو گیا ہے)

دوسرا قول وہی ہے کہ ان کے معانی معلوم ہیں اور ہر ایک نے اپنے معانی بیان کئے ہیں (تفسیر ابن کثیر ص ۶۵)۔

۴۔ تفسیر ابی السعود میں علامہ ابوالسعود نے اسی انداز میں دونوں قول نقل کئے ہیں حضرت علی اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مذکورہ بالا قول نقل کیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ اور حضرت شعبی کے وہی مقولے ذکر کئے ہیں جو ادھر گزر گئے۔

اور ان کے معانی جاننے والوں کے وہی اختلافی اقوال بھی نقل کئے ہیں (تفسیر ابی السعود بر حاشیہ تفسیر کبیر)

۵۔ تفسیر "غرائب القرآن" میں علامہ قسطلانی نے امام رازی کی تفسیر کبیر ہی کے اقوال کی گویا تلخیص نقل فرمادی ہے (ملاحظہ ہو غرائب القرآن بر حاشیہ طبری ص ۱۱۷)۔

۶۔ تفسیر طبری میں علامہ ابن جریر طبری (متوفی ۳۴۰ھ) نے بھی مجموعی طور پر تقریباً اس اقوال ذکر کئے ہیں جن میں سے ایک قول انکے "راذ" ہونے کا بھی نقل کیا ہے لیکن کسی کی طرف اس قول کی نسبت نہیں کی ہے (تفسیر طبری ص ۶۶)۔

۷۔ تفسیر منظر میں بیہقی وقت حضرت قاضی ثناء اللہ صاحب مورت پانی پتی (متوفی ۷۲۵ھ) فرماتے ہیں :-

اس سے پہلے "مقطعات" سے متعلق مختلف اقوال ذکر فرما دیے ہیں میرے نزدیک حق بات یہی ہے کہ یہ مقطعات تشابہات میں سے ہیں جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان ایک راز ہے جسے عام لوگوں کو نہیں بتایا گیا ہے۔

قاضی صاحب نے بھی اس موقع پر ”سمرقندی“ اور ”طبری“ کے حوالہ سے انھیں حضرت  
 صحابہ کرام اور ائمہ عظام کے نام شمار کئے ہیں جو اوپر ابن کثیر کے حوالہ سے نقل کئے گئے  
 ہیں۔ مزید برآں قاضی صاحب یہ بھی فرماتے ہیں کہ امام ”سجاولندی“ نے فرمایا کہ  
 صدر اول کے حضرات سے یہی مروی ہے کہ ”مقطعات“ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول  
 کے درمیان ”رازدہی“ ہیں۔ (تفسیر مظہری ج ۱ ص ۱۱۰)

### کمال ہوشمندی ملاحظہ ہو کہ

علامہ نے اپنے حاشیہ میں اس صراحت کی مطلق ضرورت محسوس نہ فرمائی  
 کہ ذرا یہ بات تو صاف فرمادیتے کہ آخر ان مقطعات کے معانی کس دور تک معروف  
 و متعارف رہے اور یہ اسلوب کب سے متروک ہونا شروع ہو گیا اور کب سے  
 مفسرین کے لئے ان کے معانی متعین کرنا مشکل ہو گیا۔

### علامہ نے یہ خیال نہ فرمایا کہ

مقطعات کے معانی کو نزول قرآن مجید کے دور میں معلوم و معروف  
 تسلیم کر کے بعد کے ادوار میں ان کے یقینی معنی کو متروک قرار دینے کے نتیجہ میں  
 خود اصل قرآن مجید اور اس کے جملہ معانی و مطالب سے متعلق بھی وہ شک و  
 ارتیاب اور عدم اعتماد کی کیسی فضائیاں کئے دیتے ہیں؟ اب تو جس کا جی چاہے  
 جس چیز کے متروک ہونے کا دعویٰ کر بیٹھے۔ کاش علامہ مفسر ہونے اور مفسر بننے  
 کے فرق ہی کو سمجھ لیتے۔

## علامہ کا یہ ارشاد کیا اسی روز کیلئے تھا کہ

”قرآن کی تین چوتھائی سے زیادہ تعلیم بلکہ اسکی حقیقی روح نگاہوں سے مستور ہو گئی“ (قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں ص ۱۳)

## اور مولانا علی میاں کا یہ تبصرہ بالکل بر محل تھا کہ

”اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس طویل مدت میں یہ کتاب غفلت و جہالت کی نذر رہی اسکے حقائق کو سمجھا نہیں جاسکا اور نزول قرآن کے تھوڑی ہی مدت کے بعد اس سے استفادہ کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ (منصب نبوت اور اسکے عالی مقام جلد ۶ تا ۸۱)

عربی کی مندرجہ بالا تفاسیر (جنکے حوالے اوپر نقل ہوئے) جو مختلف دور کی تصانیف ہیں ان کے مفسرین اس حقیقت سے کیسے بے خبر ہیں جسکا انکشاف علامہ اپنے حاشیہ میں فرمایا ہے۔ ایک مفسر بھی تو علامہ کی ہمنوائی کے لئے تیار نہیں ہے نتیجہ وہی کہ ص ۶۰ - اکیلے پھر رہے ہیں یوسف بے کارواں ہو کر۔

## قابل غور ہے کہ

بقول علامہ جب ”یہ مقطعات“ نزول کے وقت معروف و متعارف تھے تو حضرات خلفائے راشدین حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم عبداللہ بن عباس

امام شعبی و سفیان ثوری حین بن افضل بلکہ ایک جماعت نے انکو "مشابہ" اور "راز" کیسے کہہ دیا (ملاحظہ ہو صفحات گذشتہ میں حوالہ تفسیر بغوی ابن کثیر وغیرہ)۔  
پھر حضرت قاضی ثناء اللہ صاحب تفسیر منظرہ میں تو علامہ "سجاد ندوی" سے یہی نقل فرماتے ہیں کہ صدر اول کے لوگوں سے ان مقطوعات قرآنی کے "راز" ہونے ہی کی روایت منقول ہے۔

## ”قرآنی مقطوعات“

### اردو تراجم و تفاسیر کی روشنی میں

تفسیرات عربی کے حوالہ جات کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اردو کے جو تراجم و تفاسیر آسانی ہمیں مل سکی ہیں انکے بھی کچھ اقتباسات پیش کر دیں اردو دان طبقہ ان متداول کتب تفسیر و تراجم قرآن تک مراجعت کر کے ہمارے بیان پر مزید اطمینان کر سکے۔

۱۔ تفسیر فیض القرآن میں ہے الف، لام، میم حروف مقطوعات میں سے ہیں یہ اللہ اور رسول کے درمیان ایک بھید ہے۔ اس کے اصل معانی تک کسی کی رسائی نہیں ہے۔ ان کے معانی جس حد تک جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے اس حد تک اسے اس کا علم ہے۔ اس کے علاوہ بزرگوں نے اپنی کیفیات کے مطابق بالکشف سمجھا ہے جس کا واقعی ہونا تحقیق سے نہیں کہا جاسکتا (حاشیہ پر فرماتے ہیں) الحمد یہ سورہ کی سرخی اور اجمال ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بتا دیا گیا ہے ”(فیض القرآن ۷ مطبوعہ کراچی)

۲۔ تفسیر معارف القرآن میں مفتی محمد شفیع صاحب علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:-  
 ”آلَم بہت سی سورتوں کے شروع میں چند حروفوں سے مرکب ایک کلمہ لایا گیا ہے  
 جیسے آلَم - حَمْد - الْمَدْح ان کو حروف مقطعه کہا جاتا ہے ان میں ہر حرف  
 جدا جدا رکن پڑھا جاتا ہے الف، لام، میم۔

حروف مقطعه جو اوائل سورہ ہیں آئے ہیں ان کے متعلق بعض مفسرین نے  
 فرمایا ہے کہ یہ ان سورتوں کے نام ہیں۔ بعض نے فرمایا کہ اسمائے الہیہ کے رموز ہیں، مگر  
 جمہور صحابہ و تابعین اور علمائے امت کے نزدیک راجح یہ ہے کہ یہ حروف رموز و اسرار  
 ہیں جنکا علم سوائے خدا تعالیٰ کے کسی کو نہیں ہے اور ہو سکتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ  
 علیہ وسلم کو اسکا علم بطور ایک ”راز“ کے دیا گیا ہو جسکی تبلیغ امت کے کئے روک دی  
 گئی ہو اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ان حروف کی تشریح و تفسیر میں  
 کچھ منقول نہیں ہے۔ امام تفسیر قرطبی نے اپنی تفسیر میں اسی کو اختیار فرمایا ہے ان کے  
 بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ:-

”عامر شعبی، سفیان ثوری اور ایک جماعت محدثین نے فرمایا ہے کہ ہر آسمانی  
 کتاب میں اللہ تعالیٰ کے کچھ خاص اسرار و رموز ہوتے ہیں اسی طرح ان حروف مقطعه قرآن  
 میں حق تعالیٰ کا راز ہے اسی لئے یہ ان تشابہات میں سے ہیں جنکا علم صرف حق تعالیٰ  
 ہی کو ہے۔ ہمارے لئے ان میں بحث و گفتگو بکلی جائز نہیں مگر اس کے باوجود وہ  
 ہمارے لئے فائدے سے خالی نہیں، اول تو اپنا ایمان لانا پھر انکا پڑھنا ہمارے لئے  
 ثواب عظیم ہے دوسرے انکے پڑھنے کے معنوی فوائد و برکات ہیں جو اگرچہ ہمیں معلوم  
 نہ ہوں مگر غیب سے وہ ہمیں پہنچتے ہیں۔ علامہ قرطبی نے پھر فرمایا حضرت صدیق اکبر

فاروق اعظم، عثمان غنی، علی مرتضیٰ، عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہم جمہور صحابہ کا ان حروف کے متعلق یہی عقیدہ تھا کہ یہ اللہ کے اسرار میں ہیں ان پر ایمان لانا چاہیے کہ اللہ کی طرف سے آئے ہیں اور جس طرح آئے ہیں انکی تلاوت کرنا چاہیے مگر معنی معلوم کرنے کی فکر میں پڑنا درست نہیں۔

ابن کثیر نے بھی قرطبی وغیرہ سے نقل کر کے اسی مضمون کو ترجیح دی ہے اور بعض اکابر علماء سے جو ان حروف کے معنی منقول ہیں اس سے صرف تمثیل و تشبیہ اور تسہیل مقصود ہے یہ نہیں کہ مراد حق تعالیٰ یہ ہے، اسلئے اسکو کبھی غلط کہنا تحقیق علماء کے خلاف ہے۔ (معارف القرآن مفتی محمد شفیع صاحب ج ۱ جلد ۱)

۳۔ حافظہ محمد خالص صاحب کے مترجم قرآن مجید کے حاشیہ پر ہے :-

”الہم اور اسی طرح کے اور حروف جو قرآن مجید کی متعدد سورتوں کے شروع میں آئے ہیں اور جنکو حروف مقطعه کہتے ہیں ”اسرار الہی“ میں سے ہیں اپنی بے قیہ قال ایمان لانا چاہیے۔ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے کچھ معنی بیان نہیں فرمائے ہیں صرف یہی فرمایا ہے کہ الف ایک حرف اور لام ایک حرف اور میم ایک حرف ہے۔“ (حاشیہ ترجمہ جالندھری)۔

۴۔ حضرت شہید المہند علیہ الرحمہ اپنے حاشیہ میں فرماتے ہیں :-

”الہم ان حروف کو مقطعات کہتے ہیں ان کے اصل معنی تک اوروں کی رسانی نہیں بلکہ یہ بھیج دے اللہ اور اسکے رسول کے درمیان جو بوجہ مصلحت و حکمت ظاہر نہیں فرمایا اور بعض اکابر سے جو ان کے معنی منقول ہیں اس سے صرف



تمثیل و تشبیہ و تسہیل مقصود ہے یہ نہیں کہ مراد حق تعالیٰ یہ ہے تو اب اس کو  
 رائے شخصی کہہ کر تقلید کرنا محض شخصی رائے ہے جو تحقیق علماء کے خلاف ہے  
 (حاشیہ حضرت شیخ الہند)

۵۔ مفسر حقانی نے بھی اپنی تفسیر حقانی میں بڑی مفصل  
 بحث کی ہے۔ فرماتے ہیں:-

”علماء کا ایک گروہ تو یہ کہتا ہے کہ یہ منجملہ مشابہات کے ہیں جبکہ خدا تعالیٰ  
 اور اس کا رسول ہی جانتا ہے اور کوئی نہیں جانتا (اسکے بعد وہی حضرت ابو بکر اور  
 حضرت علی رضی اللہ عنہما کے اقوال نقل کئے ہیں پھر دوسرا قول انہیں اختلافات کے  
 ساتھ بڑی تفصیل سے نقل کیا ہے خود اپنا فیصلہ نہیں تحریر فرمایا اسلئے تفسیر کے  
 حاشیہ پر مولانا انظر شاہ صاحب کو فیصلہ فرمانا پڑا موصوف حاشیہ میں فرماتے ہیں:  
 ”افسوس کہ گفتگو مفسر کی مقطعات پر طویل ہونے کے ساتھ بے مزہ بھی  
 ہے مختصر اور راجح قول یہ ہے کہ یہ حروف مشابہات قرآنی میں سے ہیں کسی مصلحت  
 کی وجہ سے علم انکا عام بندوں کو نہیں دیا گیا۔“

(تفسیر حقانی ص ۱۴ تا ص ۱۶ جلد اول)

۶۔ حضرت حکیم الامتہ مولانا تھانوی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں  
 ”ان حروف کے معانی سے عوام کو اطلاع نہیں دی گئی شاید  
 حامل وحی صلی اللہ علیہ وسلم نے اہتمام کے ساتھ وہی باتیں بتلائی ہیں جبکہ نہ جاننے  
 سے دین میں کوئی حرج اور نقصان لازم آتا تھا لیکن ان حروف کا مفہوم نہ جاننے  
 سے کوئی حرج نہیں ہے اسلئے ہم کو بھی ایسے امور کی تنقیش نہ چاہیے۔“ (تلمیخ)

بیان القرآن میں حاشیہ حائل شریف)

۷۔ ایک دوسرے حائل شریف کے حاشیہ پر تفسیر  
فتح البیان سے منقول :-

”یہ حروف مقطعات ہیں اور اسراروحی میں سے ہیں کسی مصلحت سے  
خدا نے انکے معانی بندوں پر ظاہر نہیں کئے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے  
راشدین نے انکی تفسیر سے غاموشی اختیار فرمائی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے  
اتنا فرمایا کہ میں نہیں کہتا کہ آئمہ ایک حرف ہے بلکہ تین حروف ہیں ہر حرف پر  
دس نیکی ہے۔ وہ جو مفسرین نے انکے معانی بیان کئے ہیں وہ صرف قیاس ہے“  
(حائل شریف طبع کردہ نور محمد تاجر کتب دہلی)

۸۔ علامہ عبد الماجد دریا آبادی تفسیر ماجدی میں  
فرماتے ہیں :-

”مشاہیر صحابہ و تابعین میں سے اکثر کا ادراک و مفسرین کا مسلک  
یہ ہے کہ یہ حروف تشابہات قرآنی میں سے ہیں جنکا علم کسی مصلحت سے عام بندوں  
کو نہیں دیا گیا ہے۔ یہ اعتراض کہ قرآن مجید کے مخاطب جب ہم ہیں تو ان حروف  
کو بھی ہمارے لئے قابل فہم ہونا لازمی ہے کچھ زیادہ باوقوت و باوزن نہیں قرآن کے اندر  
اور جتنے مضامین و مطالب ہیں کیا وہ سب ہر کس تا کس کی سمجھ میں آگئے ہیں؟  
(تفسیر ماجدی ص ۵ جلد ۱)

۹۔ اے روشنی طبع تو بر من بلا شدی

علامہ کی روشنی طبع پر خراج تحسین پیش کرتے ہوئے یہ مصرع پہلے بھی

عرض کیا جا چکا ہے اور واقعہ بھی یہی ہے کہ علامہ کی عجیب و غریب نادر تحقیقات دیکھ  
دیکھ کر یہ مصرع تو اکثر یاد آتا رہتا ہے لیکن بار بار کی تکرار بار بھی ہو سکتی ہے اسلئے  
مصرعہ مذکور دل ہی دل میں پڑھ کر "خراج تحسین" پیش کر دیتا ہوں۔

عربی اردو دونوں ہی زبانوں کی سب تفسیر و تراجم کے متعدد دستند حوالے  
اب تک پیش کئے گئے انھیں دیکھ کر حضرات ناظرین بھی پوری طرح سمجھ گئے ہوں گے کہ  
قرآنی مقطوعات کے سلسلہ میں ابتداء تو دوسری گروہ سامنے آتے ہیں، ایک گروہ انھیں  
تشابہ اور رمز خداوندی بتاتا ہے جمہور صحابہ و مفسرین اسی کے قائل ہیں دوسرا گروہ انکے  
کچھ معانی بھی متعین کرتا ہے اس گروہ سے متعلق اشخاص الگ الگ باتیں کہتے ہیں  
جو تاویل و توجیہ کی حد تک قابل قبول سمجھی گئی ہیں کسی گروہ نے اپنی توجیہ کو مراد خداوندی  
نہیں بتایا ہے کیونکہ حقیقی مراد سی معنی کسی کے نزدیک ثابت و منقول ہی نہیں ہیں۔

اور ہمارے علامہ نے انھیں تقلید سلف سے سخت نفرت و بیزاری ہے  
یہ پسند نہ فرمایا کہ وہ بھی انھیں لوگوں میں شامل ہو کر کوئی قول اختیار فرمائیں اس لئے  
آں موصوف نے ایک تیسری بات فرمادی وہ یہ کہ ان کلمات کے حقیقی مراد سی معنی تھے  
اور یقیناً تھے کیونکہ نزول قرآن مجید کے دور میں یہ اسلوب عام طور پر متعارف تھا  
لیکن افسوس کہ اب انکے معنی نہیں بتائے جاسکتے کیونکہ مرور زمانہ سے وہ اسلوب  
متردک ہوتا گیا اب اسکا عارف عالم کوئی باقی ہی نہیں رہا جو انکے حقیقی معنی متعین کر سکے

## عجوبات کی خدا کی قسم لا جواب کی

علامہ کا یہ ارشاد پڑھ کر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد زبان پر آجاتا ہے گہرے

كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ إِنَّ يَقُولُونَ إِلَّا كَذِبًا (بڑی سخت بات ہے جو ان کے منہ سے نکلتی ہے (اور اس میں کوئی شک نہیں) جو یہ کہتے ہیں محض جھوٹ ہے) (سورہ کہف ترجمہ جالندہری)

علامہ نے یہ خیال نہ فرمایا کہ قرآن شریف کے کسی لفظ بلکہ کسی نقطہ کے متعلق یا اسکی "تشریح" کے متعلق یہ فرمادینا کہ یہ بات نزول قرآن کے وقت تو مفہوم و محفوظ تھی بعد میں اہل علم اور اہل قرآن اسکو محفوظ نہ رکھ سکے اللہ تعالیٰ کے وعدہ حفظ قرآن پر ایک ضرب کاری کی حیثیت رکھتا ہے

دوسری طرف علامہ کی یہ جرات بھی قابلِ توجہ ہے کہ موصوف اسی ایک حاشیہ میں دو متضاد سی باتیں ارشاد فرما جاتے ہیں یعنی ایک طرف تو یہ ارشاد ہے کہ "مقطعات قرآنی" کی تشریح کتب تفسیر و حدیث کے مصنفین محفوظ نہ رکھ سکے اور دوسری طرف اسی جگہ یہ بھی ارشاد فرما رہے ہیں کہ مقطعات کے نمونہ پر "کلام جاہلیت" کی مثالی اپنی تشریح کے ساتھ موجود ہیں یا للجب ہم نہیں سمجھ سکے کہ علامہ نے یہ حاشیہ تحریر فرما کر لوگوں کو قرآن مجید سے قریب کرنے کی کوئی کوشش فرمائی ہے یا اس طرح انکے دلوں میں قرآن مجید اور اسکی "تفسیر و تشریح" کی طرف سے شک وارتیاب کی تخم ریزی فرمائی ہے۔

تعجب ہوتا ہے علامہ کے اس انداز تحقیق پر

ابن جریر طبری (جبکی شیعیت بھی پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے) کی ذرا سی شہ موصوف کو کیا مل گئی کہ اسکے سہارے متقدمین کی ساری تضرعات سوہر دو انکھیں

بند کر کے صرف طبری شیعی کی ضعیف و مرہوج اور متروک پرائی رائے لیکر اسے اپنی طبع آزمائی تحقیق کی شکل میں پیش کر دینے کی جرات کر بیٹھے۔ یہ بھی نہ سوچا کہ جماعت مفسرین میں سے کسی ایک مستند مفسر نے بھی اس ”ٹوٹی بیا کھی“ کا سہارا نہیں لیا ہے۔ بلکہ علامہ ابن کثیر دمشقی اور قاضی ثناء اللہ صاحب نیز بعض دوسرے حضرات نے اسکی اچھی طرح تردید فرماتے ہوئے ان اشعار کو بحث سے غیر متعلق قرار دیدیا ہے جو اس سلسلہ میں نقل کئے گئے ہیں۔

## نزالہ طرز استدلال

صفحات گذشتہ میں علامہ کے حاشیہ تفہیم کا اقتباس پیش کر دینے کے بعد اسکا تجزیہ بھی پیش ہو چکا جس میں دکھلایا گیا ہے کہ علامہ نے ایک دو نہیں سات سات دعوے فرمائے ہیں اور سارے سببے دلیل ہیں۔

منجملہ ان دعوؤں کے ایک دعویٰ (جو پچھلے دعوؤں کیلئے دلیل کا درجہ بھی رکھتا ہے) یہ بھی ہے کہ ”مقطعات قرآنی“ اگر غیر مفہوم الفاظ ہیں تو صحابہ کرام کی جانب سے انکی بابت حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ”سوال و استفسار“ منقول ہونا چاہئے تھا اور اسکے جواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ جواب مروی ہونا چاہئے تھا کہ یہ الفاظ از قبیل تشابہات اور ناقابل فہم ہیں (جواب کی بات علامہ نے نہیں فرمائی ہے علامہ نے تو صرف سوال و استفسار ثابت نہ ہونے کو ہی اپنے مدعا کی دلیل بنایا ہے)۔ اور چونکہ روایات میں حضرات صحابہؓ کا کوئی سوال و استفسار منقول نہیں ہے لہذا ہمارا یہ دعویٰ ثابت ہے کہ یہ الفاظ

اس دور میں پوری طرح مفہوم تھے ہر کوئی اس اسلوب سے واقف تھا۔  
 یہ ہے علامہ کی تقریر استدلال جو راقم السطور سمجھ سکا ہے۔ علامہ کی طرح  
 خدا خواستہ محقق کو اپنے فہم پر ہرگز ہرگز حد سے زیادہ اعتماد نہیں ہے اسلئے یہ بھی  
 ممکن ہے کہ راقم السطور کو علامہ کا یہ انوکھا استدلال سمجھنے میں کچھ غلط فہمی ہو رہی ہو  
 لہذا ناظرین سے یہ التماس بھی ہے کہ اگر علامہ کا استدلال سمجھنے میں کوئی غلطی  
 ہو رہی ہو تو حضرات اہل علم محقق ضرور مطلع فرما کر اعتراف قصور فہم کا موقع دیں  
 لیکن اگر راقم السطور نے علامہ کے استدلال کی صحیح تقریر پیش کی ہے تو ازراہ کرم  
 حضرات اہل علم انصاف کو ملحوظ رکھتے ہوئے فیصلہ دیں کہ علامہ کا یہ طرز استدلال  
 کہاں تک معقول ہے؟ کیا کسی بات کا منقول و مروی نہ ہونا واقعاً یہ بات  
 ثابت کر بھی سکتا ہے کہ وہ بات فی الحقیقت نہیں ہوئی۔ علامہ کی ارشاد فرمودہ  
 بات انکے دعویٰ و مدعا کیلئے فی الجملہ ”قرینہ“ تو کہی جاسکتی ہے لیکن کوئی  
 قرینہ کا آدمی اسے دلیل کے طور پر تسلیم نہ کر سکے گا۔

## آخر علامہ نے یہ خیال کیوں نہ فرمایا کہ

خلفائے راشدین و حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم جیسے جلیل القدر  
 اور سابقین اولین صحابہ جو ان ”مقطعات کو“ سر اللہ“ اور ”سر القرآن“ اور ناقابل فہم  
 فرما رہے ہیں (جیسا کہ صفحات گذشتہ میں تفسیر قرطبی کے حوالہ سے علامہ ابن کثیر  
 وقاضی ثناء اللہ صاحب اور مفتی محمد شفیع صاحب رحمہم اللہ کی تحریرات میں تفصیل  
 کے ساتھ نقل کیا جا چکا ہے) تو یہ حضرات ایسی بات جو کسی طرح مددک بعقل

نہیں ہے اپنی طرف سے گڑھ کر کیسے فرمادیں گے ہونہ ہو یہ بات انھوں نے  
 سان بنوت ہی سے سنی ہوگی اور اگر اسی استدلال کو ذرا اور آگے بڑھاتے  
 ہوئے مزید عقل سے کام لیا جائے تو یہ بھی سمجھا اور کہا جاسکتا ہے کہ پہلے ان  
 حضرات نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی سوال واستفسار فرمایا ہوگا۔ اسکا  
 جواب معلوم ہو جاتے پر ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ایسے سوالات سے خاموشی اختیار کر لی اور  
 دوسروں کو یہ بتا گئے کہ قرآنی مقطعات خدا و رسول کے درمیان راز ہیں۔

## حضرات اہل علم وفہم فیصلہ فرما سکے ہیں کہ

علامہ کے مذکورہ بالا فتی پر مبنی "استدلال سے یہ مبنی بر ثبوت"  
 استدلال یقیناً مطابق اصول اور بالکل معقول ہے فلہذا الحمد ولہ الشکر۔

## ابجھا لیجئے یہ روایت کبھی حاضر ہے

علامہ کے منجملہ سات دعوؤں کے پانچواں دعویٰ یا استدلال یہ تھا  
 کہ "یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام سے کبھی ایسی کوئی روایت منقول نہیں ہے کہ انھوں  
 نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کے معنی پوچھے ہوں۔"

موصوف کے اس استدلال کی حقیقت پیش کر دی گئی جس سے  
 علامہ کی "معقولیت پسندی" اور "صلانیت استدلال" کا بکھرم بھی اچھی طرح  
 کھل گیا۔ اب ہم چاہتے ہیں کہ اس موقع پر اس روایت کا بھی ذکر کرتے چلیں جو  
 "مقطعات" کے سلسلہ میں متعدد کتب تفسیر میں منقول ہے۔ اس روایت کی روشنی



میں صاف پڑھا جاسکتا ہے کہ حضرات صحابہ کرام کے دور میں یہ مقطعات کا اسلوب ہرگز معروف و مستعارف نہ تھا

جس روایت کو ہم ذیل میں نقل کر رہے ہیں یہ متعدد کتب تفسیر میں منقول ہے۔ اور ہم جس روایت کے الفاظ کا ترجمہ پیش کر رہے ہیں وہ تفسیر ابن جریر طبری میں بھی ہے جو علامہ کے نزدیک تو معتبر ہے ہی۔ ملاحظہ ہو روایت یہ ہے (ملاحظہ ہو طبری جلد ۱ ص ۷)

### روایت ابن جریر طبری

”اپنی سند کے ساتھ جابر بن عبد اللہ بن وثاب سے راوی ہیں کہ — ابو یاسر بن اخطب (یہودی) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے گذرا اسوقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم سورہ بقرہ الحمد ذلک الکتاب لاریب فیہ تلاوت فرما رہے تھے تو وہ وہاں سے چل کر اپنے بھائی حمی بن اخطب کے پاس آیا جہاں بہت سے یہودی موجود تھے اور بولا تم جانتے بھی ہو میں نے (حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کو ابھی تلاوت کرتے سنا ہے جو کلام ان پر اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا ہے یعنی الحمد ذلک الکتاب لاریب فیہ تو وہ سب بولے کہ تو نے خود سنا ہے؟ بولا ہاں میں نے سنا ہے چنانچہ حمی بن اخطب وہاں سے اٹھ کر چلا اور وہ سب یہودی بھی ساتھ ساتھ تھے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں

حاضر ہو کر ان سب نے سوال کیا کہ ایسا ذکر کیا جا رہا ہے (یہ کہا شک  
 صحیح ہے کہ) آپ اپنے نازل شدہ قرآن میں یہ الفاظ تلاوت  
 کرتے ہیں اَلَمْ ذَالِكُ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ حضور صلی اللہ  
 علیہ وسلم نے فرمایا ہاں، تو بولے کیا یہ کلمات حضرت جبریل آپ تک  
 پہنچا گئے ہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے؟ آپ نے فرمایا ہاں۔ کہنے لگے  
 آپ سے پہلے اللہ تعالیٰ نے بہت سے انبیائے کرام مبعوث فرمائے  
 لیکن جہاں تک ہم جانتے ہیں اس نے کسی نبی کے بارے میں  
 دنیا میں قیام کی مدت بیان نہیں فرمائی ہاں ایک آپ ہی ہیں کہ  
 آپ کو آپ کے قیام کی مدت بھی بتادی گئی ہے اور پھر وہ اپنے  
 ساتھیوں کی طرف متوجہ ہو کر (اَلَمْ کی تشریح میں) کہنے لگا کہ الف  
 کے ایک، لام کے تیس اور میم کے چالیس کل اکہتر سال  
 ہوتے ہیں۔ تو کیا آپ لوگ کسی ایسے نبی کا دین قبول کریں گے جسکی  
 کل مدت ہی صرف اکہتر سال ہو۔ پھر وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم  
 کی طرف متوجہ ہو کر گویا ہوا کہ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ کے  
 پاس اسکے علاوہ کچھ اور بھی ہے آپ نے فرمایا ہاں ہاں بولا وہ کیا  
 ہے؟ فرمایا ”۲ مَقَصَّ“ وہ بولا کہ یہ تو اس سے زیادہ بھاری  
 اور طویل مدت ہے یعنی الف کے ایک، لام کے تیس، میم کے  
 چالیس اور صاد کے نوٹے اسکا مجموعہ تو ایک سو اکسٹھ ہو گیا  
 کیا اسکے علاوہ بھی کچھ ہے؟ آپ نے فرمایا ہاں، بولا کیا؟ آپ نے

فرمایا "الر" بولایہ بھاری اور طویل مدت ہے یعنی الف ایک  
لام تیس<sup>۳</sup> اور را کے دو سو یہ تو دو سو اکتیس سال ہو گئے پھر بولا کیسا کچھ  
اور بھی ہے۔ آپ نے فرمایا ہاں "السمیر" کہنا یہ تو اور بھی بھاری اور  
لمبی مدت ہو گئی کہ الف کے ایک لام کے تیس<sup>۳</sup> اور میم کے چالیس<sup>۴</sup> اور  
را کے دو سو یہ تو دو سو اکتیس سال ہو گئے

پھر بولا کہ آپ کا معاملہ تو کچھ سمجھ میں نہ آسکا تم تو کچھ نہ سمجھ سکے کہ آپ کو  
کتنی مدت دی گئی ہے تھوڑی یا زیادہ پھر وہ سب وہاں سے اٹھ کر  
چلے گئے تو پھر ابو یاسر نے اپنے بھائی حبیب بن اخطاب اور ساتھ جتنے  
بھی علمائے یہود تھے سب کہا کہ تمہیں کیا خبر ہو سکتا ہے کہ (حضرت) محمد  
(صلی اللہ علیہ وسلم) کیلئے یہ ساری ہی مدت مجموعی طور پر مقرر ہوئی ہو یعنی  
۷۱ + ۲۳۱ + ۲۷۱ + ۱۶۱ جنکا مجموعہ سات سو چوبیس سال ہو جاتا  
ہے لہذا انکا معاملہ تو واقعی سمجھ میں نہ آسکا۔

## روایت طبری کی تائیدات

سطور بالا میں علامہ کے اطمینان کیلئے ان کے نزدیک مسلم و معتبر تفسیر ابن جریر  
طبری کی ایک مفصل روایت پیش کر دی گئی جسکی موجودگی میں کسی صاحب علم و فہم کا یہ فراموش  
اکر "اسلوب مقطوعات" نزول قرآن کے دور میں عام طور پر معروف و مشہور تھا خطیب شہر  
دونوں اسی اسلوب کے کام لیتے تھے سامعین بالعموم جانتے تھے کہ اس کے کیا مراد ہے یہی وجہ  
ہے کہ صحابہ کرام سے بھی ایسی کوئی روایت منقول نہیں ہے کہ انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم

ان کے معنی پوچھ سوں) بالکل آنکھوں میں دھول جھونکنے کے مترادف اور بڑی بڑی علمی جسارت ہو چکی ہمت کوئی بڑا علامہ ہی کر سکتا ہے معمولی آدمی "خردہ گیری" کے اندیشہ میں یہ جزأت کہاں کر سکے گا۔

طبری کی مندرجہ بالا روایت علامہ ابن کثیر نے اپنی تفسیر ابن کثیر جلد ۱۰ پر نقل فرمائی ہے اور اس کے ضعف کو تسلیم کرتے ہوئے دوسرے اقوال کی تردید کے لئے قابل استدلال بھی سمجھا ہے۔

طبری کی مندرجہ بالا روایت بغیر کسی کلام کے نقل محض کے طور پر علامہ رازی نے بھی جلد ۱۵۲ میں ذکر کی ہے۔

طبری کی مذکورہ بالا روایت خود حاشیہ طبری پر تفسیر غرائب القرآن میں نقل کی گئی ہے (حاشیہ ص ۱۲۱ ج ۱)۔

طبری کی مذکورہ بالا روایت قاضی شہار الدین صاحب پانی پتی نے اپنی تفسیر منظرہ میں جلد ۱۳ پر نقل کی ہے بلکہ موصوف نے تفسیر طبری کے علاوہ امام بخاری سے تاریخ کا بھی حوالہ دیا ہے۔

ایسی صورت میں جبکہ زمانہ نزول قرآن میں ان "مقطعات" کا حقیقی مفہوم سمجھنا نہ جاسکا تھا اور یہ نہ سمجھنے والے کون تھے؟ یہ علمائے یہود تھے (جن کے تعلیم یافتہ ہونے کا انفرادی علامہ کو بھی ہے) تو یہ بات قابل غور ہے کہ اس زمانہ "صاحبان عالم" تو مقطعات سے بے خبر اور بالکل بچور اور اصرار وصر کی ہانک رہے ہوں لیکن زمانہ نزول قرآن کے چودہ سو سال پندار علم و تحقیق سے سرشار ہو کر کوئی محقق یہ ہانک لگائے کہ "مقطعات" کا اسلوب نزول قرآن کے دور میں تو معروف و متعارف تھا بعد میں متروک ہوتا چلا گیا

تو آپ ایسے محقق کیلئے کیا ارشاد فرمائیں گے؟ علماء اسلام انہیں انصاف کیسے بخدا لگتی۔

## کوئی علامہ سے ذرا دریافت کرے کہ

مفسر علامہ نے آپکی یہ نزالی اور خالص منطقی بات چلے تسلیم کر لی کہ مقطعات پطستان نہ تھے نزول قرآن کے وقت ہر صحابی کو مفہوم و مطلب معلوم تھا تو کیا ان حضرات صحابہ کی اولادیں بھی آجکل کے ہم لوگوں کی اولاد کی طرح شعور آتے ہی انگلش اسکول میں بھیج دی جاتی تھیں اور انہوں نے اپنے بزرگوں سے قرآنی تعلیم مطلق حاصل نہ کی تھی؟ ظاہر ہے کہ اس سوال کا جواب نفی میں دینے کی جرات نہ کی جاسکے گی اور یہی جواب ہوگا کہ بیشک حضرات صحابہ کرام نے اپنی اولاد کو قرآنی تعلیم دی اور یقیناً دی۔

پھر دوسرا سوال یہ ہوگا کہ انہی اولاد نے مقطعات کا مفہوم ان سے سیکھا یا نہیں سیکھا اس سوال کا جواب بھی آپ نفی میں نہ دیں تو اچھا ہے۔ نفی کے جواب سے تو ہمارا کوئی نقصان نہیں ہے مگر یہ صورت آپ ہی کی ارشاد فرمائی اس منطق کے خلاف ہے جو آپ نے اس جگہ استعمال فرمائی ہے کہ ان کے پوچھنے کی کوئی روایت منقول نہیں ہے۔ اس سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ وہ بچے بھی پیدا نشی طور پر قرآن مجید تو چاہے پڑھے ہوئے نہ ہوں لیکن مقطعات کے مطلب سے وہ ضرور آشنا تھے ورنہ ان کے پوچھنے کی روایت منقول ہوتی؟

الغرض جناب کی نزالی منطق پر جرح کا یہ صرف ایک نمونہ ہے۔ یہ سلسلہ سوالات ہر دور میں قائم کیا جاسکتا ہے اور آپ کو سوال و جواب کے دائرے میں رکھ کر مجبور کیا جاسکتا ہے کہ آپ اس نامبارک و نامسعود دور کی ذرا نشاندہی فرما دیں جس دور سے مقطعات علم

لوگوں سے اٹھایا گیا ہو۔

## یہ تبصرہ آخری منزلوں میں

علامہ کے حاشیہ تفہیم پر یہ تبصرہ چل رہا ہے جو طویل سے طویل تر ہوتا چلا جا رہا ہے لیکن حالات کے صحیح و معقول تقاضے سے مجبور ہو کر یہی تفصیل طویل گوارا کی جا رہی ہے۔ بقول کسے ”من آثم کم من دأثم“ راقم السطور کو اپنی بہتری و گناہی کا پورا پورا اعتراف ہے جبکہ علامہ مودودی ایک معروف و بلند قامت شخصیت کے حامل ہیں احقر کو اس بات کا بجا طور پر احساس ہے کہ علامہ کی تفہیم پر کوئی تبصرہ اگر صرف ”اقوال“ پر مشتمل ہوگا تو ناظرین کی ایک بڑی تعداد اسے قابل اعتنا اور درخور توجہ بھی نہ گردانے گی اس لئے اس بات کا پابندی کے ساتھ اہتمام ہے کہ جو کچھ لکھا جائے اسکی تائیدات و حوالہ جات بھی ضرور ذکر کئے جائیں محض خوف تطویل کے باعث اسے نظر انداز کرنا کسی طرح مناسب و معقول نہ ہوگا۔

## صرح کھلونے وے کے پہلایا گیا ہوں

مقطعات قرآن کے سلسلے میں علامہ نے جو مضحکہ خیز انداز اختیار فرمایا ہے ہمیں پورا یقین ہے کہ موصوف کی ”ذہنی غلامی“ قرآن والوں کے سوا ہر ضابطہ علم و فہم اسے پڑھکر اسکی مضحکہ خیزی سے اختلاف نہ کر سکے گا۔

بہر حال علامہ نے اپنے حاشیہ تفہیم کی ابتدائی سطروں میں جو بے مقصد غلامی فرمائی فرمائی ہے شاید اسکی ”بے مقصدیت“ خود ان پر بھی اچھی طرح روشن نکلی اسلئے آخر میں

اس سوال کو نظر انداز بھی نہ فرما سکے جو مقطعات کے سلسلہ میں عام طور پر ذہنوں میں پیدا ہو سکتا ہے یعنی یہ کہ جب مقطعات قرآنی ناقابلِ نسب ہیں تو ان کا نزول کیوں ہوا؟ یا علامہ کی تشریح کے مطابق سوال یوں ہوگا کہ جب مقطعات قرآنی کے معانی و مطالب ہمارے سلف کی عقلیت سے فراموش ہو گئے تو اب ان مقطعات ہی کو قرآن مجید میں کیوں باقی رکھا گیا انھیں بھی بھلا دیا ہوتا نہ رہتا بانس نہ بھتی بانسری قرآن مجید میں نہ یہ حروف مقطعات ہوتے نہ ان "پیتا نور" کے حل میں سرکھپانا پڑتا۔ چنانچہ موصوف نے اپنے حاشیہ کے آخری حصہ میں اسی سوال کا جواب دیتے ہوئے اپنے ناظرین کو دل بہلا کیلئے ایک "دل بہلاوا" اور کھلونا مرحمت فرمایا ہے موصوف کا یہ ارشاد دل بہلاوا اور کھلونا ہی کہا جاسکتا ہے :-

"ظاہر ہے کہ نہ تو ان حروف کا مفہوم سمجھنے پر قرآن سے ہدایت حاصل کر نیکا انحصار ہے اور نہ یہی بات ہے کہ اگر کوئی شخص ان کے معانی نہ جانتا تو اسکے "راہ راست" پانے میں کوئی نقص رہ جائے گا لہذا ایک عام ناظر کیلئے کچھ ضروری نہیں کہ وہ انکی تحقیق میں سرگرداں ہو"

مدرسہ قائمہ فقہ ہانڈوں کو شاید یہ فقرہ "باری" گوارا نہ ہو

راقم السطور کو تو بہر حال اس موقع پر علامہ کا یہ "کھلونا" (ذرا دیر کے لئے اسکا پرزہ پرزہ کھول کر ہی) ناظرین کو دکھانا ہے۔ علامہ کی یہ دلیل ذرا ادھوری شکل میں آپ کے سامنے آئی ہے اسکی مکمل شکل یوں بنتی ہے :-

(۱) قرآن مجید کہ نہ ہی اجزاء اور الفاظ قابلِ اعتناء ہیں جن پر ہدایت کا انحصار ہو



(۲) ظاہر ہے کہ ان حروف کا مفہوم سمجھنے پر قرآن سے ہدایت حاصل کرنے کا انحصار نہیں ہے اسلئے نتیجہ یہ نکلا کہ قرآن مجید کے یہ حروف مقطعات قابل اعتنا نہیں ہیں ایک عام ناظر کیلئے کچھ ضروری نہیں کہ وہ انکی تحقیق میں سرگرداں ہو۔

اس موقع پر یہ وضاحت بھی لطف سے خالی نہ ہوگی کہ ہم نے سطور بالا میں مدرسہ کے نام سے چڑھنے والوں کی رعایت کرتے ہوئے مدرسہ میں پڑھائی جانے والی منطق کی اصطلاحات کا مطلق نام نہیں لیا ہے کہ وہ حضرات بھی بغیر کسی سرگزانی کے علامہ کی دلیل کو اسکی اصل شکل میں دیکھ لیں۔

علامہ کی دلیل پڑھنے اور سمجھ لینے کے بعد ناظرین تفہیم کو پورا پورا حق ہے کہ موصوف کی اس دلیل سے جتنا فائدہ اٹھا سکیں اٹھالیں اور قرآن مجید کے ہر لفظ کا تجزیہ کر کے پہلے یہ دیکھ لیں کہ کس لفظ پر ہدایت حاصل کرنے کا انحصار ہے اور کس پر نہیں جس جس لفظ پر ہدایت کا انحصار سمجھ میں نہ آئے اسکو یوں ہی سرسری اور نظری قرار دیتے ہیں

## جلد ساز کا مشہور لطیفہ

کسی جلد ساز کے متعلق یہ لطیفہ مشہور ہے کہ اسکے پاس جو کتاب جلد ساز کیلئے آتی وہ اس میں کچھ نہ کچھ حک و اصلاح اور دو بدل ضرور کر دیتا ایک بار کسی صاحب نے ایک نہایت نادر قلمی قرآن مجید جلد سازی کیلئے دیا اور بڑی سختی سے تاکید کر دی کہ دیکھو بھائی یہ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے اس تمھاری اصلاح کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہرگز ہرگز کہیں رد و بدل نہ کر دینا۔ جلد ساز صاحب نے انکے سامنے پکا وعدہ کر لیا اور پوری طرح یقین دہانی کر دی کہ اس قرآن مجید وہ ہرگز ہرگز

کہیں حک و اصلاح نہ فرمائیں گے۔ صاحب قرآن مجید جب اپنا قرآن مجید لینے آئے تو انکے غیظ و غضب کی انتہا نہ رہی کیونکہ جلد ساز صاحب نے اپنی عادت کے مطابق جگہ جگہ اس کلام اللہ کو بھی اپنی اصلاح سے آراستہ فرما دیا تھا باز پرس کرنے پر وہ فرماتے ہیں جناب والا میں بھلا کلام پاک میں اصلاح کرتا یہ ہرگز میری مجال نہ تھی لیکن میں نے متعدد مقامات پر کچھ ایسے الفاظ دیکھے جنکا تعلق نہ تو قرآن مجید ہی سے کچھ سمجھ میں آسکا (ممکن ہے یہ بھی کہا ہو کہ قرآن مجید سے ہدایت حاصل کرنے کا کوئی انحصار بھی ان پر نظر نہ آیا) مثلاً کہیں بڑے بڑے کافروں کے نام لکھے ہوئے تھے، کہیں مچھر اور مکھی کے عربی نام لکھے ہوئے تھے، کہیں کلب و خنزیر جیسے نجس جانوروں کے نام تھے اور بہت سی جگہ پر تو کم بخت شیطان مردود کا نام لکھا ہوا تھا ظاہر ہے کہ ایسی چیزوں کا قرآن پاک میں کہاں ذکر آیا ہوگا (پھر ان پر ہدایت بھی کچھ موقوف نہیں ہے) اس لئے میں نے ہر ایسی چیز کا ذکر قرآن مجید میں رکھنا مناسب نہ سمجھا اور سب ناموں کو اسمیں سے مٹا دیا اور انہی جگہ پر کرنے کیلئے کہیں جناب کا نام نامی اور کہیں جناب کے والد بزرگوار کا نام نامی لکھ دیا۔

### یہ لطیفہ نظر انداز نہ کیا جاسکے گا

لطیفہ مذکور خدا جانے مبالغہ آمیز حقیقت ہے یا بلا مبالغہ صرف افسانہ ہی ہے اس کے باوجود کوئی صاحب اسے صرف لطیفہ کہہ کر اپنے قلمبندوں کے درمیان اسے گم کر کے نظر انداز نہیں کر سکتے۔ اس وقت تو یہ لطیفہ بہت ہی محل اور معنی خیز ثابت ہو رہا ہے۔

علامہ کیہ کھلونا اور دل بہلا دے جس پر تبصرہ آپ ملاحظہ فرما رہے ہیں (دو پرزوں پر مشتمل تھا پرزہ نمبر ۱ کی حقیقت ناظرین نے ملاحظہ فرمائی کہ کس طرح پرزہ پرزہ ہو گیا ہے۔ اس کھلونے کا دوسرا پرزہ بھی اسی کا رخانہ کا ڈھلا ہوا ہے اس پر مزید تبصرہ کر اپنا اور ناظرین کا وقت عزیز کیا ضائع کیا جائے اسلئے مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ علامہ کے کھلونے پر مزید تبصرہ کی زحمت کیوں اٹھائی جائے یہ پرزہ تو پہلے پرزہ کا حشر دیکھ کر ہی پرزہ پرزہ ہوا جا رہا ہے

### علامہ کو یہ بات تو شاید معلوم ہی ہوگی کہ

قرآن مجید کے بہت سارے نام ہیں جیسا کہ ہم گزشتہ صفحات میں کہیں پر علامہ سیوطی کی "الاتقان" سے نقل بھی کر آئے ہیں ان ناموں کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ قرآن مجید ان تمام ہی ناموں کا مظہر اور انکا مرصد ہے۔ یعنی جس طرح قرآن مجید ہدایت و نور، ذکر و موعظت ہے اسی طرح یہ قرآن مجید مثانی و متشابہ بھی ہے، منادی ایمان و شفاء روح و جسم بھی ہے۔ کسے خبر کہ ان حروف مقطعات ہمیں کیا کیا فائدے پہنچ سکتے ہیں؟ ہو سکتا ہے یہ مقطعات ہمیں اتھیں بغیر سمجھے ہوئے ندائے ایمان دیتے ہوں اور ہم میں سے کچھ لوگ اس ندائے ایمان اور امتحان ایمان سے غافل ہو کر انھیں "بے مصرف ہدایت" قرار دیکر ندائے ایمانی سے روگردانی بھی کر رہے ہوں۔

مقطعات قرآنی کی حکمتیں اور فائدے بھی ملاحظہ ہوں

مولانا روم علیہ الرحمہ کا یہ شعر پہلے بھی کسی موقع پر پیش کیا جا چکا ہے

تذکرہ کے طور پر ملاحظہ ہو

پائے استدلالیاں چوبیس ہو۔ پائے چوبیس سخت بے تمکین ہو۔  
 مدرسہ و خانقاہ کا مذاق اڑانے والے مذاق توڑاتے ہیں لیکن واقعہ  
 یہی ہے کہ قرآن مجید کے اسرار و رموز نہ آرام کسی پر مطالعہ کرنے سے حل ہوتے  
 ہیں نہ سینٹرل جیل ملتان میں حل ہوتے ہیں قرآنی رموز و اسرار کو تو اہل مدرسہ و اہل خانقاہ  
 ہی سمجھتے ہیں جنکا باطنی تعلق صاحب کلام سے براہ راست ہوتا ہے قرآن مجید ایسی کتاب  
 نہیں ہے جسکے اسرار و رموز اولیاء اللہ و اہل دین کا مذاق اڑانے والوں پر منکشف  
 ہو جائیں۔

مقطعات قرآنی کی حکمتیں اور فائدے معارف القرآن مفتی محمد شفیع صاحب  
 کی نقل کے مطابق امام تفسیر علامہ قرطبی کی تفسیر سے نقل میں فرماتے ہیں :-  
 ”یہ حروف مقطعات رموز و اسرار ہیں جسکا علم سوائے خدا تعالیٰ کے کسی کو  
 نہیں اور ہو سکتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اسکا علم بطور ایک  
 ”راز“ کے دیا گیا ہو جسکی تبلیغ امت کے لئے روک دی گئی ہو۔ ہمارے  
 لئے ان میں بحث و گفتگو بھی جائز نہیں مگر اسکے باوجود فائدے سے  
 خالی نہیں۔ (۱) تو ان پر ایمان لانا، پھر انکا پڑھنا (جیسا کہ حدیث شریف  
 میں آیا ہے کہ الحمد میں الف، لام، میم تین حرف ہیں ہر حرف پر دس  
 نیکیاں ملتی ہیں) ہمارے لئے ثواب عظیم ہے دوسرے انکے پڑھنے کے  
 معنوی فوائد و برکات ہیں جو اگرچہ ہمیں معلوم نہ ہوں مگر غیب سے وہ ہمیں  
 پہنچتے ہیں“ (معارف القرآن ص ۱۱۰ جلد اول)

## بعد از خرابی بسیار

علامہ کو آخر میں وہی اعتراف شکست کرنا پڑا لیکن بہت کچھ مظاہرہ فتکاری کے بعد اگر یہی بات وہ پہلے ہی تحریر فرما دیتے تو بھلا انکی اس تحقیق و تدقیق اور کاوش و تلاش پر کیسے روشنی پڑتی جسکا اظہار موصوف اپنے دیباچہ و مقدمہ میں کر آئے تھے۔ حروف مقطعات کے سلسلہ میں علامہ کی اس تحقیق انیق سے (جو صفحات گذشتہ میں ملاحظہ سے گذر چکی ہے) صاف ظاہر ہو گیا کہ موصوف نے مقطعات کے بارے میں اپنی تحقیق کی ابتداء تو بڑی بلند آہنگی کے ساتھ تمام مفسرین کی تحریات و تصریحات سے بالکل بے نیاز ہو کر فرمائی تھی لیکن تدریجی طور پر آہستہ آہستہ "رجعت ہنجر" فرماتے ہوئے آخر میں موصوف اسی "مقام عجز و قصود" پر ہی پہنچ گئے جہاں دوسرے مفسرین پہلے ہی پہنچ چکے تھے۔ چنانچہ علامہ اپنے اسی زیر تبصرہ حاشیہ کے آخر میں یہ فرمانے پر مجبور ہو ہی گئے :-

” لہذا ایک عام ناظر کیلئے کچھ ضروری نہیں کہ وہ انکی تحقیق میں سرگرداں ہو“

اگر علامہ اپنی لاجواب تحقیق (جسکی ایک بات کبھی پایہ ثبوت کو نہیں پہنچ سکتی) سے دستبردار ہو کر ابتداء ہی یہ فیصلہ سنا دیتے تو ہمیں کوئی اعتراض نہ ہوتا لیکن علامہ نے بھی تو تحقیق اور ریسرچ کی انتہا فرمادی کہ ”یہ مقطعات پہلے عام طور پر بولے اور سمجھے جاتے تھے کلام جاہلیت کے محفوظ نمونوں میں انکی مثالیں اب بھی موجود ہیں وغیرہ وغیرہ لیکن بعد میں یہ اسلوب متروک ہو گیا جسکی وجہ سے مفسرین کیلئے ان کے معانی کی تعیین دشوار ہو گئی“

علامہ کو تقلید سلف اور اتباع اکابر سے کیسی نفرت اور بیزاری ہے اسکا

اندازہ ایسے ہی مقامات پر کچھ ہوتا ہے کہ موصوف مضمحکہ خیر سے بڑھکر مضمحکہ خیرات  
تحقیق واجتہاد کے نام پر ارشاد فرما سکتے ہیں لیکن کسی معقول بات کے نتیجہ میں  
تقلید سلف اور اتباع اکابر کا دلغ و صہ اپنے دامن پر سرگز نہ آنے دیں گے۔

## ہم پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ

حروف مقطعات کے متعلق تحقیق کے ساتھ ساتھ احتیاط کامل کا پہلو  
بھی یہی اور صرف یہی ہے کہ ان کے معانی اور مفاہیم کو اللہ تعالیٰ کے حوالہ کیا جائے  
ان کے حقیقی معانی کی تفتیش و جستجو نہ کی جائے جیسا کہ حضرات خلفائے راشدین  
رضی اللہ عنہم اور جمہور صحابہ کرام اور علمائے محققین کی تصریحات اور نقل ہوئیں  
ایسی صورت میں موصوف کا دعویٰ (کہ "یہ الفاظ نزول قرآن کے دور میں بالعموم  
سمجھے جاتے تھے یہ کوئی "چیتاں" نہ تھے) صرف طبعزاد ہے جس کا کوئی بھی  
تعلق حقیقت اور واقعہ سے نہیں ہے، علامہ موصوف اپنے اس انوکھے دعوے  
کو قیامت تک ثابت نہیں فرما سکتے۔ علامہ موصوف کا یہ وثوق واجتہاد اور وثوق عدم  
تقلید ہی ہے جس نے انہیں "خود رائی" کا مستقل مریض و شکار بنا دیا ہے اور اس تفسیر  
میں کبھی ان سے جگہ جگہ ایسی ایسی انوکھی اور اچھوتی تحقیقات محفوظ کرادی ہیں جس نے  
موصوف کے "تفرد" اور "استبداد" کے پرہر لگا دی ہے۔ ملاحظہ ہو ایک اور نمونہ:-

## تفرد کی ایک اور مثال

علامہ موصوف تفہیم القرآن جلد ۶ ص ۴۷۲ کے تفسیری حاشیہ ۲۷

میں فرماتے ہیں :-

”مفسرین نے بالعموم اس کے معنی یہ بیان کئے ہیں کہ اس رات کا عمل خیر نزار مہینوں کے عمل خیر سے افضل ہے جس میں شب قدر شمار نہ ہوا۔ اس میں شک نہیں کہ یہ بات اپنی جگہ درست ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس رات کے عمل کی بڑی فضیلت بیان کی ہے۔ لیکن آیت کے الفاظ یہ نہیں ہیں کہ العمل فی لیلة القدر خیر من العمل فی الف شهر (یعنی شب قدر میں عمل کرنا نزار مہینوں میں عمل کرنے سے بہتر ہے)۔ اس لئے آیت کا مطلب یہ ہے کہ اس ایک رات میں خیر و بھلائی کا اتنا بڑا کام ہوا کہ کبھی انسانی تاریخ کے کسی طویل زمانہ میں بھی ایسا کام نہ ہوا تھا“

ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی

ناظرین کرام ! علامہ کا یہ تفسیری حاشیہ بار بار بغور ملاحظہ فرما کر۔ خود ہی فیصلہ فرمائیں کہ علامہ کی تفسیر دانی کیسی زبردست ہے۔ ایک طرف خود ہی فرماتے ہیں کہ ”مفسرین نے بالعموم اس کے معنی یہ بیان کئے ہیں کہ اس رات کا عمل خیر نزار مہینوں کے عمل سے افضل ہے جس میں شب قدر شمار نہ ہوا“ اور یہ بھی اقرار و تسلیم فرما رہے ہیں کہ ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس رات کے عمل کی بڑی فضیلت



بیان کی ہے۔۔۔۔۔ حضورؐ نے فرمایا جو شخص شب قدر میں ایمان کے ساتھ اور اللہ کے اجر کی خاطر عبادت کیلئے کھڑا رہا اسکے تمام پچھلے گناہ معاف ہو گئے۔ حضورؐ نے فرمایا شب قدر رمضان کی آخری دس راتوں میں ہے جو شخص انکے اجر کے لئے عبادت میں کھڑا رہا اسکے تمام پچھلے گناہ معاف ہو گئے، اللہ اسکے اگلے پچھلے گناہ معاف کر دیگا۔

اور دوسری طرف جملہ مفسرین کی اصلاح بلکہ خود حضرت رسالتؐ صلی اللہ علیہ وسلم کی خوردہ گیری فرماتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں کہ

آیت کے الفاظ یہ نہیں ہیں۔۔۔۔۔ اسلئے آیت کا مطلب (وہ نہیں ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے مفسرین نے سمجھا ہے بلکہ) یہ ہے کہ اس رات میں غیر بھلائی کا اتنا بڑا کام ہوا کہ کبھی انسانی تاریخ کے کسی طویل زمانہ میں بھی ایسا کام نہ ہوا تھا۔

**مطلب یہ ہے کہ شب قدر ہر سال نہیں آتی**

علامہ کا یہ حوصلہ قابلِ داد ہی کہا جائیگا کہ وہ دوسرے علماء کرام اور صحابہ عظام پر تنقید فرماتے ہوئے خود حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی خوردہ گیری اور اصلاح فرمائی کی صریح ضلالت اور کھلی گمراہی میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ فتوہ باللہ من علم لا ینفع۔

یہ چند مثالیں بطور نمونہ اس حقیقت کی وضاحت میں پیش کی گئی کہ ناظرین کرام بھی پوری طرح باخبر ہو جائیں کہ علامہ مودودی کی یہ تفسیر جو تفہیم القرآن کے خوشناما سے شائع

کیجا رہی ہوا جسکی پبلسٹی میں ایڑی چوٹی کا زور صرف کیا جا رہا ہے۔ تفسیر قرآن فہمی کیلئے ہرگز نہیں  
 لکھی گئی ہے بلکہ اسکی آرٹیں تحریک مودودیت کی افہام و تفہیم اور اشاعت و تبلیغ ہی مقصود ہے  
 آپ خود ہی غور فرمائیں کہ بقول علامہ گویا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی سورہ قدر کی مذکور بالا  
 آیت پر پوری طرح غور نہ فرمایا کہ آیت کے الفاظ کیا ہیں اور میں شب قدر کی جو فضیلت بیان کر رہا ہوں وہ  
 اس آیت سے نکلتی بھی ہے کہ نہیں۔ تو اس سے بڑھکر گراہی اور کیا ہو سکتی ہے۔ ۱۹۔ تفہیم القرآن کا اصل  
 مدعا نگارش بھی یہی ہے کہ اسکے ذریعہ لوگوں میں کابرد و اسلاف صحابہ کرام حتیٰ کہ خود حضور رسالت صلی اللہ علیہ  
 کے متعلق لوگوں کو بدعتیدہ اور بتلائے شک واریاب کر دیا جائے اور جب پوری طرح ذہن سازی ہو جائے  
 تو اپنی دعوت و تحریک پر ایمان و تصدیق کا مطالبہ کیا جائے۔

علامہ موصوف کی اسی فنکاری کو عالم آشکارا کرنے کیلئے موصوف کی تفہیم القرآن سمجھنے کی کوشش  
 کیجا رہی ہے اور یہ زیر نظر تبصرہ شروع کیا گیا ہے صفحات گذشتہ میں علامہ کے دیباچہ و مقدمہ و تفسیری حاشیوں  
 جو کچھ بھی تبصرہ کیا گیا ہے انکی روشنی میں حقیقت بالکل بے نقاب ہو چکی ہے کہ علامہ کی تفہیم القرآن صرف  
 مودودیت کی تفہیم و تبلیغ کیلئے لکھی گئی ہے جس میں موصوف نے دیدہ و دانستہ طرح مفہومات قرآنی اور تفسیرات  
 مفسرین کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے ذاتی اور طبعی ادنیٰالات و نظریات کو ناظرین تفہیم پر زبردستی مسلط  
 کرنے کی کوشش کی ہے مثلاً مقطعات قرآنی کی بحث میں علامہ نے مقتدرہ تمکین کے مسلک کی پیروی میں  
 ”مقطعات کو تشابہات“ کا مصداق اور ناقابل فہم ماننے سے تو صاف صاف انکار ہی فرما دیا ہے اگرچہ سرود  
 انکے کوئی معنی بھی متعین نہیں کئے ہیں، لیکن موصوف کی تشریح کے پیش نظر اسکا پورا پورا امکان ہے کہ اگر  
 موصوف کو آئندہ کسی قلمی تفسیر میں ان مقطعات کے معنی کا کوئی سراغ لگ گیا جس طرح انھیں تشابہات مقطعات  
 کے انداز پر کلام جاہلیت نمونے دستیاب ہو گئے ہیں تو موصوف ان مقطعات کے معانی کا بھی اعلان و انکشاف  
 فرما سکتے ہیں کیونکہ موصوف انھیں بنیادی طور پر ناقابل فہم تسلیم کرنے پر تیار نہیں ہیں۔

راقم السطور نے جہاں تک تفسیر تفہیم القرآن اور تحریک مودودیت سے متعلق کچھ لٹریچر کا مطالعہ کیا ہے  
 اسکی روشنی میں پورے اطمینان قلب اور شرح صدر کے ساتھ یہ رائے قائم کر سکا ہے کہ تحریک مودودیت عام مسلمانوں  
 کیلئے وقت کا درست فتنہ ہے اور اپنے بعض حضرات علماء کا انکی تنقید سے دستبردار کی کیا تھا کیا تھا مظاہر اتحاد  
 دیگانگت یا سوت کا دوسرا فتنہ مودودیت کا موجودہ فروغ بری حد تک ایسے حضرات کے خاموش تعاون و اتحاد کا نتیجہ ہے  
 تفہیم القرآن کے دیباچہ و مقدمہ پر اس تبصرہ کے درمیان حقیقت بھی کھل کر سامنے آگئی ہے کہ تفہیم کی گراہیاں  
 اور فتنہ سازانیاں نہ تو ایسی معمولی ہیں کہ آسانی کیساتھ اُن سے صرف نظر کر لیا جائے اور نہ ہی ایسی تھوڑی ہیں جنہیں انگریز  
 کر لیا جائے حق راقم السطور نے منصب قمار سے دستگیری کے باوجود اس تبصرہ میں بھی ان گراہیوں کی نشاندہی کی ہے جو  
 روشنی میں کوئی فیصلہ و فتویٰ بعد کی چیز ہو ویسے بہت سارے علماء کرام اسے بہت پہلے ہی متعدد فتاویٰ صادر فرما چکے  
 ہیں لیکن دوسرے بہت سے حضرات کو کسی حد تک کچھ تردد باقی تھا اسلئے یہ ضرورت بہر حال باقی تھی کہ تحریک مودودیت  
 کی بنیادی کتاب "تفہیم القرآن پر مکمل و مبسوط تبصرہ کیا جائے۔ خدا تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ علامہ کی "تفہیم" کو  
 سمجھنے کی کوشش جو کیجا رہی ہے اسکے نتیجہ میں تبصرہ کی پہلی جلد اختتام پذیر ہو رہی ہے۔

ناظرین کرام کو یاد ہو گا کہ علامہ موصوف نے اپنے دیباچہ تفہیم میں اپنی آزاد ترجمانی کی کیسی کیسی  
 قصیدہ خوانی فرما کر دوسرے تراجم و تفاسیر پر خط و بطلان کھینچا تھا اور کیسے عین انداز میں اپنی تفسیر کیلئے مارکیٹ میں  
 جگہ نکالنے کی ترکیب سوچی تھی۔ ناظرین کرام نے گذشتہ صفحات میں یہ بھی ملاحظہ فرمایا کہ علامہ موصوف جو اپنے دیباچہ  
 و مقدمہ میں قلم خود اپنی آزاد ترجمانی و قرآن نہیں کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے تحسوس ہوئے تھے تفسیری حدود  
 میں قدم رکھتے ہیں "حروف مقطعات" کی تفسیر و تشریح میں کیسی کیسی قلابازیاں کھاتے ہوئے دکھائی دے  
 رہے ہیں۔ "مسجودیت آدم" کی بحث میں کیسی صفائی سے جملہ مفسرین کی متفقہ تفسیر کو چھوڑ کر مسجودیت  
 آدم کا صاف انکار فرما گئے اور قرآن مجید کی تفسیر میں تحریف معنوی کی بھی جرأت کر بیٹھے۔ "سورہ قدر کی  
 تفسیر میں" شان مفسریت نے جوش کیا تو تمام مفسرین کی تغلیظ فرما ڈالی بلکہ اور ترقی کرتے ہوئے خود

حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی عمدہ گیری اور اصلاح فرمائی کی جسارت کر بیٹھے کہ شب قدر سے  
متعلق جو حدیثیں آپ نے ارشاد فرمائیں اور اسکا جو مفہوم آپ نے متعین فرمایا اور تمام مفسرین اسکو اپنی  
اپنی تفسیروں میں بنیاد قرار دیا وہ مفہوم قرآن کے الفاظ سے مفہوم ہی نہیں ہوتا یعنی قرآن کے مخاطب اہل  
حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم تو نعوذ باللہ قرآن فہمی میں غلطی فرما سکتے ہیں مگر جو دھوئیں صدی کا مفسر عظیم  
غلطی کا شکار نہیں ہو سکتا۔

معوذتین کی بحث میں علامہ کا یہ ارشاد موصوف کی شان علم کا اندازہ کرنے اور  
انکے ذہنی حلقہ بگوشوں کی آنکھیں کھولنے کیلئے بہت کافی ہے کہ ان سورتوں میں صرف ایک  
آیت ہے جس کا ظاہری تعلق مضمون سحر سے ہے بقیہ آیات سحر سے تعلق نہیں رکھتیں (اسلئے  
معوذتین کو واقعہ سحر سے متعلق سمجھنا کوئی معقول بات نہوگی)۔ ایسے ہی مواقع پر غالب کا  
یہ مشہور شعر تھوڑی ترمیم کے ساتھ بار بار حاشیہ خیال سے ٹکرا جاتا ہے ۷

ہر کم نظر کو دعویٰ تفسیر الاماں اب آبروئے شیوہ اہل نظر گئی  
معروضات سابقہ کو مختصر آدو بارہ صرف اسلئے دہرایا گیا کہ علامہ کی مفسرہ کاوشوں کا کچھ نمونہ سامنے آجائے۔  
بعونہ تعالیٰ جلد اول تمام ہوئی مکمل تفہیم القرآن پر بالاستیعاب تبصرہ کیلئے  
جلد دوم کا انتظار فرمائیں جس میں پوری تفصیل سے پوری تفسیر کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔

آخر میں دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ تبصرہ تفہیم کی اس حقیر کوشش کو عام مسلمانوں کیلئے  
یاعث نفع و ہدایت اور افتخار قائم السلوہ کے لئے ذریعہ نجات و ذخیرہ آخرت بنائے۔ آمین  
بجاہ النبی الامین صلی اللہ علیہ و آلہ و اصحابہ اجمعین۔

عبد القدوس رومی۔ آگرہ

# مکتبہ صہیب برادران

## کی مطبوعات

مناجات مقبول (سرائی)

معمولات نبویؐ

نظم المفتی (تہذیب و تفہیم رسم المفتی منظوم اردو)

اکسری رپورٹ (اول، دوم)

ایک آئینہ میں تین چہرے

مودودیت بے نقاب

تین خطرے

اسلامی حکومت کی کہانی علامہ خمینی کی زبانی

حقیقت کی روشنی

تصویر کا دوسرا رخ

مہربانوں کے خط

عید میلاد النبیؐ کی تقریبات

تفہیم القرآن سمجھنے کی کوشش {اول (نیا ایڈیشن زیر طبع)، دوم، سوم}

دیوبند سے بریلی تک

حیات اعلیٰ حضرت کے چند پہلو (مختصر کتابچہ)

## مکتبہ صہیب برادران

”غریب خانہ“ ۹۹۲/۲ - تلسی پور، وحسی آباد، الہ آباد - ۲۱۱۰۰۳